ایک علمی، دینی اور ادبی ماہنامہ

ذکر و فکر (دہلی)

مرتبہ

خواجہ احمد فاروقی

مجلس ادارت

سید صباح الدین عبدالرحمٰن ● خلیق احمد نظامی
عبداللہ عباس ندوی ● خواجہ احمد فاروقی

خط و کتابت کا پتہ

جی ۱/۲۷۸ اوکھلا۔ ڈاکخانہ جامعہ نگر۔ نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵

ایڈیٹر : خواجہ احمد فاروقی
منیجر : محمد شبیر ندوی
پرنٹر پبلیشر : طٰہٰ عبداللہ
مطبع : لاہوتی پرنٹ ایڈس، جامع مسجد دہلی ۶
قیمت : ۵۰/ روپے (سالانہ) فی پرچہ ۵/
غیر ممالک سے ۲۰ ڈالر (یا اس کے بالمقابل سکہ ہندوستانی روپے میں)
تمام پرچے ہوائی ڈاک سے بھیجے جائیں گے اور وی پی نہیں بھیجی جائے گی

Acc. No. 121741
Date 27.10.89

نوٹ

رقم، ڈرافٹ یا منی آرڈر کے ذریعہ ہی ارسال فرمائیں۔ اگر چک سے رقم بھیجنا چاہیں تو مزید آٹھ روپے مصارف بنک کا اضافہ کرکے بھیجیں۔ نیز ڈرافٹ منی آرڈر یا چک مندرجہ ذیل پتہ پر بھیجیں :

ZIKR-O-FIKR (Monthly)
G 1/278, OKHLA, JAMIA NAGAR
NEW DELHI 110025

ماہنامہ

ذکر و فکر

دہلی

جلد ـــــــــ (۳) ربیع الاول ـــــ ۱۴۰۸ھ

شمارہ ـــــــــ (۱) نومبر ـــــ ۱۹۸۷ء

ترتیب

ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی

مـــذاکرات

عالمِ اسلام کے لیے یہ بات قابلِ شکر ومسرت ہے کہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں اسلامی تعلیمات کا ایک مرکز باقاعدہ قائم ہوگیا ہے، اس مرکز کے بورڈ آف ٹرسٹیز کے صدر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ ہیں، اور ہندوستان ہی کے ایک نوجوان اسکالر ڈاکٹر فرحان نظامی نے اس کا نقشۂ عمل تیار کیا اور اس کے قیام کے لیے جدّ وجہد کی، اور بڑی کاوشوں اور دشوار گزار منزلوں کو طے کرکے کامیابی کی منزل میں داخل ہوگئے۔ اس بات کی اہمیت وہ حضرات جانتے ہیں جن کے علم میں یہ حقیقت ہے کہ یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں یہودیوں نے تو ہر جگہ اپنا مرکز کسی نہ کسی نام سے قائم کر رکھا ہے کہیں اس کا نام "سامی زبانوں کا مرکز" ہے (SEMITIC STUDIES)، اور کہیں مڈل ایسٹ سنٹر ہے، اور انہی مراکز سے مشرقی اور عرب ممالک کے طلبہ اسلامیات اور عربی زبان وادب میں ڈگریاں حاصل کرتے رہے ہیں، عرب ممالک کی یونیورسٹیوں کے بہتیرے وائس چانسلر، ڈین آف فیکلٹی، اور پروفیسر انہی مراکز کے فارغ التحصیل ہیں جو یورپ اور امریکہ میں یہودیوں نے قائم کیے ہیں، لندن یونیورسٹی کا اسکول آف اورنٹیل اینڈ افریقن اسٹڈیز بہت مشہور ہے، اس میں ایک شعبہ عربی زبان کا بھی ہے، عربی زبان کے ضمن میں اسلامی تعلیمات کو بھی شمار کیا گیا ہے، چنانچہ میرے علم میں متعدد اصحاب علم ودانش وہ ہیں جنھوں نے اس شعبہ کے ماتحت امام غزالی، امام ابن تیمیہ پر ریسرچ کیا ہے، حضرت مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ دہلوی پر بھی ہمارے ملک کے بعض اصحاب علم نے ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ کیمبرج اور آکسفورڈ میں بھی مذہب کے تقابلی مطالعہ کے شعبہ اور عربی فارسی ڈپارٹمنٹ سے حدیث وقرآن پر لوگ ریسرچ کر چکے ہیں۔

اڈنبرہ کے پروفیسر مانٹ گمری واٹ، مشہور مصنف اور سیرت نبویؐ کے ماہر سمجھے جاتے ہیں، انھوں نے اُن طلبہ کے لیے جو قرآن کریم پر ریسرچ کرنا چاہیں ایک اسکالرشپ بھی منظور کرالیا تھا، بشرطیکہ ان کے ریسرچ کی ابتداء اس مفروضہ پر ہو کہ قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف ہے۔

لیکن کسی یونیورسٹی میں ایسا اسکول یا انسٹی ٹیوٹ نہیں تھا جہاں مسلم اسکالرس کی زیر نگرانی، اسلامی تعلیمات پر ریسرچ کرایا جائے، یہ خصوصیت آکسفورڈ یونیورسٹی کے اس نومولود سنٹر کو حاصل ہوئی ہے، خوشی کی بات ہے کہ اس مرکز کی اہمیت کو عصر حاضر کے ممتاز علماء اور بین الاقوامی سطح کی مشہور شخصیات نے سمجھا اور ابھی اگست کے آخر میں اس کے بورڈ کا دوسرا جلسۂ انتظامیہ ہوا جس میں یہ سب شریک تھے، رابطہ عالم اسلامی کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر عبد اللہ نصیف جو جدہ کی ملک عبد العزیز یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہ چکے ہیں، جامعہ محمد بن سعود ریاض کے صدر (Rector) ڈاکٹر عبد اللہ عبد المحسن الترکی، ام درمان یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر کامل الباقر، ہندوستان کے مشہور مورخ ڈاکٹر خلیق نظامی، ندوۃ العلماء کے کلیۃ الأدب کے صدر مولانا سید محمد رابع الحسنی، ان کے علاوہ اس کے جلسوں میں آکسفورڈ کے مختلف کالجوں کے مستشرقین نے بھی شرکت کی، اس لحاظ سے یہ سنٹر عالم اسلام کا ایک مشترک سرمایہ ہے۔

اس بورڈ کے صدر مولانا سید ابوالحسن علی الحسنی مدظلہٗ چونکہ عالم اسلام سے قریبی واقفیت رکھتے ہیں، رابطۃ الجامعات الاسلامیۃ (یونین آف اسلامک یونیورسٹیز) کے بھی رکن ہیں، اور ان کے علم میں یہ بات ہے کہ یورپ و امریکہ کی ڈگریاں حاصل کرنے والے آج بھی بہتیرے عرب ممالک میں وزارت یا بڑے عہدوں پر فائز ہوتے ہیں، لہذا اگر ان کی ذہنی و علمی تربیت مسلمان اہل دانش کی سرپرستی میں ہو گی تو ان ممالک میں اسلامی اقدار کی حفاظت کا سامان ہو گا، یہی وجہ تھی کہ مولانا نے بستر علالت سے اٹھتے ہی اس طویل اور اُکتا دینے والے سفر کی زحمت برداشت کی۔

اس سفر میں مولانا نے سینٹ کراس کالج میں اسی مرکز کے ماتحت ایک محاضرہ بھی دیا، جو کویت کے ایک صاحب علم اور مخیر تاجر جناب عبد اللہ العلی المطوع سے منسوب لکچروں کے سلسلہ کی پہلی کڑی اور

افتتاحی محاضرہ تھا اس رسالہ کے اڈیٹر پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کی طلب و خواہش پر مولانا نے اس محاضرہ کا اردو ترجمہ 'ذکر و فکر' کو مرحمت فرمایا ہے جس کو ہم سالِ نو کے تحفہ کے طور پر شائع کر رہے ہیں۔

یہ سال اس ملک کے لیے بڑی آزمائشوں کا سال ہے،" یہ چمن زار ہند" موت اور بربادی کی وادی بن گیا ہے، خشک سالی نے لاکھوں ایکڑ زمین کو بنجر بنا دیا ہے، جس سے کروڑوں انسانوں کے رزق و روزگار متاثر ہوئے، ہزاروں بے زبان جانور ہلاک ہو گئے۔ دوسری طرف بہار کے علاقہ میں سیلاب آیا، یا یوں کہیے سیلاب کے نام پر قیامت آئی، ہزارہا ہزار گھر تباہ ہو گئے، بے شمار جانور اور اَن گنت انسان خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔ جن لوگوں نے ان تباہ کاریوں کا چشم دید معائنہ کیا اور تباہ شدہ بستیوں میں جا کر موت کی ارزانی اپنی آنکھوں سے دیکھی، ان میں امارتِ شرعیہ کے ذمہ دار بھی تھے، ان میں ایک عالم دین مولانا مجاہد الاسلام قاضی شریعت نے جو دیکھا ہمارے اندر اس کے سننے کی بھی تاب نہیں ہے، اچھے کھاتے پیتے گھرانوں کی عصمت مآب بیبیاں جن کے ہاتھوں نے ہمیشہ صدقہ و خیرات تقسیم کیے، وہ ستر پوشی کے لیے چند گز کپڑوں کی محتاج تھیں، اور بھوک کی آگ بجھانے کے لیے خیرات کی روٹیاں کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اٹھانا چاہتی تھیں، مگر ہاتھ رک جاتے تھے، لڑکیاں بالیاں اپنی ستر پوشی کے لیے بے تاب تھیں، امارت شرعیہ کے ایک اطلاع نامہ میں یہ کہا گیا ہے کہ ۱۹۳۴ء کے قیامت خیز زلزلہ کی تباہ کاریوں سے اس سیلاب کی خانہ بربادیاں بڑھ گئی ہیں۔

انسانی جانیں اس دور میں جس درجہ ارزاں اور بے قیمت ہو کر رہ گئی ہیں شاید ہی کسی زمانہ میں رہی ہوں۔ آئے دن اخبارات میں کہیں دو چار کے اچانک ہلاک ہونے کی اطلاع آتی ہے اور کہیں مجموعی آبادی کے تہس نہس ہونے کی خبر ہوتی ہے، اور ہم یہ خبریں اس طرح اچٹتی نظروں سے دیکھ کر گزر جاتے ہیں گویا یہ کسی سینما یا کسی کمپنی کے اشتہار ہیں۔ ان خبروں نے ہمارے اعصاب

کو اس درجہ بے حس بنا دیا ہے کہ کبھی یہ بھی نہیں سوچتے کہ یہ مرنے والے خواہ کسی مذہب و عقیدہ کے رہے ہوں، آخر انسان ہی تو تھے، ہماری طرح گوشت پوست کے انسان جن کے سینے ارمانوں سے اور دماغ مستقبل کے منصوبوں سے بھرے ہوں گے، ان میں کتنے ایسے ہوں گے جن کی ذات سے ایک کنبہ کی امیدیں وابستہ ہوں گی، کسی کی دنیا اُجڑ گئی ہوگی، بچوں کے چہروں سے مسکراہٹ ایک نایاب شے بن گئی ہوگی۔ خانہ جنگیوں اور فوج کشی کی پیدا کردہ مصیبتیں اپنی جگہ کب کم تھیں کہ آفات ارضی و سماوی نے رہی سہی کمی پوری کر دی۔ نوح ناروی کا ایک شعر سنا تھا جو مشاعرہ کی غزل کا شعر ہے، صرف لفظی رعایت کی بنا پر یاد رہ گیا ہے، مگر معلوم ہوتا ہے کہ ہماری موجودہ حالت کی تصویر ہے:

گلہ کیا آسماں کا، آسماں تو آسماں ٹھہرا
زمیں بھی دشمنِ اہلِ زمیں معلوم ہوتی ہے

معلوم نہیں کب وہ وقت آئے گا جب انسان کو انسان کی قیمت، اور اپنے سر کے علاوہ دوسرے انسان کے سر کی عظمت کا احساس ہوگا۔

بڑے نا سمجھ ہیں وہ لوگ جو مذہب کو نظر انداز کرنا فیشن سمجھتے ہیں، حالانکہ مذہب ہی ہے جس کا درس اوّل یہ ہے کہ سب انسان برابر ہیں اور بڑائی صرف حُسن اخلاق کی بڑائی ہے۔ انسان دوستی، مزاج میں نرمی پیدا کرتی اور بہیمیت سے باز رکھنے کی تلقین کرتی ہے۔ مذہب محبت سکھاتا ہے، آڑے وقتوں میں انسان تو کیا جانوروں پر رحم کرنے کی خو پیدا کرتا ہے، یہ انسان کا انفرادی معاملہ نہیں اجتماعی مسئلہ ہے، صرف مذہب ہی ہے جو انسان کو انسان بنا سکتا ہے یہ بات جس قدر جلد سمجھ میں آجائے بہتر ہے۔

انسانیت کی رہنمائی میں
اسلام کا تاریخی کردار

از: مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی

[پیش نظر مقالہ اس انگریزی مضمون کا ترجمہ ہے جو ۲۹ اگست ۱۹۸۷ء کو سینٹ کراس کالج آکسفورڈ یونیورسٹی (St. Cross College, oxford university) میں اسلامک سینٹر آکسفورڈ یونیورسٹی کے زیر اہتمام شیخ عبدالعزیز مطوع لکچرز سیریز کے افتتاحی خطبہ کے طور پر پڑھا گیا اس کا مکمل عنوان تھا "صحیح علم کی اشاعت و ترقی اور اس کے ذریعہ سے انسانیت کی رہنمائی اور اصلاح میں اسلام کا تاریخی کردار" اس کے منتخب حصوں کا ترجمہ ناظرین کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔]

نبوتِ محمدیؐ کا اعجاز اور انقلابی کارنامہ:

حضرات!

اگر کوئی واحد ہستی ایسی ہے جس کے متعلق وثوق سے یہ کہا جا سکے کہ اس نے حقیقتاً تاریخ کا رُخ موڑ دیا ہے، جس نے انسان کو جہالت کے بجائے علم، فرسودہ روایات کے بجائے تعقّل، اور آباء واجداد کے نقش قدم کی کورانہ پیروی کے بجائے عقل و بصیرت، اور تفکر و تدبّر سے کام لینے کا عادی بنایا ہے تو وہ ذات گرامی حضور اکرم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہے، آپ تاریخ کے اس دوراہے پر نظر آتے ہیں جہاں سے عقل واستدلال اور توہم پرستی کے راستے جُدا ہوتے ہیں، آپ کی تعلیمات نے

انسان کو عقل کی روشنی عطا کی اور اس کی مبصرانہ صلاحیتوں کو جلا بخشی۔

اس کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہونے والی پہلی وحی میں خالقِ کائنات نے نوعِ بشری کو علم عطا کرنے کے احسان کا ذکر کیا ہے، اور اس قلم کو اس کا عظیم وسیلہ قرار دیا، جس سے علم کا تاریخی سفر وابستہ ہے اور جس سے تصنیف و تعلیم کی عالمگیر تحریک جاری ہوئی، اور علم ایک فرد سے دوسرے فرد، ایک قوم سے دوسری قوم، ایک زمانہ سے دوسرے زمانہ اور ایک نسل سے دوسری نسل تک پہونچتا رہا، دنیا میں علم کی اشاعت اور انسانی ضرورت کے مطابق اس کی عمومیت کا فخر اسی کو حاصل ہے اور اس کی گردش و جنبش سے مدارس و جامعات اور علمی اداروں اور کتب خانوں کی دنیا آباد ہے۔

جہاں تک بشری قرائن و قیاسات کا تعلق ہے، اس بات کا کوئی تاریخی و عقلی قرینہ نہ تھا کہ پہلی وحی کے ذیل میں "قلم" کا ذکر بھی آسکتا ہے! کیونکہ یہ وحی ایک اُمّی انسان ایک اَن پڑھ قوم کے درمیان اور ایک پسماندہ علاقہ میں نازل ہو رہی تھی، جہاں وہ پارۂ چوب جس کا نام "قلم" ہے، سب سے زیادہ نادر و نایاب شے کی حیثیت رکھتا تھا، اسی لیے عربوں کا لقب ہی "اُمّیین" پڑ گیا تھا۔

"هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ق وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝"[1]

(وہی تو ہے جس نے اُمّی لوگوں میں انھیں میں سے ایک پیغمبر بھیجا جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور انھیں پاک کرتا ہے اور انھیں کتاب و حکمت کی باتیں سکھاتا ہے درانحالیکہ یہ لوگ پہلے سے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے)۔

ایک غیر متوقع آغاز!

غارِ حرا میں نبیِ اُمّی پر یہ پہلی وحی اُترتی ہے (جب کہ چھ سو سال[2] کے طویل وقفہ کے بعد زمین

---

[1] الجمعۃ۔ ۲ ، [2] یہ طویل مدت سیدنا عیسیٰ علیہ وعلی نبینا الصلوٰۃ والسلام کی نبوت پر گزری تھی۔

کا آسمان سے بلکہ صحیح تر الفاظ میں آسمان کا زمین سے وحی و نبوت کے ذریعہ رابطہ قائم ہوا تھا، تو اس میں عبادت کا حکم اور اللہ کی معرفت اور اطاعت وغیرہ کوئی ایجابی، یا بتوں کے ترک کرنے یا جاہلیت اور اس کے عادات و اطوار پر نکیر جیسی کوئی سلبی بات نہیں کہی گئی، اگرچہ یہ سب باتیں اپنی جگہ پر اہم تھیں اور اپنے اپنے موقعہ پر ان کی وضاحت و تبلیغ کی گئی، بلکہ کلمۂ "اِقْرَأْ" سے اس وحی کا آغاز ہوا۔

"اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۚ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۝" [1]

(آپ پڑھیے اپنے پروردگار کے نام کے ساتھ جس نے (سب کو) پیدا کیا ہے، جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا ہے، آپ قرآن پڑھا کیجئے، اور آپ کا پروردگار بڑا کریم ہے، جس نے قلم کے ذریعہ سے تعلیم دی ہے (جس نے) انسان کو ان چیزوں کی تعلیم دے دی جنھیں وہ نہیں جانتے تھے)۔

اس طرح یہ تاریخی واقعہ ظہور پذیر ہوا، جس نے مؤرخین و مفکرین کے غور و فکر کے لیے نئے اور وسیع آفاق مہیا کیے، اور یہ اس حقیقت کا بلیغ اور واضح اشارہ تھا کہ اس نبی امی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ انسانیت اور مذاہب کی تاریخ میں ایک نیا دور شروع ہوگا، جو وسیع و عمیق معنوں میں قراءت (خواندگی)، اور پڑھنے لکھنے کا وسیع و ترقی یافتہ دور اور علم کی حکمرانی کا عہد زرّیں ہوگا، اور علم و دین دونوں مل کر نئی انسانیت کی تکمیل و تشکیل کریں گے۔

انفس و آفاق اور اقوام و ملل کے ماضی پر غور و فکر کی دعوت اور اس کے فائدے:

قرآن علم کے مختلف ذرائع کے تذکرہ کے ساتھ ان اشیاء کی جانب توجہ دلاتا ہے جن کا مطالعہ

---

[1] العلق ۱۔۵

حصول علم کے لیے کیا جانا چاہیے، اس سلسلہ میں اس نے انفس و آفاق اور گزشتہ اقوام کے احوال (جنھیں قرآن نے "ایام اللہ" اور "سنۃ اللہ" کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے، اور جسے آج تاریخ کہا جاتا ہے) کی جانب توجہ دلائی ہے، تاکہ انسان ان پر غور و خوض کر کے مفید نتائج برآمد کر سکے، اور بڑے قیمتی اور دور رس، پُر از امکان اور انسانی مستقبل پر گہرائی سے اثر انداز ہونے والے نتائج تک پہنچ سکے۔

علامہ اقبال، عقل انسانی اور علم کے وسائل و مصادر کی اسلام کے ذریعہ وسعت و نتیجہ خیزی کا ذکر کرتے ہوئے اپنے مشہور خطبات[1] میں لکھتے ہیں:

"لیکن مشاہدات باطن صرف ایک ذریعہ ہیں علم انسانی کا، قرآن پاک کے نزدیک اس کے دو سرچشمے اور ہیں، ایک عالم فطرت، دوسرا عالم تاریخ، جن سے استفادہ کرنے میں عالم اسلام کی بہترین روح کا اظہار ہوا ہے، قرآن پاک کے نزدیک یہ شمس و قمر، یہ سالوں کا امتداد، یہ اختلاف لیل و نہار، یہ رنگ و زبان کا فرق، اور یہ قوموں کی زندگی میں کامیابی اور ناکامی کے دنوں کی آمد و شد، حاصل کلام یہ کہ یہ سارا عالم فطرت جیسا کہ بذریعہ حواس ہمیں اس کا ادراک ہوتا ہے، حقیقت مطلقہ کی آیات ہیں، اور اس لیے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ ان میں غور و تفکر سے کام لے، یہ نہیں کہ بہروں اور اندھوں کی طرح ان سے اعراض کرے، کیونکہ جو کوئی اس زندگی میں اندھوں کی طرح ان آیات سے اپنی آنکھیں بند رکھتا ہے وہ آگے چل کر بھی اندھا ہی رہے گا، یہی وجہ ہے کہ محسوس اور ٹھوس حقائق پر بار بار توجہ کی اس دعوت کے ساتھ ساتھ جس کی قرآن مجید نے تعلیم دی، جب مسلمان رفتہ رفتہ اس حقیقت کو پا گئے کہ کائنات میں روانی اور حرکت ہے، وہ متناہی ہے اور اضافہ پذیر، تو انجام کار یونانی فلسفہ کی مخالفت پر، جس کا اپنی حیات ذہنی کی ابتدا میں انھوں نے بڑے ذوق و شوق سے

---

[1] Reconstruction of Religious Thought in Islam.

مطالعہ کیا تھا، اُتر آئے شروع شروع میں تو انھیں اس امر کا احساس نہیں ہوا کہ قرآن مجید کی روح فلسفۂ یونان کے منافی ہے، اور اس لیے حکمت یونان پر اعتقاد کرتے ہوئے، انھوں نے قرآن پاک کا مطالعہ بھی فکر یونان ہی کی روشنی میں کیا، لیکن قرآن مجید کا زور چونکہ محسوس اور ٹھوس حقائق پر ہے اور حکمت یونان کا حقائق کے بجائے نظریات پر، لہٰذا ظاہر ہے کہ یہ کوششیں ایک نہ ایک دن ضرور ناکام رہتیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور یہ اسی کوشش کی ناکامی تھی جس کے بعد اسلامی تہذیب و ثقافت کی حقیقی روح برسرکار آئی، حتیٰ کہ تہذیب جدید کے بعض اہم پہلوؤں کو دیکھیے تو ان کا ظہور بھی اسی کا مرہون منت ہے۔"[1]

وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

"قرآن پاک نے تاریخ کو 'ایام اللہ' سے تعبیر کیا اور اسے علم کا ایک سرچشمہ ٹھہرایا ہے، اس کی ایک اور بنیادی تعلیم یہ ہے کہ اقوام و امم کا محاسبہ انفرادی و اجتماعی دونوں لحاظ سے کیا جاتا ہے، مزید یہ کہ انھیں اپنی بداعمالی کی سزا اس دنیا میں بھی ملتی ہے، اور یہ وہ بات ہے جس کے ثبوت میں اس نے بار بار تاریخ سے استناد کیا۔"

علاوہ ازیں قارئین کو توجہ دلائی کہ نوع انسانی کے گزشتہ اور موجودہ احوال و شئون کے مطالعہ میں غور و فکر سے کام لیں۔

"وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ وَذَكِّرْهُمْ بِاَیّٰمِ اللّٰهِ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ"۔[2]

---

[1] "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ"، ص ۱۹۶-۱۹۷۔ (لاہور ۱۹۵۸ء)

[2] ابراہیم — ۵

(اور ہم نے موسیٰؑ کو اپنی نشانیاں دے کر بھیجا کہ اپنی قوم کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لے جاؤ اور ان کو خدا کے دن یاد دلاؤ، اس میں ان لوگوں کے لیے جو صابر و شاکر ہیں (قدرت خدا کی) نشانیاں ہیں)۔

"وَمِمَّنْ خَلَقْنَا أُمَّةٌ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ ۝ وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ ۝" [1]

(اور ہماری مخلوق میں سے ایک وہ لوگ ہیں جو حق کا راستہ بتلاتے ہیں اور اسی کے ساتھ انصاف کرتے ہیں، اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ہم ان کو تدریج اس طریق سے پکڑیں گے کہ ان کو معلوم ہی نہ ہوگا)۔

"قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ۝" [2]

(تم لوگوں سے پہلے بھی بہت سے واقعات گزر چکے ہیں، تو تم زمین میں سیر کر کے دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا کیسا انجام ہوا)۔

"وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۝" [3]

(اور یہ دن ہیں کہ ہم ان کو لوگوں میں بدلتے رہتے ہیں)۔

"وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۚ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ۝" [4]

(اور ہر ایک فرقہ کے لیے (موت کا) ایک وقت مقرر ہے جب وہ آجاتا ہے تو نہ تو ایک گھڑی دیر کر سکتے ہیں نہ جلدی)۔

---

[1] الاعراف ۱۸۱-۱۸۲

[2] آل عمران ۱۳۷

[3] آل عمران-۱۴۰

[4] الاعراف ۳۴

علمی منتشر اکائیوں میں وحدت و ربط:

علم کے صحیح مقصد کی طرف رہنمائی اور اسے مثبت تعمیری و مفید اور ذریعۂ یقین بنانے کے سلسلہ میں بعثت محمدیؐ اور دعوت اسلامی کے رول کی اس سے زیادہ اہمیت اور قدر و قیمت ہے جو اس نے علمی تحریک کی فعالیت و وسعت کے سلسلہ میں ادا کیا ہے۔

علم کی کڑیاں بکھری ہوئی بلکہ بسا اوقات متضاد تھیں، علم طبیعات و حکمت دین سے برسرِ پیکار تھے، حتیٰ کہ ریاضی و طب جیسے معصوم علم کے ماہرین بھی بعض اوقات سلبی و الحادی نتیجے نکالتے تھے، چنانچہ یونان کے علما، (جنھوں نے کئی صدیوں تک فلسفہ و ریاضیات میں اپنا امتیاز قائم رکھا تھا) یا تو مشرک تھے یا ملحد تھے، اور یونان کے علوم اور مدارس فکر دین کے لیے خطرہ اور ملحدین کے لیے سند اور نمونہ بنے ہوئے تھے، اس صورت حال میں یہ اسلام کا بڑا احسان تھا کہ اس نے ایسی وحدت قائم کی جو تمام علمی اکائیوں کو مربوط کردیتی تھی، اور اس کے لیے ایسا کرنا اس لیے آسان ہو سکا کہ اس کا علمی سفر صحیح نقطۂ آغاز (STARTING POINT) سے ہوا تھا، اس نے اسے اللہ پر ایمان، اس سے مدد طلبی اور اس پر اعتماد کے ذریعہ اور "اقرأ باسم ربك الذى خلق" کی تعمیل میں شروع کیا تھا، اور آغاز کی صحت اکثر اوقات انجام کی صحت و خیریت کی ضمانت ہوجاتی ہے، اسلام نے قرآن و ایمان کے فیض و فضل سے ایسی وحدت کا انکشاف کیا جو تمام وحدتوں کو مربوط کردیتی ہے، اور وہ وحدت اللہ تبارک و تعالیٰ کی معرفت ہے، جس کے بارہ میں اللہ نے اپنے مومن بندوں کی تعریف کی ہے،

"وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○[1]

(اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے رہتے ہیں، اے ہمارے پروردگار! تو نے یہ (سب) لایعنی نہیں پیدا کیا ہے، تو پاک ہے، سو محفوظ رکھ ہم کو دوزخ کے عذاب سے)۔

---

[1] آل عمران - ۱۹۱

زمانۂ ماسبق میں کائناتی وحدتیں (یعنی اس کے مظاہر اور حوادث و تغیرات) انسان کو متضاد نظر آتے اور اسے حیرت و اضطراب میں ڈالتے تھے، اور کبھی کفر و الحاد اور خالق عالم اور مُدبّر کائنات کے اوپر طعن و اعتراض تک پہنچا دیتے تھے، اسے دیکھتے ہوئے ایمان و قرآن پر مبنی "اسلامی علم" نے دنیا کو ایسی وحدت عطا کی جو کائناتی وحدتوں کو جمع کر دیتی ہے، اور وہ اللہ کا غالب ارادہ اور اس کی حکمت کاملہ ہے۔

ایک بڑے جرمن عالم ہیرالڈ ہوفڈنگ (HARALD HOFFDING) اس وحدت کی دریافت اور انسانی زندگی اور علم و اخلاق کے تاریخی سفر میں اس کے مؤثر کردار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"ہر مذہب کا ایمان توحید پر ہے، جس کا نظریہ یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے کی علّتِ وجود ایک ہی ہے (اس فکر سے لازمی طور پر پیش آنے والی مشکلات سے قطع نظر یہ ایمان و اعتقاد فطرت انسانی پر بڑا مفید اور اہم اثر مرتب کرتا ہے، اور اس کے ماننے والوں کے لیے یہ عقیدہ رکھنا آسان ہو جاتا ہے کہ (بعض اختلافات و تفصیلات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے) عالم کی تمام چیزیں ایک قانونی وحدت میں منسلک ہیں، کیونکہ علّت کی وحدت، قانون کی وحدت کا بھی تقاضا کرتی ہے۔

ازمنۂ وسطیٰ کے دینی فلسفہ نے کثرت میں وحدت کا تصور لوگوں کے ذہنوں میں بٹھا دیا، جس سے غیر مہذب انسان طبعی مظاہر کی کثرت کے سبب اس سے غافل تھا، اور اس کثرت کے مشاہدہ میں اس لیے غلطاں و پیچاں رہتا تھا کہ اس کے ہاتھ میں ان میں ربط ذاتی پیدا کرنے کا کوئی سررشتہ نہ تھا"[1]

---

[1] HISTORY OF MODERN PHILOSOPHY P.S.

مغرب کی بیداری اور علم و تہذیب کے نئے دور کے آغاز میں اسلام کا حصّہ:

رابرٹ بریفالٹ (ROBERT BRIFFAULT) اپنی کتاب (THE MAKING OF HUMANITY) میں لکھتا ہے:

"یورپ کی ترقی کا کوئی ایسا پہلو نہیں، جس پر اسلامی تمدّن کا احسان اور اس کے نمایاں آثار کی گہری چھاپ نہ ہو۔"

وہ آگے چل کر لکھتا ہے:

" صرف طبعی علوم ہی (جن میں عربوں کا احسان مسلّم ہے) یورپ میں زندگی پیدا کرنے کے ذمہ دار نہیں ہیں، بلکہ اسلامی تمدّن نے یورپ کی زندگی پر بہت عظیم الشان اور مختلف النّوع اثرات ڈالے ہیں، اور اس کی ابتدا اسی وقت سے ہو جاتی ہے، جب اسلامی تہذیب و تمدّن کی پہلی کرنیں یورپ پر پڑنی شروع ہوئی ہیں۔" ؎۱

اکثر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یورپ کی نشأۃ ثانیہ فکر یونان کے احیاء کا نتیجہ تھی، مشہور مؤرخ ایچ، جی، ویلیس (H. G. WELLS) نے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے کہ موجودہ دنیا کو قوت اور علم کی روشنی یونان سے ہی ملی ہے، وہ لکھتا ہے:

"جس علم کی ابتدا کرنے کے بعد اسے یونانیوں نے خیرباد کہہ دیا تھا، اسے ایک نئے زاویہ اور نئے جوش و خروش کے ساتھ (عربی ذہن) نے نظم و ترتیب کے ساتھ اپنا موضوع بنا لیا، اگر یونانی حقیقت کے سائنسی طریقہ انکشاف کے باپ تھے تو عرب اس کے مربّی تھے، جنھوں نے انتہائی صاف گوئی، آسان اور سہل تشریحات، باقاعدہ اور جچے تلے الفاظ اور جامع تنقید سے اسے سنوارا تھا، یہ صرف عرب

؎۱ THE MAKING OF HUMANITY. P 202

تھے نہ کہ لاطینی، جن سے جدید دنیا کو علم اور قوت کا تحفہ حاصل ہوا ہے۔" [1]

قدیم دنیا میں مسلمانوں کا علمی تفوق اور مفید اور تجربی علوم میں ان کی قیادت :

میں اپنے مطالعہ کی روشنی میں یہ دعویٰ کرسکتا ہوں کہ مسلمانوں نے صرف عظیم الشان اور وسیع سلطنتوں کی بنیاد نہیں ڈالی، بلکہ ایک زمانہ میں وہ دنیا کی تمام اقوام پر علم وفضل میں بھی فائق تھے مسلمانوں میں ہمیشہ ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں جو حصولِ علم کے شوق، اس کی بے لوث خدمت اور مختلف علوم میں بیش بہا تصنیفات کے لیے ممتاز رہے ہیں، قرنِ اوّل کے ائمہ، محدثین اور فقہاء و مجتہدین سے قطع نظر (جن کی مثال دنیا کی کسی قوم میں نہیں ملتی) مسلمانوں نے دینی اور دنیاوی علوم میں ایسے مفکرین اور مصنفین پیدا کیے جن کا مقابلہ دوسری قوموں کے بڑے سے بڑے عالم نے کیا جاسکتا ہے۔

مسلمانوں نے اپنے تحصیل علم کا دائرہ صرف مذہبی علوم مثلاً تفسیر، حدیث، فقہ، اصولِ فقہ، اور مذاہب کے تقابلی مطالعہ تک محدود نہیں رکھا، بلکہ انھوں نے جغرافیہ، طبیعیات، نباتیات، ہندسہ، طب، کیمیا، فلسفہ، تاریخ و مذاہب و تمدن جیسے علوم کی خدمت بھی کی، ان کے اکثر علماء نے صدیوں تک مختلف علوم وفنون میں دنیا کی رہنمائی کی ہے، اور کبھی نہ مٹنے والے نقوش چھوڑے ہیں، یہاں صرف چند مسلمان علماء کا تذکرہ کیا جارہا ہے، کیونکہ کسی طویل تعارف کے لیے کئی جلدیں درکار ہوں گی۔

مسلمان موجدینِ فن اور ماہرینِ علوم :

الخوارزمی (م ۸۵۰/ ۲۳۶) نے سب سے پہلے عالمی جغرافیہ پر کتاب لکھی اور پھر محمد بن محمد الادریسی (م ۱۱۵۳/ ۵۶۰) نے "المسالك والممالك" میں عالم اسلام کے تجارتی راستوں کو نقشہ جات کے ساتھ وضاحت سے بیان کیا، ابن الہیثم (م ۱۰۳۹/ ۴۳۱ھ) نے تقریباً دو سو کتابیں تصنیف کیں جن میں سینتالیس علم ہندسہ پر اور اٹھاون انجینیرنگ کے موضوع پر تھیں، وہ پہلا شخص تھا جس نے اسوان ڈیم کی تعمیر کی تجویز پیش کی اور علم بصارت (OPTICS) میں مفید انکشافات کیے، اس نے اپنی

---

[1] ایچ، جی، ویلس، The out line of History، لندن، ۱۹۲۰، صفحہ ۲۷۳

کتاب المناظر میں بصری ادراک کے سلسلہ میں یہ نظریہ پیش کیا کہ کسی شئے کی بصارت اس سے ٹکرا کر واپس آنے والی شعاعوں پر منحصر ہے، محمد بن موسیٰ الخوارزمی (م ۸۵۰/۲۳۶) نے علم ہندسہ میں ایک سے نو تک اعداد کے بعد صفر کا اضافہ کیا اور سب سے پہلے اعداد کی حیثیت کا تعین کیا، الخوارزمی نے ہی الجبر (الجبرا) ایجاد کیا، البتانی (م ۹۲۹/۳۱۷) جسے مغرب البیٹگنی (ALBATEGNI) اور البا طینوس (ALBATENUS) کے نام سے یاد کرتا ہے، عظیم عرب ماہر فلکیات تھا، جس نے گہن کی کجی کا بالکل صحیح اندازہ لگایا، شمسی سال کی مدت، موسموں کی تبدیلی اور سورج کے اوسط مدار کا پتہ چلایا اور بطلیموس کے اس نظریہ کی تردید کی کہ سورج کا مدار غیر متحرک ہے، ابو بکر محمد الرازی (م ۹۳۲/۳۱۱) جسے مغرب نے ریزز (RHAZES) کا نام دے رکھا ہے، عہد وسطیٰ کا سب سے بڑا طبیب ہونے کے ساتھ عظیم فلسفی اور ماہر کیمیا بھی تھا، اس نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف کتاب الحاوی میں یونانی، مصری، قدیم عرب اور ہندوستانی طب کا جائزہ پیش کیا۔

ابن البیطار (م ۱۲۴۸/۶۴۶) اپنے زمانہ میں عظیم ترین ماہر ادویات تھا، اس نے اپنی دو مشہور تصانیف المغنی فی الادویۃ اور الجامع لمفردات الادویۃ والاغذیۃ میں مختلف بیماریوں کے علامات بیان کیے ہیں اور حروف تہجی کے اعتبار سے تقریباً چودہ سو (۱۴۰۰) حیوانات، نباتات اور معدنیات کا تفصیلی تذکرہ خود اپنے یا دوسرے ۱۵۰ ماہرین کے مشاہدات کی بنا پر پیش کیا ہے، مشہور عالم بو علی سینا (م ۱۰۳۷/۴۲۸) جسے مغربی دنیا آوی سینا (AVICENNA) کے نام سے جانتی ہے، نے فلسفہ کے موضوع پر النجاۃ، الشفاء، طب کے موضوع پر القانون فی الطب اور نفسیات کے موضوع پر احوال النفس تصنیف کی، اب تک اس کی ۲۳۱ تصنیفات کا انکشاف کیا جا چکا ہے، اور ۱۱۰ دوسری کتابوں کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اسی کی لکھی ہوئی ہے، طب میں اس کی مہارت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے، اس کی کتاب منظر عام پر آنے کے بعد تقریباً پانچ سو برسوں تک یعنی سترہویں صدی کے اختتام تک اپنے موضوع پر سب سے مستند کتاب سمجھی جاتی تھی، علم کے ان درخشندہ ستاروں میں ابن خلدون (م ۱۴۰۶/۸۰۸) بھی شامل ہے،

جو دنیا کا سب سے پہلا ماہر سماجیات ہے، اور جس نے انسانی سماج کو رُخ دینے والے قوانین تلاش کرنے کی جانب توجہ دلائی اور مغرب کے فلسفی COMTE کامٹی سے پچاس سال پہلے سماجی علوم کی جانب توجہ مبذول کرائی، دنیائے علم و فن ابو ریحان البیرونی (م ۱۰۵۱/ ۴۴۲ھ) کی سعی بھی مشکور ہے، جسے طبیعیات ما بعد الطبیعیات، علم الادویہ، کیمیا، جغرافیہ اور تاریخ پر یکساں مہارت حاصل تھی، اس نے اور دوسرے مسلمان سائنس دانوں مثلاً ابن الہیثم نے موجودہ سائنسی تحقیقات کی بنیاد ڈالی تھی۔

علم کی تاریخ کا سب سے بڑا مغالطہ ۔ اور تاریخ انسانیت کا سب سے المیہ :

اس مقالہ کے اختتام سے پہلے میں آپ کی توجہ اس بنیادی حقیقت کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ ہمیں یہ کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ انسان زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے، انسان اپنی ذات سے علم کا نہ تو مرجع ہے اور نہ مصدر، وہ صرف اللہ کی مرضی کو پورا کرنے والا نائب یا نمائندہ ہے، قرآن مجید نے حضرت آدمؑ کو "تعلیم اسماء" (جو علم کی بنیاد ہے) کا ذکر ان کے زمین میں خلافتِ الٰہی کے منصب پر سرفراز ہونے کے تذکرہ کے بعد اور اسی سیاق و سباق میں کیا ہے، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے علم کا استعمال خلیفۃ اللہ کی حیثیت سے کرنے پر مامور تھے، علم کی تاریخ بلکہ تاریخ عالم کا یہ بہت بڑا المیہ تھا کہ انسان نے یہ فراموش کر دیا کہ وہ خالق کائنات کا نائب اور خلیفہ ہے، اسے اس دنیا کی امانت سپرد کی گئی تھی، مالک اور آقا بنا کر نہیں بھیجا گیا تھا کہ وہ زمین کے اوپر اور اس کے اندر پائے جانے والے خزانوں کو اپنے ذاتی، قومی، نسلی اور طبقاتی مفاد کے لیے یا سیاسی برتری حاصل کرنے کے لیے استعمال کرے، انسانیت کی تاریخ اور علم دونوں کے لیے وہ منحوس ترین دن تھا، جب اس نے تباہی کے اس راستہ کا انتخاب کیا، صرف یہ احساس کہ انسان اس دنیا کا مالک ہونے کے بجائے خدا کا خلیفہ یا نائب ہے اسے صراط مستقیم پر قائم رکھ سکتا ہے کیونکہ اس حقیقت کا عرفان ہی اسے من مانی کارروائی کرنے میں مانع ہو سکتا ہے۔

علم کا اس کے مالک سے رشتہ منقطع ہونا واقعتاً بہت بڑا فتنہ ہے، انسان نے علم تو حاصل

کر دیا لیکن اس کے ذہن نے علم کے خالق کو فراموش کر دیا، آج دنیا تباہی کے دہانہ پر کھڑی ہوئی ہے، یورپ اور امریکہ کے سیاست دانوں اور عالموں اور ان تمام لوگوں سے معذرت کے ساتھ جو مغرب کی تہذیب پر نازاں ہیں، میں یہ عرض کروں گا کہ انسان کا اپنے آپ کو خود مختار اور اس دنیا کا حقیقی مالک سمجھ لینا ایک بہت بڑی غلطی تھی، انسان جب اپنی ابتدا کو بھول گیا تو اسے اپنی حیات کا مقصد اور انتہا بھی فراموش ہو گئے۔ میں پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ انسان اس وقت تک اس دنیا کے حالات کو سدھارنے میں ناکام رہے گا، جب تک وہ یہ تسلیم نہ کرے گا کہ وہ صرف ایک مخلوق ہے جسے اپنے خالق کے سامنے پیش ہو کر اپنے اعمال کی جواب دہی بھی کرنی ہے اسے یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اسے جتنا بھی علم حاصل ہوا ہے وہ اس کے ایک سرے پر کھڑا ہوا ہے اور دوسرے سرے پر علم کا خالق، اس کا آقا اور مالک موجود ہے، اگر یہ رشتہ منقطع ہو گیا تو انسان اپنی تخلیق کا مقصد بھی فراموش کر دے گا، اور ہماری دنیا ایک میدان جنگ اور انسانیت کے ایک ایسے مذبح میں تبدیل ہو جائے گی جہاں غلامی کی بے شمار اقسام، بے انصافیوں اور انسانیت کی تذلیل کا دور دورہ ہوگا۔

عجب کیا ہے مہ و پرویں مرے نخچیر ہو جائیں
کہ بر فتراکِ صاحب دولتے بستم سرِ خود را
وہ دانائے سُبل، ختم رُسل، مولائے کل، جس نے
غُبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادئ سینا
حدیث عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیںؔ وہی طٰہٰ

—— (اقبال)

ڈاکٹر عبد الباسط بدر
استاذ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ
رکن رابطۂ ادب اسلامی

اسلامی ادب کی ضرورت

کیا ہم مسلمانوں کو ادب میں ایک قسم کے 'اسلامی بلاک' بنانے کی ضرورت ہے؟ اگر ضرورت ہے تو کیوں؟ ـــــ اور اس کی کیا امتیازی خصوصیت ہے؟

ان سوالات کے جواب دینے کے لیے سب سے پہلے مندرجہ ذیل امور پر روشنی ڈالنا ہوگا، ہمارے گرد و پیش دنیا کا حال، موجودہ اسلامی دنیا، دوسری ادبی تحریکات جو دنیا میں پائی جاتی ہیں اور عالم اسلام کی ادبی سرگرمیوں کا جائزہ۔

ہمارے گرد و پیش دنیا کا حال:

اس مسئلہ میں کوئی دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ دنیا اپنی ترقی کے عروج پر ہے، اس عروج پر جس کا تصوّر بھی پہلے نہیں کیا جا سکتا تھا، انسان کے قدم چاند کی زمین پر پڑ چکے ہیں، دوسرے کواکب تک پہنچنے کے لیے وہ تیار کھڑا ہے، آرام و آسائش کے وسائل لامحدود پیدا ہو چکے ہیں۔ نئی ایجادات اور سائنس و ٹکنولوجی نے جو دنیا کو دیا ہے اس کی طویل فہرست ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ناقابلِ انکار واقعہ ہے کہ اس ترقی اور تمدن نے ایسی جنگوں کو جنم دیا ہے جو ختم ہونے پر نہیں آ رہی ہیں، نسل کشی اور تخریب کاری کے حیرتناک واقعات آئے دن سننے میں آتے ہیں، ہر شخص اپنے اندر ایک بے اطمینانی، خوف، اور نفسیاتی الجھن کا شکار ہے، سائنس کی ترقیاں، ایجادات کی کثرت، مواصلات کی سہولت کوئی بھی انسان کے اندر جو خلا ہے اُس کو پُر کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی، جو ملک سب سے

زیادہ ترقی یافتہ ہے بلکہ جو ترقی وخوشحالی کا نمونہ ہے سب سے زیادہ وہیں انسان اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کرتا ہے، اور ہر وقت خائف رہتا ہے کہ جرائم پیشہ افراد کے ہاتھوں کب ہلاک ہو جائے۔ جرائم پیشگی بڑھتی جارہی ہے اور انسان کی بھوک میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے، جس زمانہ میں یہ مادّی سہولتیں ناپید تھیں، بلکہ اس وقت جب وہ کنویں سے پانی نکالتا اور مٹی کے دیے سے گھر روشن کرتا تھا، اس وقت اپنے آپ کو امن وسلامتی کے لحاظ سے بہتر حالت میں پاتا تھا۔ قافلہ بنا کر پیدل چلنے والے اور اونٹ اور گھوڑوں کی پیٹھ پر بیٹھ کر سفر کرنے والوں کو کہیں کہیں چور ڈاکو کا سابقہ پڑتا تھا، بحری جہازوں کو قزاقوں کا خطرہ رہتا تھا مگر پھر بھی ان کو جو اطمینان قلب اور ذہنی سکون حاصل تھا اس سے بوئنگ اور کنکرڈ طیاروں پر سفر کرنے والا محروم ہے۔

آج کی متمدّن دنیا دو حصّوں میں منقسم ہے، ایک مشرقی بلاک ہے جس کی قیادت روس کے ہاتھ میں ہے، دوسرا مغربی بلاک ہے جس کی سربراہی امریکا کر رہا ہے، ان دونوں طاقتوں کے درمیان سخت کشاکش ہے، اور دوسری اقوام کو اپنے زیرنگوں کرنے کے لیے ان دونوں کے درمیان ایک ریس جاری ہے، غیر محدود مالی وسائل، آتش وآہن کے ذخیرے، منٹوں اور سکنڈوں میں بھڑک اٹھنے والے بم اور اسلحہ کے نت نئے اقسام تیار ہو رہے ہیں اور ہر بلاک کی ساری جدوجہد اس پر مرکوز ہے کہ قوت کا توازن قائم رکھے، اس کا حریف آگے بڑھنے نہ پائے، اس صورت حال نے ساری دنیا کے افراد کو بے چین اور بے قرار کر رکھا ہے، کبھی چند لمحات یا تھوڑے عرصہ کے لیے دونوں بلاک قریب آجاتے ہیں اور ناجنگ معاہدہ کرتے ہیں، اسلحہ کی پیداوار پر پابندی لگاتے ہیں، اور دوسرے ممالک پر سیادت کے حق کو آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں اور عام انسان کی گردن میں پابندی وغلامی کی زنجیر بھاری سے بھاری ہوتی جاتی ہے۔

ان دونوں بلاک میں نظریاتی جنگ بھی ہے دونوں کے اپنے اپنے فلسفۂ زندگی ہیں مشرقی بلاک کے سربراہوں کا عقیدہ ہے کہ فرد کی کوئی اہمیت نہیں ہے، اصل سوسائٹی اور جماعت ہے، لہٰذا وہاں کوئی شخص اپنی پارٹی نہیں بنا سکتا، مارکسی نظام اقتصادیات پر اس کا ایمان ہے، جو فرد کی ملکیت

کو محدود رکھتا ہے۔ اور شخصی آزادی کی اہمیت تسلیم نہیں کرتا، دوسری طرف مغربی بلاک کا عمل اس بات پر ہے کہ ہر فرد اپنی قیمت رکھتا ہے اور سوسائٹی یا جماعت انہی افراد کی بنائی ہوئی ہوتی ہے، اس لیے وہ گروہ جو کسی ملک پر قابض ہے اس کو فرد کی آزادی کا گلا گھونٹنے کا حق نہیں ہے، اس بلاک میں راسمالی نظریہ پر عمل ہے، یعنی ہر فرد کو اجازت دیتا ہے کہ جس قدر چاہے اپنی مادی قوت میں اضافہ کر لے۔

دونوں بلاکوں کے ہمنوا اپنے نظریات کی تبلیغ و اشاعت میں سرگرم ہیں، اور دوسری قوموں کو اپنا فکری ہمنوا بنانے کے لیے ہر قسم کے ذرائع استعمال کرتے ہیں، دوسرے ممالک کو اسلحہ دیتے ہیں، مالی مدد دیتے ہیں، ثقافتی مدد کے طور پر اپنے لٹریچر پھیلاتے ہیں، ان دونوں کی تبلیغی سرگرمیوں میں سب سے زیادہ کارآمد اسلحہ اور کامیاب ہتھیار" ادب و ثقافت" کا ہتھیار ہے جس کے ذریعہ پڑھے لکھے اور ذہین طبقے کو متاثر کیا جاتا ہے، عربی میں اس کو "غزو فکری" کہا جاتا ہے یعنی 'فکری فوج کشی' وسائل اطلاعات سینما، ریڈیو، ویڈیو، ٹیلی ویژن، اخبار و مجلات کے علاوہ سنجیدہ تنقید، افسانے، ڈرامے، تاریخ کی مسخ شدہ کتابیں جن کو اپنے زاویہ نظر سے مرتب تیار کرتے ہیں۔ فلسفہ، زبان کے مسائل پر علمی انداز میں کتابیں اور مقالات پھیلائے جاتے ہیں، اساتذہ کو وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے مدعو کیا جاتا ہے، ان کو ذہنی رشوت دی جاتی ہے، طلبہ کو اسکالرشپ دیے جاتے ہیں، ان کو اپنا بنایا ہوا ماحول دکھایا جاتا ہے، ان کو "آزادی" کے اُن شعبوں سے متعارف کرایا جاتا ہے جو 'تیسری دنیا' میں میسر نہیں ہیں، اور ان کو باور کرایا جاتا ہے کہ یہی تہذیب و تمدن کی علامتیں ہیں جن سے ان کے ہم وطن جہل و افلاس کی وجہ سے ناواقف ہیں، اور اگر ان کوششوں کے باوجود کوئی قوم اپنی تہذیب سے دستبردار ہونا نہیں چاہتی، یا ایسے بلند حوصلہ، ذہین افراد پیدا ہو گئے جو بات کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں اور انھوں نے ان نظریات کی بالادستی قبول نہیں کی تو پھر 'فکری فوج کشی' کے ساتھ عملی فوج کشی کی جاتی ہے، کسی کو آلۂ کار بنا کر باقاعدہ حملہ ہوتا ہے جیسا کہ روس نے چیکوسلاویا ہنگری اور افغانستان میں کیا، یا

جس طرح امریکہ نے کوریا، ویتنام اور لبنان میں کیا، لیکن فکری فوج کشی' خاموشی کے ساتھ اپنا کام جاری رکھتی ہے' اور اس نوعیت کی فوج کشی زیادہ خطرناک ہے کیونکہ جس قوم پر حملہ کیا جاتا ہے اس کا خون نہیں بہایا جاتا، جنگیں نہیں ہوتیں' اور فکر پر قبضہ ہو جاتا ہے، جس کے بعد جسم پر قبضہ آسان ہوتا ہے۔

عالم اسلام کی موجودہ حالت:

اسلامی ممالک یا مسلم ممالک یعنی جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں یا بڑی تعداد میں ہیں ان کے اندر متضاد عناصر کام کر رہے ہیں جو ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں۔ ایک عنصر پسماندگی، کمزوری اور آپس میں افتراق کا ہے، ٹولیوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ دوسرا عنصر، دینی شعور کی بیداری (ISLAMIC AWAKENING) کا ہے جس کے نتیجہ میں اتحاد' قوت اور تنظیم کی غیر معمولی تڑپ ہے جو نئی پود کے اندر پائی جا رہی ہے، جہاں تک پسماندگی کے عنصر کا تعلق ہے اس کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے، دنیا کے کسی عام نقشے پر نظر ڈالئے، مسلمانوں کی اکثریت والے ممالک پر نشان لگائیے اور وہاں کے حالات معلوم کیجیے، جہل، افلاس، مرض، آپس کے جھگڑے، پڑوسی ممالک سے سرد جنگ عام بات ہے' اور اس جنگ کے نتیجہ میں کسی نہ کسی بلاک کا دریوزہ گر ہونا لازمی ہے کوئی ملک ایسا نہیں ہے جو دنیا کی دو عظیم طاقتوں پر اثر انداز ہو سکے اور خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد سے آج تک ان کا کوئی مرکز نہیں ہے جس کے ماتحت دنیا کے تمام مسلمان ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو سکیں، ایسی حکومت جو آئین شریعت کو نافذ کرنے کی ہمت کرے وہ شاذ و نادر ہی ملے گی۔ افریقہ کے اکثر مسلم اکثریت والے متعدد ایسے ملک ہیں جہاں بالادستی غیر مسلم اقلیت کو حاصل ہے اور بہت سے ایسے مسلم ممالک ہیں جن کے حکمرانوں کی شناخت مسلمان کی حیثیت سے ہے مگر اسلام دشمنی میں وہ صیہونی و صلیبی عناصر سے زیادہ بے باک اور بے رحم ہیں، جن ممالک میں اقلیت میں ہیں ان پر مظالم اور مذہب کی بنا پر ان کی شخصیت دوسرے تیسرے درجہ کے شہری کی ہے۔

تمدنی لحاظ سے مسلم ممالک بہت پیچھے ہیں' اقتصادی لحاظ سے بدحال اور اکثر و بیشتر دوسروں

کے محتاج ہیں، یہ ممالک خام مال پیدا کرتے ہیں (ربر، کوئلہ، پٹرول، روئی وغیرہ) لیکن ان سے جو مال تیار ہوتا ہے اور منڈیوں میں جاتا ہے اس پر قبضہ یا تو مشرقی بلاک کا ہے یا مغربی بلاک کا، یہی وجہ ہے کہ یہ ممالک دونوں بلاکوں کے لیے "استخوانِ جنگ" بنے ہوئے ہیں، دونوں اپنی طرف کھینچنا چاہتے ہیں اور کوئی اس بلاک کا شکار ہے، کوئی دوسرے بلاک کا۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ یہ ممالک پسماندہ ہیں، اور مشرقی یا مغربی بلاک میں سے کسی ایک کی تحویل میں ہیں پھر بھی "فکری فوج کشی" کا شکار ہیں، جو وسیع پیمانے پر جاری ہے اور صلیبی مشینریاں بے تحاشہ خرچ کرکے ان کے اندر سے مذہبی حس کو مٹانا چاہتی ہیں اور ان کی کوشش ہے کہ ان کا مذہب ان کی مسجدوں کے حدود میں قید رہے، سیاسی اور اجتماعی اور فکری لحاظ سے یکسو کھلے ہوجائیں، زیادہ سے زیادہ رعایت یہ دی جا سکتی ہے کہ اپنے مذہب کو ایک آثار قدیمہ کی طرح آباء و اجداد کی میراث سمجھ کر کچھ رسوم ادا کرلیں۔ مگر خبردار کہ ان کو سیاست، شہریت، تمدّن اور تہذیب و ادب میں حصہ دار بنانے کی کوشش کریں

اسلامی بیداری کے عنصر کا مظہر یہ ہے کہ نوجوانوں کا ایک گروہ ایسا سامنے آگیا ہے جو اسلام کو ہر شعبۂ جات میں نہ صرف دخیل بلکہ اس کو رہنما بنانا چاہتا ہے، یہ طبقہ عوام میں کم اور یونیورسٹیز، اکیڈمیز اور ٹیکنیکل لیبارٹریز میں زیادہ نظر آتا ہے، ظلم سہتے سہتے کمزوروں میں بھی توانائی آجاتی ہے، اور جب احساس بیدار ہوتا ہے تو ہنستے بڑھ کر آتش و آہن کا مقابلہ اپنی ہتھیلیوں اور ناخنوں سے کرنے لگتے ہیں، اس میں ہزارہا ہزار گرتے ہیں، مرتے ہیں، جلتے ہیں، مگر بالآخر دشمن کے بازو شل کر دیتے اور اس سے ہتھیار چھین لیتے ہیں۔ اسلامی شعور کی بیداری جس طبقے میں ہے اس کی جنگ اس وقت اسی طرح کی ہے، اور جب پڑھا لکھا ذہین طبقہ کسی مقصد کی خاطر قربانیاں دینے پر آجاتا ہے تو نیم خواندہ اور ناخواندہ سب بالآخر اس کے پیچھے چلنے لگتے ہیں۔

اس اثر کو کم کرنے کے لیے سامراجی طاقتیں بھی اپنے نئے ہتھیاروں سے میدان میں مقابلہ کے لیے موجود ہیں، ان نوجوانوں کو سیمناروں، کانفرنسوں میں مدعو کرتی ہیں، یونیورسٹیز میں فری ڈائلاگ

کے لیے بلاتی ہیں، ان کھلونوں سے ان کا ذہن بدلنے کی اور توجہ ہٹانے کی کوشش کرتی ہیں اور کر رہی ہیں۔

عرب ممالک میں ادبی رجحانات ــــ اور ان کی نوعیت :

عرب ممالک میں سیاسی، ثقافتی اور اجتماعی تبدیلیوں نے ادب کو نئے سانچے میں ڈھال دیا ہے اور قدرتی قانونِ ارتقا کے مطابق ان میں پیہم تبدیلیاں آئی ہیں، لیکن اس کے ساتھ بدیسی اثرات اور غیر عربی عناصر کی ریشہ دوانیاں ایسی نہیں تھیں جن سے اہلِ قلم یکسر غافل رہتے، چنانچہ پچھلی صدی میں جو بے راہ روی آگئی تھی، اور عربیت کے نقوش پر سامراجی زبانوں اور ادبیات کی سیاہی چھا رہی تھی اس کو دور کرنے اور زبان و ادب کو اس کا فطری مقام دینے کی کوشش بھی اسی زمانہ سے شروع ہو گئی تھی۔ مثلاً نظم میں بارودی اور ان کے شاگردوں نے عربیت کے چہرے سے اجنبی اثرات کا نقاب اتارنے کی کامیاب کوشش کی اور زبان کو قدیم قواعد کی ڈگر پر قائم رکھا، جب کہ مشینری اسکولوں کے تعلیم یافتہ ادبا (جیسے رزق اللہ حسون، خلیل مطران، جبران جلیل جبران وغیرہ) نے یورپین زبانوں کے جمالیاتی شعور کو عربی قالب میں ڈھال کر پیش کرنا چاہا، کیونکہ انھوں نے انہی ممالک میں تعلیم حاصل کی تھی اور وہاں کے تخیلات کی چھاپ ان کے ادبی انتاج (تخلیق) پر گہری تھی۔ پھر عباس محمود العقاد، عبدالقادر المازنی اور عبدالرحمن شکری نے ادب و شعر میں ایک ایسی تحریک شروع کی جس میں ایک امتیازی عنصر پایا جائے اور اہلِ زبان کو نئے آفاق سے روشناس کرائے، چنانچہ انھوں نے انگریزی کے رومانی ادب سے کچھ قدریں مستعار لیں، مگر ان ادبار کا تعلق قدیم سے اس درجہ وابستہ تھا کہ انھوں نے جو کچھ کہا وہ خیالات اور طرزِ بیان تو باہر کا تھا مگر زبان کا ڈھانچہ خالص عربی تھا، اس طرح عربی کی ادبی شخصیت (Literary Personality) ضائع نہیں ہوئی، جب کہ مصر کے قبطی اہلِ قلم اور لبنان کے مسیحی ادبار نے زبان کی شخصیت کو مسخ کرنے کی بھرپور اور منظم کوشش کی، جس کے نتیجہ میں ایسے شعراء ابھرے جن کا ماضی سے کوئی ربط نہیں تھا اور جن کی مغربی ثقافت ان کی عربی ثقافت سے زیادہ گہری اور وسیع تھی، چنانچہ انھوں نے خالص مغربی اسکول کی نقالی کو اپنے فن کا محور بنایا، اور دیکھتے ہی دیکھتے چند برسوں کے اندر ایسے شعراء منظرِ عام پر

آگے جو مغربی ادب کی رمزیت SYMBOLISM یا اشتراکیت کی روح اپنے کلام میں پیش کرنے لگے، کچھ لوگ پرناسیزم، یا رومانزم کی نقالی کرنے لگے، اور ہم ایسے اشعار پڑھنے لگے جن کے الفاظ تو عربی کے تھے مگر شعری ڈھانچہ، فکری اساس اور احساسات کی ترجمانی کا انداز سب مغربی اسکولوں سے مستعار لیا گیا تھا، ان شعراء کے کلام جن رسالوں میں شائع ہوتے ان کا انداز علمی اور تحقیقی ہوتا طباعت اور کاغذ کی عمدگی اس پر مستزاد تھی، اس کو پڑھنا ایک فیشن بن گیا جس سے ان شعراء کی ہمت اور بڑھی اور وہ مغربی طرز ادا کی دعوت بھی دینے لگے، اور رفتہ رفتہ آزاد شاعری بے وزن و قافیہ جس کو ہم "نظم منثور" یا نثر منظوم کہہ سکتے ہیں نوجوانوں میں مقبول ہونے لگا۔

افسانوں کا فنی ڈھانچہ مغربی اسکولوں سے مستعار لینے والے ادبار بھی فروغ پانے لگے، جیسے محمد حسین ہیکل، محمود تیمور، یحییٰ حقی وغیرہ، لیکن انھوں نے اسی قالب یا ڈھانچہ میں عربی و اسلامی تشخص کو باقی رکھنے کی کوشش بھی کی، اور یہ خیال عام ہو گیا کہ ان کا یہ طرز باقی رہے گا اور قبول عام حاصل کرے گا، لیکن ان کے بعد جو افسانہ نگار آئے انھوں نے عربی و اسلامی تشخص کو بھی زائل کر دیا ان کے انتاجات (تخلیقات) کو پڑھ کر صاف جھلکنے لگا کہ ان کے اندر البرٹ موراویا، البرکامو اور ہمنگوکی روح کام کر رہی ہے، سہیل ادریس، یوسف شارونی، احسان عبدالقدوس، الطیب الصالح کے افسانے اور ناولیں اس رجحان کے عکاس ہیں۔

عصر حاضر کے عرب ادبار کے انتاجات کا مطالعہ کرنے والے واقف ہیں کہ موجودہ ادب، نظم، افسانہ، ناول، صحافت وغیرہ میں جو نظر آتا ہے اس پر مغربی اسکولوں کا اثر بیسویں صدی کے نصف آخر سے بڑھنا شروع ہوا ہے، ان میں بعض اصناف سخن پر تبلیغی اثر غالب ہے اور نصرانیت کے عیسائی مبلغ کھلم کھلا اسلامی اقدار پر حملے کرتے ہیں، ان کی نقالی اور فیشن کے طور پر بعض وہ افراد بھی ہیں جو مسلم گھرانوں میں پیدا ہوئے مگر ان کی ذہنی تربیت مغربی مدارس میں ہوئی، وہ مغربی اقدار کو عربی قالب میں ڈھالنے کی مہم چلا رہے ہیں، ان کا مغربی ادب سے تاثر صرف بعض تعبیرات تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ فلسفۂ حیات جو یورپین آداب کا خاصہ ہے اور وہ روایتی پس منظر (BACK GROUND) بھی منتقل

کرنا چاہتے ہیں جس کے لازمی نتائج یہ ہیں کہ مشرقی اقدار و رواج اور اسلامی عقائد پر ان کی براہ راست ضرب پڑے، افسانوں اور ناولوں میں یہ روح کہیں جھلکتی ہے اور کہیں صاف طور پر نظر آتی ہے۔

ہمارے ادبا کی دوسری قسم وہ ہے جو مغربی اور مشرقی بلاکوں میں سے کسی ایک کی داعی و مبلغ ہے، مشرقی بلاک کے ہمنوا اپنے ادبی انتاجات میں ان افکار کی ترجمانی کرتے ہیں اور اپنے فن کو اس کی تبلیغ کے لیے وقف کر چکے ہیں۔ اس طبقہ میں عبدالوہاب البیاتی، محمد الفیتوری، عبدالرحمن الخمیسی، عبدالرحمن الشرقاوی، محمود درویش، توفیق زیاد، احمد سلیمان الاحمد کے نام نمایاں ہیں۔ کچھ لوگ کمیونزم کے داعی پہلے ہیں اور ادیب اور صاحب فن بعد میں، ان کے فن کا یہ مشن ہے کہ اشتراکیت کی قدروں کو متعارف کرائیں، ان لوگوں میں ہم محمود امین العالم، عبدالعظیم انیس (جن کو لینن پرائز مل چکا ہے)، حسین مروہ، محمد مندور، عبدالمنعم تلیمہ کے نام سرفہرست پاتے ہیں۔ مغربی بلاک کو بھی ان ادبا میں اپنے شکار ملے ہیں، جن کا فن ایک طرح کا لاوڈ اسپیکر ہے جس سے وہ مغرب کی تقلید، اس کے تمدن کی عظمت، وہاں کے فنون لطیفہ (مصوری، موسیقی) کے رضا کار داعی ہیں، اس طبقہ میں زیادہ تر لبنان اور شام کے عیسائی اور مصر کے قبطی ہیں جیسے ادونیس، یوسف الخال، سعید عقل اور غالی شکری وغیرہ، یہی نہیں بلکہ عیسائیت جو خود اپنے وطن میں ناکام رہی، اور مغرب کے ترقی پسند طبقہ نے اس کو "اوہام کا جھیلا" کہہ کر نظر انداز کر دیا وہ مصر و شام کی سرزمین پر برگ و بار لا رہی ہے، اگر آپ صلاح عبدالصبور اور بدر شاکر السیاب کے انتاجات پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ عربی لباس میں کوئی پوپ بول رہا ہے، اس سے بڑھ کر یوسف الخال، خلیل حاوی، توفیق صائغ، لویس عیوض اور غالی شکری کے یہاں تو انجیل مقدس کی تعبیرات ہی نہیں بلکہ وہ قصے بھی ملیں گے جو اب تک صرف گرجوں میں محصور تھے، اور یہی تصورات و قصص ان ادبا کے نظم و نثر کا رمزی عنوان ہیں۔

غرض ہماری ادبی دنیا ایک نیلام گھر یا مچھلی بازار ہے جس میں طرح طرح کی بولیاں بولی جارہی ہیں، نئی نئی آوازیں سنائی دے رہی ہیں اور اس بازار میں جو عنصر مغلوب ہے اور جس کی نمائندگی نہیں کے برابر ہے وہ عربیت و مشرقیت اور اسلامی تصور ہے، البتہ اسلامی اقدار کے خلاف بڑی

چابکدستی اور سازش کے طور پر ذہنی بغاوت پھیلانے کا کام زور و شور سے جاری ہے۔ ان اسباب کی بنا پر، اسلامی اقدار کی وکالت کے لیے ایک طبقہ کا کھڑا ہو جانا ایک قدرتی ردِ عمل ہے، ایک ارب مسلمان جو دنیا کے اطراف میں پھیلے ہوئے ہیں ان کے ادب و فن کا کوئی تشخص Identity نہ ہو ایک سانحہ ہے۔

لہذا ایک ایسے ادب کی ضرورت ہے جو ان ذہین افراد (Intellectuals) کی پیاس بجھا سکے اور مغربی و مشرقی بلاک کے مبلغوں کے مقابلہ میں ایسے ادباء سامنے آئیں جو اپنے فن کو انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کرنا چاہتے ہیں جن کا فنی رجحان ان کے عقیدہ کا پرتو ہے اور جو اپنے ماضی کے ورثہ میں وہ ابدی حقائق پاتے ہیں جو ادب کو تعمیرِ وطن، تعمیرِ اخلاق اور عقیدہ و محبت کا آئینہ دار بنا سکتے ہیں۔ ان حالات میں جن سے عالم اسلام دوچار ہے اور جس طرح وہ فکری خودکشی کا شکار ہے، اس کا رد اگر اسی اسلحہ اور اس سے زیادہ طاقت ور اسلحہ سے نہیں کیا گیا تو انسانیت کے ساتھ بڑی بے انصافی، اور وطن و قوم کے حق میں بڑی خیانت ہوگی۔

غالباً یہ دُہرانے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ طاقت ور اسلحہ جس سے مشرقی و مغربی ادب کے یلغاروں کو روکا جا سکے، ایک ادب میں ہو سکتا ہے، جو انسانیت کی قدروں کو تمام اقدار پر بالا تسلیم کرتا ہو، لیکن اس کے لیے ضروری ہے دونوں طرف کے حملوں کا صحیح جائزہ لیا جائے" ادبیات کے سرمایہ کو پڑھ کر یہ دیکھا جائے کہ اسلامی ادب کہاں تک ان کے ساتھ چل سکتا ہے اور کہاں سے راہیں جدا ہوتی ہیں، پھر اس موڑ کا تعین ناگزیر ہے جہاں سے ہماری راہیں الگ ہوتی ہیں۔ یہ موضوع ایک مستقل گفتگو یا بحث کا متقاضی ہے۔

ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی

قصیدۂ بُردہ

(۲)

۱۵۔ لوکنت اعلم انی ما اوقرہ　　کتمت سرّا بدالی منہ بالکتم

(اگر میں جانتا کہ اس مہمان (بڑھاپے) کی تواضع اعمال صالحہ سے نہیں کرسکوں گا تو میری کی آمد کو جو پہلے ایک راز تھی، یعنی چند ہی بال سفید ہوئے تھے، مہندی یا خضاب سے چھپا دیتا)۔

درحقیقت یہ شعر ایک طنز ہے کہ بڑھاپے کو چھپایا نہیں جاسکتا اور اگر مصنوعی طریقہ پر چھپا بھی دیا گیا تو زندگی کو موت سے قریب کرنے سے یہ حرکتیں روک نہیں سکتیں، چنانچہ اس کے بعد کے اشعار میں مزید وضاحت کرتے ہیں اور بڑی حکمت کی باتیں فرماتے ہیں۔

۱۶۔ من لی برد جماح من غوایتہا　　کما یرد جماح الخیل باللجم

(کاش! کوئی نفس سرکش کو قابو میں لے آتا کہ وہ بھٹکنے نہ پائے، جیسے لگام سے گھوڑوں کی سرکشی اور چمک کو قابو میں کرلیا جاتا ہے)۔

۱۷۔ فلا ترم بالمعاصی کسر شہوتہا　　انّ الطعام یقوی شہوۃ النّہم

(معصیت کا علاج معصیت سے کرنے کی کوشش نہ کرو، کھانا لالچی کی بھوک بڑھاتا ہے)۔

یہ تو اس شعر کا مفہوم ہے مگر عربی ترکیب کے لحاظ سے اس شعر کا ترجمہ یوں ہوگا:

(نفس کی خواہشات کو دبانے کا قصد معصیت کے ذریعہ نہ کرو، کیونکہ کھانا لالچی کی بھوک بڑھاتا ہے)۔

اس شعر میں دراصل بعض یونانی فلاسفہ کا جواب ہے، جن کا خیال تھا کہ نفس کی بھوک پوری کردو تو وہ خود سیر ہو کر اس چیز سے متنفر ہو جائے گا، جس سے اس کو روکا جا رہا ہے، علامہ بوصیریؒ اس کی تردید کرتے ہوئے دلیل کے طور پر فرماتے ہیں:

۱۸۔ والنفس کالطفل ان تھملہ شبّ علی حبّ الرضاع وان تفطمہ ینفطم

(انسان کا نفس تو ایک شیرخوار بچہ کی طرح ہے اگر اس کو دودھ پلانا نہ چھوڑ دو تو بڑھاپے تک رضاعت کا طالب رہے گا، اور اگر اس کا دودھ چھڑا دو تو چھوٹ جائے گا)۔

۱۹۔ فاصرف ھواھا وحاذر أن تولیہ ان الھوی ماتولّیٰ یُصم أو یَصم

(نفس کی خواہشات کو دباؤ، اور اس بات سے ڈرتے رہو کہ کہیں اس کے ہاتھ تمہاری باگ ڈور نہ آجائے، کیونکہ خواہشات کی جب بھی حکومت ہوگی وہ یا تو ہلاک کردے گی یا پھر رسوا کر کے چھوڑے گی)۔

ان اشعار میں (ہوی) کا لفظ خواہشِ نفسانی کے معنوں میں آیا ہے، برخلاف ابتدائی اشعار کے جن میں یہی لفظ محبّت یا عشق کے معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔

۲۰۔ وراعھا وھی فی الاعمال سائمۃ وان ھی استحلت المرعیٰ فلا تسم

(اور ذرا نفس کی دیکھ بھال اس حال میں بھی کرتے رہو جب وہ اعمال صالحہ کے انجام دینے میں منہمک ہو، اور اگر یہ دیکھو کہ اس میدان میں "چرنا" اس کو بھلا لگنے لگا ہے تو پھر اس کو اس میدان میں نہ چراؤ)۔

مطلب یہ ہے کہ نفس کے فریب پر بھی نگاہ رکھو ایسا بھی ہوتا ہے کہ جدوجہد سے فرار کی خاطر یا ریا و نمود کے لیے بھی وہ بعض اچھے کام میں مشغول ہو جاتا ہے، اور اسی میں اس کو مزہ ملنے

لگتا ہے، اور غرورِ نفس پیدا ہو جاتا ہے، لہٰذا اگر اپنے نفس کی یہ حالت دیکھو تو پھر اس کو اعمالِ صالحہ میں سے ایسے کام پر مامور کرو جس میں اس کا جی نہ لگتا ہو اور مزہ نہ ملتا ہو، واضح ہے کہ حضرت بوصیریؒ کا مقصد "اعمال" سے فرائض و واجبات نہیں ہے، کیونکہ وہ تو جی لگے یا نہ لگے، مزہ ملے یا نہ ملے ہر حال میں انجام دینا ہے، اگر کسی کا فرض نمازوں میں جی لگنے لگے اور حضوری کی لذّت حاصل ہونے لگے تو محض نفس کی خلاف ورزی کی خاطر اس کو چھوڑا نہیں جا سکتا، البتہ بعض نفلی عبادتیں اور تقرب کے دوسرے کام جن کے بجائے دوسرے کام ہو سکتے ہیں، اس میں سے کوئی کام اگر ایسا ہو جس میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کو ثانوی درجہ حاصل ہو، اصل جذبہ لذّت اندوزی کا ہو تو ایسے کام سے خواہ وہ کتنا ہی اہم اور قابلِ قدر کیوں نہ ہو، احتراز کرنا ہی بہتر ہے، کیوں کہ:

۲۱۔ کم حسنت لذة للمرء قاتلة   من حیث لم یدر ان السم فی الدسم

(بسا اوقات کسی مہلک لذّت کو نفس حسین بنا کر دکھا دیتا ہے، اور اس کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ اس میں ہلاکت کا سامان کہاں پوشیدہ تھا، اور یہ کہ اکثر زہر لذیذ کھانوں ہی میں ملا ہوتا ہے)۔

۲۲۔ واخش الدسائس من جوع ومن شبع   فرب مخمصة شر من التخم

(بھوکے ہونے، شکم سیر ہونے، دونوں صورتوں میں نفس کی سازشوں سے ڈرتے رہو، کیونکہ کبھی فاقے کی کیفیت بد ہضمی سے بھی زیادہ بری ثابت ہوتی ہے)۔

۲۳۔ واستفرغ الدمع من عین قد امتلأت   من المحارم والزم حمیة الندم

(اور اس آنکھ سے آنسو اچھی طرح بہا ڈالو جو کہ محرمات سے بھر گئی ہے، اور شرمندگی و ندامت کی پرہیز پابندی سے کرتے رہو)۔

یعنی آنکھ جو نامحرموں کو اور حرام اشیاء کو دیکھتے دیکھتے بھر گئی ہے، اس کا علاج یہ ہے کہ توبہ و ندامت کے آنسو اس درجہ بہاؤ، جیسے کنویں کا سب پانی نکال کر اس کو خالی کر دیا جاتا ہے، "استفراغ" کے معنی ہیں پتیلی یا کسی برتن میں یا کنویں میں جو کچھ ہے، ان سب کو نکال کر صاف کر دینا اسی طرح آنکھ کو بھی علاج

کی ضرورت ہے کہ آنسوؤں سے اس کو اچھی طرح دھو کر پاک کیا جائے، علاج کے ساتھ احتیاطی تدبیر بھی ضروری ہے تاکہ آئندہ مرض کا حملہ نہ ہو، لہٰذا ندامت کے احساس کو ہمیشہ تازہ رکھو یہی احتیاط پر قائل کرے گا۔

یہ شعر علامہ بوصیریؒ رحمۃ اللہ علیہ کی دور رس باریک بین اور وسیع نظر کا مظہر ہے، اس مختصر سے اور سادہ ترکیب کے شعر میں انھوں نے جوگیانہ فلسفہ، اور غیر اسلامی طریق تزکیہ کا بہت خوب صورتی سے رد کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جسم کے مطالبات کو اس درجہ نظر انداز کیا جائے کہ اس کے اندر سے مادیت کا عنصر ہی ختم ہو جائے، کیونکہ جوگیانہ تصوّف کے رو سے جسم انسانی روح کا قید خانہ ہے، لہٰذا روح کو جلا دینے اور نکھارنے کے لیے ضروری ہے کہ جسم کو فاقہ دے دے کر محیّر العقول مجاہدات کرا کے غیر فطری شدائد کے ساتھ عبادتیں کرا کے اس کو گھلایا جائے یہاں تک کہ جسم کا نہ کوئی تقاضہ باقی رہے، اور نہ خواہشات پیدا ہو سکیں۔

اسلامی تعلیمات سراسر اس نظریہ کے مخالف ہیں، انسانیت کے لیے اسوۂ کامل حضور اکرم نبی الرحمۃ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے، جس میں روح اور جسم دونوں کے مطالبات کمال اعتدال اور معجزانہ توازن کے ساتھ پورے کیے گئے ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے "حجۃ اللہ البالغۃ" میں لکھا ہے کہ انسان جسم کے کچھ مطالبات ہیں، جیسے بھوک و پیاس اور جنس وغیرہ ان کو ہم مادی طلب کہتے ہیں، دوسرے روح کے مطالبات ہیں، مثلاً اپنے خالق کے آگے سر نیاز خم کرنے کا جذبہ، اللہ کی ذات صفات کا علم حاصل کرنے کا جذبہ، اس کی خوشنودی کے لیے اپنے آپ کو مٹا دینے کا جذبہ، جس کو شاہ صاحب روحانی قوت سے تعبیر فرماتے ہیں، یہ دونوں جذبے ہر انسان میں پائے جاتے ہیں، لیکن کسی میں ایک قوت غالب ہوتی ہے، کسی میں دوسری کسی کے اندر دونوں طاقتوں میں مصالحت ہوتی ہے، کسی میں منافست یعنی کوئی دونوں مطالبے خوش اسلوبی سے پورا کرتا ہے، اور کوئی ایسا ہوتا ہے کہ کبھی فرشتہ ہے تو کبھی شیطان، دونوں طاقتیں اس کو اپنی اپنی طرف کھینچتی ہیں۔

شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ انبیائے کرام کی روحانیت اور مادیت دونوں قوی تر ہوتی ہے، اور ان کے درمیان مصالحت رہتی ہے۔

مقصود اس تفصیل سے یہی بیان کرنا تھا کہ جسم کے تقاضے پوری شدت کے ساتھ ایک تندرست اور صحت مند انسان میں موجود ہونا چاہیے، وہ انبیائے کرام میں بدرجۂ اتم موجود تھے۔

علامہ بوصیریؒ فرماتے ہیں کہ انبیائے کرام کا طریقہ چھوڑ کر کوئی شخص فاقہ کرکر کے اپنے آپ کو اس امید میں ہلاک کرے کہ اس کی روحانیت جاگ اٹھے گی، دراصل یہی شیطان کی ایک چال اور نفس کا فریب ہے، فقر، افلاس بھی کبھی انسان کو کفر تک پہنچا دیتا ہے، بھوکے رہنے کی بہ نسبت سیر شکم ہو کر کھالینا زیادہ احتیاط کی بات ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ انسان ایک چوپایہ کی طرح صرف کھاتا ہی رہے اور غیر اختیاری مشقت برداشت کرتا رہے، اسی لیے انھوں نے شروع ہی میں فرما دیا کہ بھوک اور شکم سیر ہونے کی حالتوں میں نفس کی سازشوں سے ڈرتے رہو، خطرہ دونوں میں ہے، اعتدال اور توازن ہر کام میں مطلوب و مقصود ہے۔

۲۴۔ وخالف النفس والشیطان واعصهما — وان هما محضاك النصح فاتهم

۲۵۔ ولا تطع منهما خصما ولا حكما — فانت تعرف كيد الخصم والحكم

(نفس اور شیطان کی مخالفت کرتے رہو اور کھل کر ان کی حکم عدولی کرو، اور اگر یہ دونوں مخلصانہ خیرخواہی کا دعویٰ کریں تو ان کو مجرم ٹھہراؤ)۔

نفس اور شیطان میں سے کسی کی بھی فریق بناکر یا قاضی بناکر اطاعت نہ کرو کیوں کہ تمھیں معلوم ہے کہ ایسے فریق اور ایسے قاضی کی کیا سازش ہوگی، مطلب یہ ہے کہ بسا اوقات انسان کوئی برا کام کرتا ہے، اور اس کا دل یا شیطانی وسوسہ اس کی تاویل کے ذریعہ مفید کام یا ضروری کام کی حیثیت سے سامنے لے آتا ہے، مثلاً ایک شخص نے چوری کی، اس کے نفس یا شیطان نے اس کو سمجھایا کہ یہ دولتمند جو غریبوں کا خون چوس کر کے مالدار بن گئے ہیں، اور جو غریبوں کا حق دینے کے لیے تیار نہیں ہیں، ان کی مرضی کے خلاف ان سے چھین کر یا چھپ کر کچھ مال لے لیا گیا تو یہ ایک بہادری کا کارنامہ ہوا، اس کو وہ چوری نہیں کہا جا سکتا، جس کی مذہب میں مذمت آتی ہے۔ اسی طرح دوسرے جرائم کی بھی تاویل کی جاتی

ہے، یا کی جا سکتی ہے، جرائم اور حرام کے ارتکاب میں جب نفس دھوکہ دے سکتا ہے تو مختلف فیہ مسائل بدعات و رسوم کا پوچھنا ہی کیا ہے، لہٰذا جب بھی نفس یا شیطان خیر خواہی کے پردہ میں اس طرح کی تاویل سمجھائے تو چاہیے کہ انسان اس مجرمانہ عقلیت کو ملزم قرار دے۔

دوسرے شعر میں یہ فرماتے ہیں کہ نفس تمہارے دینی شعور اور احکام و اطاعت کی راہ میں اگر فریق بن کر آئے تو اس کی حکم عدولی کو فرض سمجھو اس طرح فیصلہ کا اختیار کبھی دشمن کو نہ دو اگر بُرائی پر اُکسانے والے نفس کو قاضی بنا دیا یعنی دل کے فیصلے کو قبول کر لیا تو یہ ایسا ہی ہے، جیسے کسی چالباز اور سازشی دشمن کے ہاتھوں اپنا فیصلہ کرایا جائے۔

۲۶۔ استغفر اللہ من قول بلا عمل   لقد نسبت به نسلا لذی عقم

۲۷۔ امرتك الخير لكن ما ائتمرت به   وما استقمت فما قولی لك استقم

(قول بلا عمل کے (جرم) کی اللہ سے معافی چاہتا ہوں، درحقیقت میں نے (بغیر خود عمل کیے ہوئے صرف باتیں بنا کر ایسا کام کیا ہے جیسے) میں نے ایک بانجھ کی نسل کا نسب نامہ تیار کر دیا)۔

(میں نے تم کو تو نیکی کی ہدایت کی مگر خود اس پر عمل پیرا نہیں ہوا، اور نہ ان باتوں سے فائدہ اٹھایا تو پھر میری اس بات کا کیا وزن رہ جاتا ہے جو میں تم سے کہتا ہوں کہ "راہ راست پر قائم رہو")

۲۸۔ ولا تزودت قبل الموت نافلة   ولم اصل سوی فرض ولم أصم

(میں نے اتنا بھی تو نہیں کیا کہ مرنے سے پہلے کچھ نوافل کا توشہ جمع کر لیتا، سوائے فرض نماز، روزے کے میں نے نہ تو نمازیں پڑھیں اور نہ روزے رکھے)۔

اس انکسار ندامت کے مضمون ہی سے علامہ بوصیری اپنے قصیدے کے اصل مضمون یعنی نعت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی گریز کرتے ہیں۔

۲۹۔ ظلمت سنة من احيا الظلام الی   ان اشتکت قدماه الضر من ورم

"میں نے اس ذات گرامی کی راہ ہدایت پر ظلم کیا، جو راتوں کو بیدار
رہا کرتے تھے، اس حد تک کہ آپ کے پائے مبارک پر ورم آجایا کرتا تھا۔"

اس شعر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز تہجد کی طرف اشارہ ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے: کان یقوم حتی تتفطر قدماہ" یعنی آپ اتنی دیر قیام فرماتے تھے کہ آپؐ کے دونوں پائے مبارک پھٹ پھٹ جاتے تھے۔

حضرت مغیرہ سے روایت ہے:

ان کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لیقوم أو لیصلی حتی ترم
قدماہ او ساقاہ فیقال لہٗ فیقول افلا أکون عبدًا شکورًا۔[1]

یعنی "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اتنی دیر قیام فرماتے تھے (یا) نماز پڑھتے تھے (روایت میں لفظی اختلاف ہے) کہ آپؐ کے دونوں پائے مبارک ورم کر جایا کرتے تھے، صحابہؓ عرض کرتے کہ آپؐ اتنی مشقت کیوں برداشت فرماتے ہیں؟ تو آپؐ فرماتے کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں۔"

اس شعر سے ایک گمان یہ ہو سکتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمیشہ کا یہی معمول تھا، لیکن احادیث و شمائل کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور اکرمؐ عام طور سے مع وتر گیارہ رکعتیں پڑھا کرتے تھے، زیادہ سے زیادہ پندرہ رکعت کی روایت ملتی ہے، لیکن حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ دو رکعت میں رات تمام ہوگئی، ایسا بھی ہوا کہ پہلی رکعت دو منزل یا تین منزل کی تلاوت فرمائی، رکوع قیام کے بقدر کبھی کبھی طویل ہوتا تھا۔

علامہ بوصیریؒ فرماتے ہیں کہ جس ذات گرامی کی عبادتوں کا یہ حال ہو، اس کی سنّت پر ہم نے ظلم کیا، یعنی اس کی اتباع نہیں کی تو ہم کس طرح اپنے آپ کو جاں نثار اور عاشق شمار کریں۔

---

[1] یہ دونوں روایتیں صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ "باب قیام النبی صلی اللہ علیہ وسلم اللیل" میں مذکور ہیں۔

۳۰۔ وشد من سغب احشاءہ وطوی   تحت الحجارۃ کشحا مترف الأدم

"اور میں نے اس ذات گرامی کی سنت پر ظلم کیا ہے جنھوں نے) بھوک کی شدت
کو دبانے کے لیے اپنے پیٹ کو باندھا اور اپنی کمر کے اوپری حصہ پر جس کی جلد انتہائی
نازک تھی، پتھر رکھا۔"

صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ :

جئت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یومًا فوجدتہ جالس
مع اصحابہ یحدثھم وقد عصب بطنہ بعصابۃ فقالوا من الجوع۔

"ایک دن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا
کہ آپؐ اپنے صحابہؓ سے بیٹھے گفتگو فرما رہے ہیں، اور شکم مبارک کو ایک پٹکے (کپڑے کا
ٹکڑا) سے باندھ رکھا ہے، لوگوں نے بتایا کہ یہ بھوک کی وجہ سے تھا۔"

۳۱۔ وراودتہ الجبال الشم من ذھب   عن نفسہ فأراھا ایما شمم

"اور سونے کے سربلند پہاڑوں نے حضور کا دل لبھانا چاہا مگر حضور (صلی اللہ
علیہ وسلم) نے اپنی بے مثال بلندی کا مظاہرہ فرمایا۔"

یہ شعر بھی گزشتہ اشعار سے معنی میں مربوط ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ہم نے اس ذات گرامی کی سنت
پر ظلم کیا، جن کی عبادت بے مثال تھی، جو اپنے اختیار کردہ فقر و افلاس میں زندگی گزارتے تھے پیٹ
پر پتھر باندھ کر رہتے تھے، اور اگر وہ چاہتے تو دنیا کی ساری دولت ان کے قدموں میں ڈھیر
ہو سکتی تھی۔

روی انہ صلی اللہ علیہ وسلم قال عرض علیّ ربی
بطحاء مکۃ ذھبا فقلت لا یارب ولکن اجوع یوما واشبع
یوما فاذا شبعت حمدتک واذا جعت تضرعت الیک
ودعوتک۔

"روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے ربّ نے مکہ مکرمہ کے سارے کنکروں کو سونے میں تبدیل کر کے مجھے پیش کیا تو میں نے عرض کیا بارِ الٰہ! مجھے یہ نہ دے، مجھے تو اتنا دیجئے کہ ایک دن بھوکا رہوں اور ایک روز شکم سیر ہو کر کھاؤں، جب شکم سیر ہو کر کھاؤں تو آپ کی حمد کروں اور جب بھوکا رہوں تو تجھ سے گڑگڑا کر مانگوں اور دعا کروں۔"

۳۲۔ وکیف تدعوا الی الدنیا ضرورۃ من — لولاہ لم تخرج الدنیا من العدم

"اور کس طرح دنیا کی طرف بُلاتی اس ذات کی ضرورت جو ذات اگر نہ ہوتی تو دنیا عدم سے وجود کی طرف نہ لائی جاتی۔"

یعنی آپ اس دنیا کی خلقت کا باعث ہیں، آپؐ نہ ہوتے تو یہ کائنات نہ ہوتی، اپنے وجود کے لیے دنیا آپؐ کی طالب تھی، آپ سبب اور علت ہیں اس کائنات کی تخلیق کا، لہٰذا دنیا آپؐ کی طالب ہو، یہ تو سمجھ میں آنے والی بات ہے لیکن آپ دنیا کے طالب ہوں، یا آپؐ کی ضرورت دنیا کی طرف آپ کو مائل کرے یہ کیونکر ممکن ہے

۳۳۔ محمد سید الکونین والثقلین — والفریقین من عرب ومن عجم

"(یہ جن کا تذکرہ ہو رہا ہے) وہ ذات گرامی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہے، جو دونوں جہاں کے سرور جن وانس کے آقا اور عرب وعجم کے سردار ہیں۔"

۳۴۔ نبینا الآمر الناھی فلا احد — ابرّ فی قول "لا" منہ ولا "نعم"

"وہ ہمارے نبی ہیں، حکم دینے والے، روکنے والے، آپ سے زیادہ سچا، حق بات کہنے والا کوئی انسان نہیں ہے، آپ کے "ہاں" کہنے اور "نہیں" کہنے دونوں میں آپ کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔"

۳۵۔ ھو الحبیب الذی ترجی شفاعتہٗ — لکلِ ھولٍ من الاھوال مقتحم

"آپ وہ محبوب (شخصیت کے مالک) ہیں، جس کی شفاعت کا آسرا ہر پیش آنے والی ہولناک حالت میں کیا جاتا ہے۔"

شیخ حمد الجاسر
ترجمہ: ضیاء عبداللہ (جدہ)

علامہ عبدالسلام الدرعی النّاصری کا سفرنامۂ حج

(۶)

اُکرہ اور الحنک سے نکلنے کے بعد ینبع کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے (ینبع دراصل ایک جگہ کا نہیں بلکہ علاقہ کا نام ہے) اس کے شروع میں وہ گاؤں ہے جس کو آجکل ینبوع النخل کہتے ہیں، حوراء، دوراء، عُقَیق، نبط سب اس علاقہ کی وادیاں ہیں، اس کے بعد ینبع کی بندرگاہ پڑتی ہے جو سمندر کے کنارے پر ہونے کی وجہ سے ینبع البحر کہلاتی ہے، اس کا ذکر بعد میں آئے گا۔

العُقَیق۔النبط:

حوراء سے عصر کے قریب کوچ کیا، دو فرسخ (فرلانگ) چلنے کے بعد وہ راستہ آگیا جو دو پہاڑیوں کے درمیان سے ہو کر گزرتا ہے اور بہت تنگ ہے، جانے والے قافلے کے دائیں ہاتھ کی جانب ایک پہاڑی غار ہے جس کو المغایر کہا جاتا ہے، یہاں تھوڑا پانی رُکا ہوا سا تھا، غالباً بارش کا پانی رہ گیا ہے کیوں کہ آس پاس کوئی چشمہ یا کنواں نہیں دکھائی دیا، اس تنگ راستے سے نکلنے کے بعد جو وادی ہے اس کا نام عُقَیق (مُصغّر) ہے۔ شیخ ابو سالم کہتے ہیں کہ اس وادی کا نام عُقَیق نہیں بلکہ "عقوق" ہونا چاہیئے، کیونکہ بدّو "چوری اور سینہ زوری" میں جواب نہیں رکھتے، انتہائی ترش رو، اکھڑ اور بے رحم قسم کے لوگ ہیں، اس وادی پر بھی شیخ عبداللہ بن القاضی نے چند شعر کہے ہیں، 'یا سائرا یبتغی حِجتنا ـــ بدرب الحجاز انتبہ یا صدیق ـــ اور

آخری شعر ہے ولکنہ (؟) لاتری مثل ما تدا ہ علی أرض وادی العقیق۔ ان اشعار کا ترجمہ یہ ہے:

"اے حج کے لیے جانے والے۔ حجاز کے راستے میں ہوشیار رہنا میرے دوست،
مصر سے مکہ کا راستہ آسان نہیں ہے، کہیں راستہ ہموار ہے، کہیں سنگلاخ ہے، کہیں
مسطح ہے، کہیں گڑھے ہیں،
وادی رمل میں سخت مشکلات کا سامنا ہوگا، اور ایسی گھاٹیاں آئیں گی جس کو پار کرنا کمر
توڑ دیتا ہے،
مگر ان راستوں کی (قدرتی مشقتوں) کے باوجود جو مصیبت وادی عُقیق میں پڑتی ہے
وہ زیادہ دشوار معلوم ہوتی ہے۔ ہاں یہاں سے نکل کر جب وادی حَریق میں پہنچو گے
تو اطمینان کا سانس لو گے۔"

ان اشعار میں وادی الرمل اور حریق کا ذکر آیا ہے، جس کی تفصیل بعد میں آئے گی۔

اس وادی عُقیق سے جان بچا کر اور اپنے سامان کو محفوظ رکھنا سفر کی بڑی کامیابی تھی، اس کے بعد دوراء سے گزر ہوا، یہاں نہ کوئی کنواں، نہ چشمہ اور نہ زندگی کے کچھ آثار ہیں، معلوم نہیں دو تین بدوؤں کے خیمے کیونکر یہاں ہیں، مگر اس جگہ کی شہرت ایک ضرب المثل کی وجہ سے کہ لا رجال إلا رجال الحوراء ولا جَمَلَ إلا جَمَلَ الدوراء" یعنی مرد تو وہ ہے جو حوراء کی وادی پار کرلے، (یعنی وہاں کے ڈاکوؤں سے جان بچا کر نکل آئے) اور اونٹ وہ ہے جو دوراء کی گھاٹیاں پار کرلے۔ ممکن ہے پہلے زمانہ میں کوئی سخت گھاٹی رہی ہوگی مگر اب تو راستہ کوئی خاص دشوار گزار نہیں دیکھا۔ رہا حوراء کے ڈاکو قسم کے بدوؤں کے متعلق بھی یہ کہنا کہ یہ سب سے زیادہ خطرناک ہیں، ایک طرح کا مبالغہ ہی ہے کیونکہ اس سے زیادہ اور کہیں زیادہ سخت علاقہ الجُزیعَ کے لوگ اور ان میں بھی جو وادی سیدنا خالد کے بدو ہیں، چوری، دھوکہ بازی، ڈاکہ زنی، کون سی برائی ہے جو ان میں نہیں ہے، اللہ اپنی

پناہ میں رکھے۔

بہرحال دوراؔو سے تیزی کے ساتھ نکل گئے اور نبط میں آکر دم لیا بعض لوگ اس کو ط کے بجائے ث سے نبث تلفظ کرتے ہیں، حالانکہ یہ غلط ہے۔ نبط عربی کا لفظ ہے، جس کے معنی ہیں' زمین سے پانی اُبلنا' اس مقام کا بعض دوسرے ناموں سے بھی لوگوں نے حوالہ دیا ہے۔ ناصرالدین کے سفرنامہ میں اس کو العرجاء کہا ہے، العبدری نے مغارہ جس مقام کو کہا ہے وہ یہی ہے، تعددِ اسمار کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی، بہرحال اس کا ذکر شعرا نے اور سفرنامہ نویسوں نے بھی کیا ہے کہ یہ حوراء، دوراؔو کے بعد کی منزل ہے۔

وادی النار — الخضیرۃ:

دن کی آٹھ گھڑیاں گزر چکیں اور دھوپ کی سختی کم ہونے لگی تو یہاں سے کوچ کیا، دو متوازی پہاڑی سلسلہ کے درمیان کا راستہ کشادہ تھا مگر ریت اور بالو سے بھرا تھا، اونٹ کے قدم دھنس جاتے اور وہ ذرا زور دے کر اپنے پیر نکالتا، اس لیے مختصر راستہ دیر میں طے ہو رہا تھا، راستہ میں ایک وادی سے گزر ہوا، اس کو وادی النار کہتے ہیں کیونکہ دھوپ سے یہاں کی ریت رات رات بھر گرم رہتی ہے، لیکن بعض حجاج نے اس کو وادی نور لکھا ہے کیونکہ یہاں سے مدینہ منورہ کے انوار نظر آتے ہیں اور حجاز کی مشکبار ہوائیں چلتی ہیں۔ یہاں کا ایک جھونکا جو مدینہ منورہ کی طرف سے آتا ہے وہ راستہ بھر کی کدورت بھلا دیتا ہے۔ جسم کی تھکن، گرم ریت کی تپش، پانی کی قلت اور راستے کی سختی سب برداشت کرنے کے بعد ایک جھونکا جو رحمۃ للعالمین کے شہر کا مل جائے تو سودا سستا ہے۔

بہرحال اس وادی کو وادی النار کہنا شقاوت کی علامت ہے۔ یہ وادئ نور ہے، اب رہا گرمی اور لٹیروں کا خوف اور ینبع تک پانی کا نہ ملنا، اور جن کا وقت آگیا ہے ان کا اس گرمی کے بہانے مرجانا قضاو قدر کی بات ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس کے عوض میں کیا دولت مل رہی ہے وہ نعمت جو ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی۔

بہر حال یہ راستہ بھی کٹا اور ہم لوگ خُضَیرا نامی وادی میں پہنچے یہاں جس جگہ پڑاؤ ڈالا وہاں پر کوئی کنواں نہ تھا اور دن کے دو پہر گزر چکے تھے۔ یہ وہ جگہ ہے جس کے بارے میں شاعر نے کہا ہے:

انظر الی الخضراء واغنم بسطها
تلق رباها نزهة للرائی

اس سرسبز وادی کو دیکھو اور اس کی سطح زمین پر فرش بچھا لو اس کے ٹیلوں کا حسین منظر پاؤ گے۔

ینبع:

خضراء سے دن چڑھے ہمارے قافلے نے کوچ کیا، راستہ بدستور ریت اور بالو سے بھرا تھا، عشاء کے بعد ایک مصری خاتون کو دردِ زِہ شروع ہوا، وہ ایک پہاڑ کی آڑ میں چلی گئی، جس خچر پر وہ سوار تھی وہ اس کے سرہانے کھڑا رہا، اور وہیں اس کے بطن سے ایک نئی روح وجود میں آئی، خود ہی دایہ کا کام کیا، اس کے گٹھر میں سب کچھ تھا جس کی ایسے موقع پر ضرورت ہو سکتی ہے۔ اس نے نومولود کی زیتون کے تیل سے مالش کی اور ایک کپڑے میں لپیٹا اور جتنی دیر میں ہم لوگ عشاء کی نماز سے فارغ ہوں وہ قافلہ کے ساتھ چلنے کے لیے اپنی سواری پر بیٹھ گئی۔ لوگوں نے کہا کہ مصری عورتیں ملوخیہ اور بامیہ (بھنڈی) بہت کھاتی ہیں جس سے جسم میں رطوبت رہتی ہے اور معدہ یا رحم میں سختی نہیں ہوتی۔ چنانچہ بعض مصری عورتیں بسا اوقات اپنے شوہروں سے اگر چھپانا چاہیں تو بچہ کی پیدائش کو چھپا لیتی ہیں۔ اسی رات کو آسمان کے تاریک اور افق سیاہ میں ایک روشنی کی لکیر دیکھی، ہر شخص کو یقین تھا کہ یہ بجلی کی چمک ہے لیکن کسی بادل کا نام و نشان نہ تھا۔ جب صبح ہوئی تو قافلہ کے بعض صالحین اور راہل ادراک بزرگوں نے کہا کہ انھوں نے وہ روشنی مشرق و مغرب میں پھیلی ہوئی دیکھی پھر دوسری رات کو یہ روشنی نظر آئی اور اتنی دیر تک قائم رہی کہ کسی کو شبہ نہیں رہا کہ یہ مدینہ منورہ کے انوار ہیں۔ اس کے

دیکھنے والے قافلہ کے تمام ساتھی، مرد، عورتیں، اونٹ بان، اور نوخیز لڑکے بھی تھے اور جیسے ہی روشنی نمودار ہوئی سبھوں نے زور زور سے درود شریف پڑھنا شروع کیا۔ درود کی ان آواز سے وادی گونج اٹھی۔ ابو سالم اور ان کے شیخ ابو بکر السجنانی نے اس کا انکار کیا ہے، اور لکھا ہے کہ دور افق پر بجلی چمکی ہوگی۔ مگر حق بات جس میں ہمیں ذرہ برابر شبہ نہیں ہے وہ یہ ہے کہ یہ بجلی کی چمک نہیں تھی۔ میں نے ہزاروں بار بجلی کی چمک دیکھی ہے، بادل بھی دیکھے ہیں، بجلی کی کڑک بھی سُنی ہے مگر یہ کوئی اور ہی شے تھی۔ یہ نور تھا نور، میرے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے جوارِ پاک کا نور، ہم نے اس مقام پر یہ نور واپسی کے وقت بھی دیکھا تھا اور سب کو دکھایا بھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نور کی ایک چادر پھیل گئی ہے اور روشنی کے بڑے بڑے کھمبے راستہ دکھا رہے ہیں۔ کم از کم میرا اندازہ نہیں ہے کہ یہ بجلی کی چمک تھی جو خاص وقت پر خاص وقت تک کے لیے اور یکساں دیر تک روشنی دیتی رہے۔ مگر کچھ لوگ جو اپنے آپ کو محقق اور حقیقت پسند کہتے ہیں ان کو اس کا یقین نہیں ہے چنانچہ العبدری نے لکھا ہے کہ بعض مسافروں کو وہم ہوتا ہے کہ یہاں سے "انوار مدینہ" دکھائی دیتے ہیں۔

الخضیرا سے ینبع کی بندرگاہ تک راستے میں سات گھاٹیاں پڑتی ہیں، جس کو الوعرات السبع یا سبع عقبات بھی کہتے ہیں۔ یہ گھاٹیاں ریت کے تودوں کی ہیں جن کو پار کرنا بہت آسان ہے۔ کوئی پہاڑی چٹان نہیں ہے۔

Accession Number
121741
Date 27.10.87

لطیفہ:

اس سفر میں مشارقہ (مغاربہ کے وزن پر۔ اہل حجاز ویمن کو کہا جاتا ہے) اکثر قہوہ سے تواضع کرتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے پیالوں میں ایک کڑوی کسیلی گرم پانی کے بنے ہوئے سیال مادہ کے چند قطرے پیالیوں میں پیش کرتے ہیں یہ چیز ہم اہلِ مغرب کو کبھی پسند نہیں آئی۔ البتہ جو لوگ کئی سفر کر چکے ہیں اور حجازی بدوؤں کی معاشرت سے واقف ہیں وہ کسی طرح حلق سے اتار لیتے ہیں اور بعض لوگوں کو اس میں مزا ملتا ہے، مگر جس رات ہم لوگ طویل راستہ طے کر کے ینبع پہنچے تو بہت تھکے ہوئے

نڈھال اور کسل مند تھے اور پیٹ میں گرانی بھی تھی۔ اہل فاس کے بعض دوستوں نے قہوہ کا فنجان پیش کیا اور میری رعایت کرتے ہوئے اس میں تھوڑی شکر ملا دی۔ شب کی آخری ساعتیں تھیں۔ پیٹ کی تکلیف بھی تھی، میں نے بسم اللہ کر کے پی لیا، اس قہوہ نے اس قدر جلد فائدہ پہنچایا جیسے پیٹ کی گرانی کبھی تھی ہی نہیں، اور طبیعت میں چستی آگئی، میں نے فی البدیہہ چند شعر کہہ ڈالے:

شربنا فنجان (؟) قھوۃ　　بسکر مزجوۃ

فصحّ انما لتنفی　　من وخم عھدوۃ

ہم نے قہوہ کا ایک فنجان پیا جس میں شکر ملا دی گئی تھی۔ اس سے ثابت ہوا کہ پیٹ کی گرانی جو تھی کالعدم ہو گئی۔

جب کوئی حجاج کا قافلہ آتا ہے تو بستی والے آ کر اس کو گھیر لیتے ہیں اور زیادہ تر سبزیاں، انڈے، فول، گیہوں بیچنے والے ہوتے ہیں۔ یہاں سے کھانے پینے کی چیزیں اور غلّہ مدینہ منورہ جایا کرتا ہے کیونکہ مصر سے جو جہاز غلّہ اور پھل لے کر آتے ہیں وہ اسی بندرگاہ میں لنگر انداز ہوتے ہیں۔ جہاز جب یہاں سے لنگر اٹھاتے ہیں تو جدہ کی بندرگاہ پر ٹھہرتے ہیں اور وہاں سے خشکی کے راستے مکہ مکرمہ غلّہ بھی جاتا ہے۔ اس علاقہ کے سب سے اونچے پہاڑ کا نام "رَضْوَیٰ" ہے جس کے اوپر سے ینبوع نظر آتا ہے۔ ابو سالم کو اس بیان میں شک ہے، "الروض المعطار فی اخبار الاقطار" میں لکھا ہے کہ "رضویٰ" کوہستان تہامہ کا ایک پہاڑ ہے، جو ینبع سے ایک دن کی مسافت پر ہے۔ مدینہ منورہ سے تبوک کی طرف جانے میں دائیں جانب سات منزلوں کے بعد یہ پہاڑ پڑتا ہے۔ سمندر سے اس کی مسافت دو راتوں کی ہے اور خیبر سے کسی قدر قریب ہے، یہ بہت بلند اور وسیع رقبہ کو گھیرے ہوئے ہے اور اس میں بڑے غار ہیں اور وادیاں ہیں اور اس کے اوپر ایک چشمہ ہے جس کی وجہ سے جانوروں کے لیے چارہ مل جاتا ہے۔ غالی شیعوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت محمد بن الحنفیہ کا انتقال نہیں ہوا بلکہ وہ اسی پہاڑ پر زندہ موجود ہیں۔ شیخ حمیری نے کہا ہے:

وماذاق ابن خولة طعم موت ۔۔۔۔ وماوارث له أرض عظاما

لقد أمسى بمورق شعب رضوى ۔۔۔۔ تراجعه الملائكة السلاما

وإن له مرزقا من طعام ۔۔۔۔ وأشربة يعد بها الطعام

"ابن خولہ (یعنی حضرت محمد بن الحنفیہ) نے موت کا مزہ نہیں چکھا، اور نہ ان کی ہڈیوں کو زمین نے چھپایا۔ بلکہ وہ رَضْوَیٰ کے ایک ہموار میدان میں چلے گئے، جہاں فرشتے ان کی خدمت میں سلامی پیش کیا کرتے ہیں اور ان کا رزق مقرر آجاتا ہے، اور پینے کے لیے انواع واقسام کے مشروبات میسر ہیں۔"

صاحب قاموس نے اس کی تشریح بہت تفصیل سے کی ہے اور کہا ہے کہ رَضْوَیٰ کا وزن سَکْرَیٰ ہے جو مدینہ منورہ کا ایک پہاڑ ہے جس کے بارے میں شاعر نے کہا ہے:

کنت أظن ان جبال رضوی ۔۔۔۔ تزول وان ذلك لایزول

"میں سمجھتا تھا کہ رضوی کے پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ٹل جائیں گے۔ حالاں کہ اگر ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے جب بھی اپنی جگہ سے نہ ٹلیں۔"

ینبع کے علاقہ ہی میں "عُشَیرہ" ہے جہاں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد پاک میں ایک غزوہ ہوا تھا، اس بستی کی مسجد کا نام مسجد عُشَیرہ ہے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک آئے ہیں اور آپ نے نماز پڑھی ہے۔ مسجد عُشَیرہ ینبع میں اب بھی موجود ہے [مرتب سفرنامہ حمد الجاسر نے اس بیان پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے سوالیہ نشان (؟) لگا دیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کو غلط سمجھتے ہیں] یہاں ایک پانی کا چشمہ جاری ہے، مگر وہ اس نام سے مشہور نہیں ہے۔ قافلہ کے رُکنے کی جگہ کے سامنے ایک ٹیلہ ہے اس کو ابو الحسن نفاثی کا ٹیلہ کہا جاتا ہے، اس ٹیلہ پر جو بستی ہے اس میں ابو علی الحسن الثلث کی قبر ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ یہاں کے مقابر کی زیارت کروں، اور خاص طور پر سادات (صوفیہ) کی قبروں پر جاؤں مگر اس وقت قافلے والوں اور مقامی بدوؤں میں جھڑپ شروع ہو گئی اس لیے ڈر کی وجہ سے کہیں نہ جا سکے اور اپنی جگہ پر

بیٹھے بیٹھے نیت سے سب کی زیارت کرلی۔

الروض المعطار میں ہے کہ مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ کے راستے میں نو منزلوں پر ینبوع یا ینبع کی بستی ملتی ہے، اور یہی وہ وادی ہے جہاں چالیس منزلوں کے حدود میں حضرت سیدنا علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ، کھو گئے تھے۔

ابودُلف الخزرجی الینبعی کے یہ اشعار ثعالبی نے یتیمۃ الدھر میں نقل کیے ہیں:

دارالسّلام ھنیئاً بدعوۃ ابن الرسول

جاء النھار و ولّی ظلام تلک الزحول

(دارالسّلام مبارک ہو۔ فرزندِ رسول کی دعوت۔ وہ دن کو آئے اور رات کی تاریکیاں کافور ہوگئیں)۔

واضح رہے کہ یہ پورا علاقہ ینبع کا علاقہ کہلاتا ہے، اور جو بستی اس نام سے موسوم ہے وہ بندرگاہ ینبع کی بستی ہے جس کا نقشہ العبدری نے ان الفاظ میں کھینچا ہے:

"... اور ینبع حجاز کا ایک مشہور مقام ہے، ایک گاؤں ہے مختصر سی آبادی کا، یہ گاؤں چھوٹی بڑی چند پہاڑیوں کے دامن پر آباد ہے۔ آبادی کم اور ویرانی زیادہ ہے۔ مغربی علاقہ ذرا وسیع ہے جہاں قافلے آکر رکتے ہیں، زیادہ تر مٹی نمک کی تہہ سے ڈھکی ہے، اس لیے زراعت کم ہے، مگر کچھ فاصلہ پر شیریں پانی کا چشمہ ہے اور اس کی وجہ سے کھجور کے باغات بھی ہیں، یہاں کا حاکم خودمختار اور سخت گیر ہے۔ ملیانہ کا حکمراں بد دماغ زیادہ ہے، مگر ان دونوں نے مل کر امن و امان قائم رکھا ہے۔ اگر ایسے ہی حاکم ہر جگہ ہوں تو لٹیروں سے امن مل جائے اور کہیں بھی دو مینڈھے سینگ نہ لڑائیں۔"

اقتصادی بدحالی کے بارے میں لکھتا ہے:

ترتیب و انتخاب: مولانا شاہ ہلال احمد قادری
(خانقاہ مجیبی پھلواری شریف، پٹنہ)

اَدب کے گنجہائے گرانمایہ

ذیل میں، حضرت مخدوم شاہ نعمت اللہ قادری پھلواروی (۱۱۶۰ھ / ۱۲۴۷ھ) صاحبزادہ وجانشین حضرت تاج العارفین شاہ مجیب اللہ قادری بانی خانقاہ مجیبی قدس سرہما کے چند ملفوظ "تذکرۃ الکرام" مؤلفہ مولانا شاہ ابوالحیات پھلواروی اور "ملفوظات مخدوم شاہ نعمت اللہ" مرتبہ شیخ طالب علی پھلواروی سے منتخب کرکے پیش کیے جارہے ہیں۔ (ہلال احمد قادری)

تقویٰ:

شریعت میں ہر چیز کی قضا ہے لیکن تقویٰ کی کوئی قضا نہیں، جس کام سے تقویٰ رخصت ہوا وہ تمام کام ضائع گیا، یہ ایسا کپڑا ہے جو پیوند قبول نہیں کرتا، ہر وقت اس کا اہتمام رکھنا چاہیے کہ تقویٰ ہاتھ سے نہ جائے۔

کشف:

اہل مکاشفہ چند قسم کے ہوتے ہیں، ایک صاحب سرِ خفی وجلی ہیں جن کے مکاشفے میں کذب کا کوئی احتمال نہیں ہوتا ہے گویا اس ولی کے حق میں اس کا مکاشفہ وحی کا حکم رکھتا ہے، صاحب سر کے مکاشفہ میں شیطان اور نفس کو اثر اندازی کا اختیار نہیں ہوتا، یہ صاحب السر اولیاء ہر زمانہ میں کمتر و نایاب ہوتے ہیں، ان کا وجود کبریت احمر ہے، مرتبۂ صدق میں ان کا

"یہاں کے لوگ مرنے کے لیے جیتے ہیں، یہ آزاد لوگ ہیں مگر آزادی اس بات کی ان کو حاصل ہے کہ بھوکے رہیں، ان کی حرّیت یہ ہے کہ کس مپرسی اور بدحالی میں زندگی گزاریں، ان کے سروں پر سایہ ہے مگر دہشت اور خوف کا، ان کو پناہ گاہ حاصل ہے جہاں سوائے تباہی و بربادی کے کوئی بھی ان پر حملہ آور نہیں ہو سکتا۔

مگر قافلے جو یہاں سے گزرتے ہیں ان کو یہاں آکر ایک طرح کا دلی سکون حاصل ہو جاتا ہے، دل شوق سے مچلنے لگتا ہے، چال میں لرزشِ مستانہ آجاتی ہے کیونکہ یہ علاقہ دیارِ حبیبؐ کا ہم جوار ہے، یہاں کی فضا میں محبّت کی دل آویزی ہے، در و دیوار ایسے مانوس لگتے ہیں جیسے اب بول پڑیں گے، احساسؔ وجدان کی بات، ادراک و شعور کی حکایت کیسے بیان کی جائے، عقل پر محبّت کی عقال (کوئی چیز باندھنے کی رسّی) بندھی ہے، وارفتگیٔ شوق کی فوجیں ہر طرف سے حملہ آور ہوتی ہیں، ہمیں تو یہاں کے پہاڑ بھی پیارے لگتے ہیں، مٹی سوندھی ہے، خاک اور دھول اڑتی ہے تو جی چاہتا ہے کہ بچوں کی طرح ان سے کھیلیں، چہرے پر ملیں اور سروں پر ڈالیں۔"

العبدری نے یہاں کی تاریخی حیثیت کے بارے میں لکھا ہے کہ ینبع پر مصری گورنر کی خاص نظر رہتی ہے، ہمیشہ تحفے تحائف دیتا رہتا ہے تاکہ یہ لوگ حاجیوں کو تنگ نہ کریں، ینبع کے باہر پہاڑ کے پیچھے کہا جاتا ہے کہ ایک بہت مضبوط بنی ہوئی مسجد ہے جس کو مسجد سیدنا علیؓ بن ابی طالب کہا جاتا ہے، اور حضرت عثمان غنیؓ کے زمانہ میں جب وہ مدینہ منورہ چھوڑ کر نکل گئے تھے (؟)، اسی زمانہ میں یہ مسجد بنی ہے، یہ بستی سادات علوی کی آبادی پر مشتمل تھی اور یہیں سے سیدنا حسن اور سیدنا علی نکل کر مغرب میں جا کر آباد ہوئے تھے اور وہاں سلجماسہ میں ان کی قبریں ہیں، اللہ ان سے اور ان کے اسلاف صالحین سے مستفید فرمائے۔ اس شہر میں سال بھر ایک بڑا تیر پھل ہوتا ہے جس کو "ذو الاَشع" کہا جاتا ہے، گرمی سردی ہر زمانہ میں ملتا ہے، عوام اس کو "جنجب" کہتے ہیں۔

قول وحی کی ایک قسم ہے۔[1]

دوسرے وہ ہیں جو نفس و شیطان کے مکر سے مطمئن نہیں اور ان کا مکاشفہ زیادہ قابل اعتماد نہیں ہے، یہیں سے حضرت مخدوم الملک (مخدوم شرف الدین احمد منیری قدس سرہٗ) کا قول ظاہر ہے "بر کشفِ خود کفش باید زد و اعتماد نہ باید کرد" سالک کو کبھی کشف کا خیال نہیں کرنا چاہیے کیوں کہ یہ راہِ مقصود سے پھیر دینے والی چیز ہے اور مردوں کا کام دوسرا ہے۔

کشف ارواح:

کشف ارواح کے متعلق کسی نے عرض کیا کہ مشق ہو تو یہ اچھی چیز ہے۔ فرمایا، اچھی کیا ہے یہ تو دنیا ہے کوئی شخص مال و دولت کے ذریعہ ریاست حاصل کرتا ہے تو کوئی اعمال و وظائف کے ذریعہ، اور کشف کے ذریعہ خود کو ممتاز بناتا ہے، خواہ اشغال سے کشف کی صلاحیت حاصل ہو خواہ استخارہ سے۔ کشفِ ارواح اور عالم قبر کو فقر سے کیا نسبت ؟ جادوگر بھی اپنی خباثت سے بہت سا حال دریافت کر لیتے ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ تم اعمال علوی کا سہارا لیتے ہو اور وہ سفلی اعمال کے ذریعہ یہ چیزیں حاصل کرتے ہیں۔ لیکن فقر تو دوسری ہی چیز ہے، تم نے سُنا نہیں کہ حضرت ابوبکر شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا،

"بہشت کے طالب سے کہہ دو کہ ہماری مجلس میں نہ آوے اور نہ بیٹھے،

یہاں خدا سے کام ہے دنیا اور عقبیٰ کی یہاں کوئی گنجائش نہیں ہے ؎

ملّتِ عشق از ہمہ ملّت جداست عاشقاں را مذہب و ملّت خداست

حصولِ مقصود کے بعد بھی طاعات و عبادات پر دوام شکر گزاری کا تقاضا ہے:

نفس انسان کو ہر طرح سے دھوکہ اور فریب میں ڈال کر برباد کر دیتا ہے، اس لیے انسان

---

[1] صاحب ملفوظات علیہ الرحمۃ کا مقصد یہ ہے کہ اولیائے صادقین کے مکاشفات ان کی ذات کے لیے وحی کی ایک قسم ہے، دوسرے ان کے ماننے یا نہ ماننے پر مجبور نہیں ہیں، اور انبیائے کرام پر جو احکام بذریعہ وحی نازل ہوتے ہیں ان کی نوعیت جداگانہ ہے۔ لفظ 'وحی' کے معنیٰ 'اشارہ' کے بھی ہیں، فَاَوْحٰۤى اِلَیْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِیًّا (مریم ۱۱) "ان کو اشارے سے کہا کہ صبح و شام خدا کا ذکر کرتے رہو"۔ (ع ع ت)

کو چاہیے کہ ہمیشہ نفس کے فریب و مکر و حیلہ سے ہشیار رہے، اول تو ہماری عبادت کسی درجہ میں قابلِ قبول نہیں، اس لیے کہ میں اخلاصِ عمل کا صحیح جذبہ اپنے میں محسوس نہیں کرتا، دوسری بات یہ ہے کہ انسان کی تمام عبادات یکساں مقبول نہیں ہوتیں، اس کی قبولیت اللہ کے رحم و کرم پر موقوف ہے معلوم نہیں کس وقت کی عبادت اللہ کو پسند آوے اس کا علم نہیں اور یہ بھی معلوم نہیں کہ اتنے دنوں کی عبادت میں کون اور کس وقت کی عبادت مقبول ہوئی یا نہیں ؟ اگر کوئی عبادت بھی مقبول نہ ہوئی تو بقیہ عمر کی کل ساعت قبولیت کی تمنا اور آرزو میں کیوں نہ صرف دی جائے، اللہ عز و جل سے امید رکھنے والا اس کے رحم و کرم سے محروم نہیں ہوتا ہے، وہ بندہ مقبول بندہ ہے جو اپنے آقا کی اطاعت و فرمانبرداری میں روز و شب ایک پاؤں پر کھڑا رہے۔ معین اوقات پر کام بجالا کر بقیہ اوقات میں غافل پڑا رہنا ناشکر گزاری ہے۔

بالفرض اگر تم لوگوں کے حسن ظن کے مطابق مجھ کو[1] ثمرات و فوائد اور قبولیت عبادت کی دولت نصیب ہو چکی ہے تو یہ کتنی بڑی ناشکری اور کفران نعمت ہے کہ جس ذریعے سے ایسی دولت ہاتھ آگئی ہو اور خدائی نعمتوں کی کوئی حد نہ ہو کہ آئندہ اس ذریعہ سے بیش از بیش ملنے کی امید ہو، اُس ذریعہ کو چھوڑ دیا جائے، پیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ سیرابی کے جو ذرائع دستیاب ہو چکے ہیں اس سے سیرابی حاصل کی جائے جب تک پیاس نہ بجھے، مگر یہ وہ پیاس ہے کہ اس کے دن رات بڑھتے رہنے اور ذریعۂ سیرابی کو عمل میں لاتے رہنے کے لیے تیار رہنا چاہیے "ضاعف اللہ بہ کل زمان عطشی" میں تم لوگوں کی تشفی ایک حکایت سے کر دیتا ہوں :

"کسی گاؤں میں ایک فاقہ مست پریشان حال رہتا تھا، بظاہر اس کے کل ذرائع معیشت مسدود تھے، حیران و پریشان بہ طلب روزگار در در کی خاک چھانتا پھرتا تھا مگر کسی طرح عُقدہ کشائی نہ ہوتی بالآخر اس نے سوچا کہ

---

[1] یہ ارشاد اُن مخلصین کے جواب میں ہے جو حضرت کے بڑھاپے، ضعف اور حالت بیماری میں اذکار و اوراد کثرتِ نوافل اور اہتمام جماعت اور دیگر معمولات میں پابندی کو صحت کے لیے مضر سمجھتے اور اس میں تخفیف چاہتے تھے۔

دریا کے کنارے ریت چھانا کروں، ممکن ہے اُن سے گرے پڑے پیسے دستیاب ہوسکیں، ایسا ہی کرنا شروع کیا، خدا کی شان اس طرح اس کو ریت میں گرے پڑے پیسے دستیاب ہونے لگے، شام کو اُن پیسوں سے آٹا لاتا اور جنگلوں سے لکڑیاں چُن کر گھر لے آتا اور بیوی کے حوالہ کر دیتا، روٹیاں پک جاتیں بال بچے مل کر کھا لیتے، خدا کا شکر بجالا کر سو جاتا صبح کو پھر دریا کے کنارے چلا جاتا اور ریت چھانتا، عرصہ کے بعد اس ملک کا بادشاہ سیر و شکار کی غرض سے اپنے لشکر کے ساتھ گزرا، مگر وہ اپنے کام میں مشغول تھا، اس کو فوج کی نقل و حرکت تک کی خبر نہ ہوئی، بادشاہ کی اطلاع کیا ہوتی، بادشاہ جب واپس ہوا تو اس کو اسی حال میں دیکھا، وزیر سے کہا یہ کون شخص ہے اور خاک بیزی سے اس کا کیا مقصد ہے، دریافت کرو، وزیر نے حسب الحکم اس سے ماجرا دریافت کیا، اس نے حقیقت حال کہہ سُنائی، بادشاہ نے عقب سے آکر اس کی چھلنی میں ایک اشرفی گرادی مگر اس کو خبر نہ ہوئی، چھانتے چھانتے وہ اشرفی نمایاں ہوئی، اس نے کمر میں رکھ لیا، پھر اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ کچھ دیر بعد دوسری اشرفی بادشاہ نے گرادی، اسی طرح متعدد بار اشرفیاں اس کی چھلنی میں گرتی رہیں مگر وہ خاک بیزی سے باز نہ آیا، بادشاہ کو اس کی بے انتہا طمع اور لالچ پر غصہ آگیا بلا کر اس کی تنبیہ کی اور کہا کہ میں نے اِس قدر تجھ کو رقم دی جو تیرے لیے ایک مُدّت کے لیے کافی ہے مگر تو اپنی خسیس حرکت سے کیوں باز نہیں آتا؟ اس نے دست بستہ عرض کیا کہ اب تو میں تا عمر اس کو چھوڑ نہیں سکتا چاہے اشرفیاں پھر ملیں یا نہ ملیں کیونکہ یہی وہ ذریعہ ہے جس کی وجہ سے مجھے معتدبہ اشرفیاں حاصل ہوئیں، بادشاہ خاموش ہوگیا اور اس کو رہا کر دیا۔"

یہی حال طاعات و عبادات کا ہے، عابد جس عبادت کے ذریعہ فائز ہوا اس کی پابندی

اس پر اور زیادہ عاید ہو جاتی ہے، ان عبادات و طاعات کو بقدر وسع تا زندگی ترک نہ کرنا چاہیے یہاں تک کہ وہ عبادت کرتے کرتے مرجائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاعمر ریاضت نہ چھوڑی، تمام شب اس طرح نماز ادا کرتے تھے کہ پائے مبارک ورم کرجایا کرتے اور اصحاب کے کہنے پر افلا اکون عبداً شکوراً فرماتے تھے۔

تکلیف مالایُطاق کی کیا حد ہے؟

فرمایا: میرے خیال میں وسعت نفس کی حد اسی قدر ہے کہ جس حالت میں ہو شرعی تکلیف کم ہو یا زیادہ بہ آسانی برداشت کر سکے مثلاً کوئی شخص اپنے شدت مرض میں آئندہ کی حفاظت کی نظر سے بیٹھ کر نماز پڑھتا ہے اور کھڑے ہو کر بھی نماز ادا کرنے میں اس کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی تو ایسے شخص کے لیے کھڑے ہو کر نماز ادا کرنی ہرگز مالایُطاق تکلیف کے حکم میں نہ ہوگی، اس کو چاہیے کہ کھڑے ہو کر نماز ادا کرے یا ایک رکعت کھڑے ہو کر ادا کرسکتا ہے اور بقیہ رکعتیں ادا کرنے میں احتمال ہے کہ کھڑا نہ رہ سکے گا تو باستثناء دیگر رکعتوں کے ایک رکعت کھڑے ہی ہو کر ادا کرنی چاہیے، اور بقیہ بیٹھ کر کیوں کہ انسان اپنے نفس کے مکر و حیلہ سے ہرگز خبردار نہیں، ایسا بہت ہوتا ہے کہ نفس امّارہ بیماری کے حیلہ سے کماینبغی عبادت سے باز رکھتا ہے اور خدا کی یاد سے غافل کر دیتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض وفات میں جب کہ آپ کے تپ اور درد کی شدّت اور ضعف و ناتوانی اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ بلا استعانت اپنی جگہ سے نقل و حرکت نہ کر سکتے تھے، اس حالت میں بہ نظر تشفی اصحاب مالایطاق تکلیف برداشت کر کے حضرت سیدنا مرتضیٰ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کے سہارے مسجد تک تشریف لے گئے اور باوجود اس استعانت کے پائے مبارک زمین سے گھستا جاتا تھا، تو گیا اس قدر تکلیف و اذیت آپ کی وسعت و طاقت بشری سے خارج تھی یا اس کا اعتبار نہیں۔؟

ترتیب: شفیق الرحمٰن ندوی

عالمِ اسلام کی
علمی و ثقافتی سرگرمیاں

گذشتہ دنوں قاہرہ میں مسلم اسکاوٹس تنظیم کی چوتھی ریلی ہوئی، عرب ممالک میں اسکاوٹ تنظیم کے قیام پر ۵۰ برس گزرنے کے جشن کے طور پر یہ تقریب منائی گئی، ریلی کا انتظام قاہرہ اسٹیڈیم میں کیا گیا جس کا افتتاح شیخ الازہر کی نیابت میں وکیل الازہر نے کیا، اس موقع پر مصر کے وزیر تعلیم ڈاکٹر فتحی سرور، کھیل کود اور نوجوانوں سے متعلق دیگر امور کی مجلس اعلیٰ کے چیرمین ڈاکٹر عبدالاحد جمال الدین کے علاوہ رابطہ عالم اسلامی کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف بھی موجود تھے۔ انھوں نے تقریر کرتے ہوئے اسکاوٹ تنظیم کے کام اور اس کی سرگرمیوں کے بارے میں پسندیدگی کا اظہار کیا، انھوں نے کہا کہ دنیا میں ہر جگہ اس تنظیم کی اہمیت و افادیت تسلیم کی جاتی ہے، کیونکہ اس کے ذریعہ اسکول اور مدرسہ سے باہر نوجوانوں کی ذہنی اور فکری تربیت کی جاتی ہے ان کے اندر خود اعتمادی پیدا کی جاتی ہے، دوسروں کی مدد کرنے اور ان کے کام آنے کا جذبہ اُبھارا جاتا ہے، انھوں نے کہا کہ ایسے دور میں جب کہ مادہ پرستی کا دور دورہ ہے، ہر کام مادی پیمانے سے ناپا جاتا ہے اس تنظیم کی افادیت مزید بڑھ گئی ہے، یہ تنظیم اسلامی اتحاد کے فروغ کے کاز کو بہتر طور انجام دے سکتی ہے، نیز اسلامی معاشرہ کے مقاصد کی تکمیل میں مثبت کردار ادا کرسکتی ہے، ان اسباب کی بناء پر ہم نہ صرف اس کی ضرورت اور افادیت کے قائل ہیں بلکہ رابطہ عالم اسلامی کے ایک ذمہ دار کی حیثیت سے اس کے ساتھ ہر ممکن تعاون کے لیے بھی تیار ہیں۔

اسکاوٹس تنظیم دراصل ایک ورزشی، معاشرتی اور تربیتی رضاکار تنظیم ہے، سیاسی معاملات

سے الگ تھلگ رہنا اس کے بنیادی اصول میں داخل ہے، لارڈ بادن پاول نامی ایک انگریز فوجی افسر نے ۱۹۰۸ء میں اولین اسکاوٹ تنظیم قائم کی تھی، رفتہ رفتہ دوسرے ممالک میں بھی اس کا قیام عمل میں آنے لگا، عرب ممالک میں اس رضا کار تنظیم کا آغاز ۱۹۱۲ء میں ہوا لیکن پہلی جنگ عظیم کے بعد اس کی فعالیت اور سرگرمی میں اضافہ ہوا، یہ اپنی روح اور اسپرٹ کے لحاظ سے ایک خالص سیکولر تنظیم ہے، اس میں ذات پات، وطنیت اور مذہبی وابستگی سے بلند ہو کر انسانیت کی خدمت کا جذبہ اُبھارا جاتا ہے، عرب ممالک میں بالخصوص جہاں دین شجر ممنوعہ نہیں ہے یہ تنظیم مشرف بہ اسلام کرلی گئی ہے یعنی اس تنظیم سے وابستہ نوجوانوں میں رضاء الٰہی اور حصول ثواب کی نیت سے خدمت خلق کا جذبہ پیدا کیا جاتا ہے اور اخلاص و احتساب کا شعور بیدار کیا جاتا ہے، اس تنظیم کا زیادہ تر پروگرام کھیل کود، ورزش، سفر اور کیمپوں کے اندر رہنے سہنے پر مشتمل ہوتا ہے، اس میں عسرت و تقشف کی زندگی گزارنے اور مشقتوں کا خوگر بنایا جاتا ہے، عمروں کے تفاوت کے اعتبار سے اس کے تین مرحلے یا تین اقسام ہیں، آٹھ سے بارہ برس کے بچے اشبال کہلاتے ہیں، بارہ سے اٹھارہ سال کے کشّافہ اور ۱۸ سال سے زائد کے جوّالہ کہلاتے ہیں، ان کو مختلف گروپوں میں تقسیم کرکے ایک کوچ کے سپرد کردیا جاتا ہے وہ ورزش اور کھیل کود کے ساتھ ساتھ خود اعتمادی، دوسروں کے ساتھ تعاون کرنے اور غیروں کے واسطے ایثار و قربانی کا جذبہ پیدا کرتا ہے، کوچ پوری ہوش مندی کے ساتھ ان کے اخلاق و کردار کی نگرانی کرتا ہے۔

اسکاوٹس تنظیم کے اصول و مقاصد اور طریقۂ کار کی تائید اسلامی تعلیمات سے ہوتی ہے خدمت خلق اور دوسروں کی راحت رسانی کے لیے ایثار و قربانی کی ترغیب سب سے زیادہ اسلام میں ملتی ہے یہی وجہ ہے کہ مسلم ممالک بالخصوص عرب ممالک میں اس تنظیم کی بڑی قدر افزائی ہوتی ہے اس کو مزید موثر اور فعال بنانے کے لیے مسلم اسکاوٹس تنظیموں کی ایک عالمی یونین بنانے کا فیصلہ کیا گیا جس کا صدر دفتر قاہرہ میں ہوگا۔

موسوعۃ الحدیث النبوی :

ہفت روزہ 'البلاغ' کویت کی ایک اطلاع مظہر ہے کہ ظہران کی کنگ فہد یونیورسٹی برائے

پٹرولیم کے پروفیسر صدر علوم اسلامیہ ڈاکٹر عبداللہ قاضی ابن عبدالملک نے روزہ سے متعلق احادیث پر مشتمل احادیث نبویہ کا ایک موسوعہ (انسائیکلوپیڈیا) تیار کیا ہے، اس کی تین جلدیں دار البعوث الاسلامیہ کویت کی طرف سے شائع ہو چکی ہیں ان میں سے پہلی دو جلدوں کا نام الموسوعة الشاملة اور تیسری جلد کا نام الموسوعة المصنفة رکھا ہے، پہلی دونوں جلدیں بڑے سائز کے ۱۰۴ صفحات پر مشتمل ہیں، شروع میں ایک مبسوط مقدمہ ہے۔ مؤلف نے روزہ سے متعلق ہر قسم کی روایات کو جمع کر دیا ہے، ان مصادر کی تعداد جن سے یہ روایتیں جمع کی گئی ہیں ۵۰ ہیں، ان میں صحیح بھی ہیں، حسن بھی اور ضعیف بھی، مسند بھی ہیں اور مرسل بھی۔ اگر ایک ہی حدیث مختلف سندوں سے مروی ہے، یا مختلف الفاظ میں مروی ہے ان سب کو یکجا کر دیا ہے، اس طرح اس موضوع پر تحقیق کرنے والوں کو ساری مرویات یکجا دستیاب ہو جائیں گی، مختلف مصادر میں تلاش کرنے کی زحمت سے بچ جائیں گے، مؤلف نے جہاں سے جو روایت لی ہے، کتاب کے نام، جلد، باب اور صفحہ تک کے حوالہ کا اہتمام کیا ہے، تاکہ اصل مصادر تک رجوع کرنے والوں کو سہولت ہو، تیسری جلد جس کا نام الموسوعة المصنفة رکھا ہے، مقدمہ کے علاوہ ۵۱۴ صفحات پر محیط ہے، ابتداء میں روزہ سے متعلق تمام آیات جمع کر دی ہیں، اس کے باب قائم کر کے اس کے مفہوم اور روح سے ہم آہنگ ایک جامع اور صحیح حدیث درج کی ہے، اس کے بعد ایسی روایتیں لائی گئی ہیں جن میں بعض الفاظ زاید ہیں جس سے حدیث کا پس منظر معلوم ہوتا ہے اور حدیث کا مفہوم متعین کرنے میں مدد ملتی ہے، مشکل الفاظ کی تشریح ہے، بخاری اور مسلم کے علاوہ اگر دوسری کتاب سے وہ روایت لی گئی ہے اور اس کی سند اور متن پر محدثین نے جو کلام کیا ہے، اس کی صراحت بھی آ گئی ہے، جس سے حدیث کا درجہ متعین کرنے میں سہولت ہو گی، البتہ فقہی استنباط سے گریز کیا گیا ہے تاکہ اس پر کسی ایک ہی مسلک کی چھاپ نہ لگ جائے۔

الموسوعة المصنفة میں جو حدیثیں جمع کی گئی ہیں وہ ۵۸ ابواب پر مشتمل ہیں، پہلا باب "وجوب صیام شہر رمضان" (ماہ رمضان کے روزے کی فرضیت) ہے اور آخری باب "الترغیب

فی لیلۃ القدر والاختلاف فی تحدیدھا" یعنی" شب قدر کی تلاش کی ترغیب اور اس کی تعیین میں اختلاف" ہے۔ ۵۸ویں باب کے بعد مزید ایک باب کا اضافہ کیا ہے جو پچاس صفحات پر محیط ہے، اس میں مذکورہ ابواب سے متعلق موقوف روایتیں ہیں۔

معلوم ہوا ہے کہ مؤلف کتاب ڈاکٹر عبدالملک عبداللہ قاضی نے اسی نہج پر زکوٰۃ کی حدیثیں بھی جمع کی ہیں، مؤلف کی یہ محنت وکاوش قابلِ قدر ہے اور وہ حدیث کے طلبہ اور اساتذہ کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے بڑی سہولت فراہم کر دی ہے۔ ضرورت ہے کہ یہ کام مزید آگے بڑھے اور دیگر ابواب کے لیے بھی موسوعات تیار کی جائیں۔

ظہر سے پہلے مارکس کے لیے ـــ اور
ظہر کے بعد اللہ کے لیے:

لندن سے شائع ہونے والے مجلّہ "الغرباء" نے یوگوسلاویہ کے فیڈریشن میں شریک ریاست مقدونیہ کے ایک اخبار کی رپورٹ نقل کی ہے، جس سے یوگوسلاویہ میں آباد مسلمانوں کی دینی وثقافتی سرگرمیوں پر کسی قدر روشنی پڑتی ہے، نیز اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی دینی سرگرمیوں پر بندش لگانے کی پوری کوشش صرف ہو رہی ہے، دوسری طرف مسلمان انتہائی ناگفتہ بہ حالات میں بھی اپنا دینی تشخّص برقرار رکھنے کے لیے ہر ممکن قربانیاں دے رہے ہیں، مقدونیہ کے اخبار کا رویّہ مسلمانوں کے تئیں معاندانہ ہے، چنانچہ اربابِ حکومت (جو سب کے سب کمیونسٹ ہیں) کو مسلمانوں کے خلاف اُبھارنے کی غرض سے سرخی لگائی ہے: "ظہر سے پہلے مارکس کے لیے اور ظہر کے بعد اللہ کے لیے" اس عنوان کے تحت اخبار نے لکھا ہے کہ: "ریاست مقدونیہ کے اندر مسلم نوجوانوں میں ان دنوں اسلامی بیداری کے آثار معمول سے زیادہ نظر آ رہے ہیں، قبل ازیں ایسی بیداری دیکھنے میں نہیں آئی ہے، اس دینی لہر کے نتیجے میں نئی مسجدیں تعمیر ہو رہی ہیں یا پرانی مسجدوں میں ترمیم واصلاح کا کام ہو رہا ہے، چنانچہ حال ہی میں شہر توستیفار کے نواح میں ایک گاؤں کے اندر ایک لاکھ تینتالیس ہزار ڈالر کی خطیر رقم سے ایک نئی مسجد تعمیر ہوئی ہے، گاؤں کے

لوگوں نے آسانی کے ساتھ اتنی بڑی رقم اکٹھا کر لی ہے، اسلامی بیداری کی دوسری علامت یہ ہے کہ مساجد کے اندر قائم دینی مکاتب میں دینی تعلیم کے حصول کے لیے آنے والے مسلم بچوں اور بچیوں کی تعداد روز افزوں ہے، صرف ریاست مقدونیہ میں ایسے بچوں کی تعداد چھ ہزار سے زیادہ ہے، ان بچوں کے سرپرست بھی دینی تعلیمات کو حرز جان بنائے ہوئے ہیں، ملکی قانون کے مطابق صرف اتنی رعایت ہے کہ دینی مکاتب کے استاد مسلمان بچوں اور بچیوں کو ناظرہ قرآن پڑھا سکتا ہے یا حفظ یاد کرا سکتا ہے، قرآنی آیات کی تفہیم و تشریح کی مطلق اجازت نہیں ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قانون کی خلاف ورزی ہو رہی ہے، عام مدرسین کے مقابلہ میں شیوخ (علماء) زیادہ مؤثر ہو رہے ہیں۔ یہ درست ہے کہ عام تعلیمی اوقات میں دینی وعظ اور اسلامی تعلیم کی اجازت نہیں ہے، اس پر سختی سے عمل بھی ہوتا ہے لیکن ظہر سے پہلے یا ظہر کے بعد دو گھنٹے دینی وعظ ہوتا ہے، جس میں مرد، عورتیں اور بوڑھے بچے سب شریک ہوتے ہیں، بچے دوپہر تک اسکولوں میں مارکس کے افکار و نظریات پڑھتے ہیں اور دوپہر کے بعد علماء سے دینی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس دوہرے نظام تعلیم سے بچے ذہنی انتشار کا شکار ہو جائیں گے، مسلم والدین چاہتے ہیں کہ ان کے بچوں کے ذہن میں دنیا اور زندگی کے بارے میں واضح اسلامی تصور موجود ہو، اس میں وہ کامیاب بھی ہیں جب کہ کارل مارکس کے نظریات پڑھانے والے بالکل بے اثر ہو رہے ہیں۔"

ریاست مقدونیہ کے اخبار کی رپورٹ اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہے، کسی تبصرہ یا وضاحت کی ضرورت نہیں، البتہ ہمارے لیے اس میں باعث تسکین یہ ہے کہ یوگوسلاویہ کے مسلمان اپنا اسلامی تشخص برقرار رکھنے کے لیے قربانیاں دے رہے ہیں، اور کمیونزم کے طاغوت کا بڑی پامردی کے ساتھ مقابلہ کر رہے ہیں۔

وینزویلا میں اسلامی مرکز:

وینزویلا براعظم جنوبی امریکہ کے شمالی حصہ میں واقع ہے۔ پندرھویں صدی عیسوی سے یہاں مسلمانوں کی آمد شروع ہے، ابتداء میں افریقہ سے جو مسلمان آئے آج ان کا پتہ نشان نہیں ملتا، جبر و ظلم

کے تحت مقامی آبادی کا جز بنا لیے گئے، ادھر پچاس سال کے اندر تلاش معاش تجارت اور دیگر ضرورتوں کے تحت مسلمانوں کی آمد میں تیزی آئی ہے۔ یہاں آنے والے زیادہ تر لبنان، فلسطین اور سوریہ کے ہیں ایک مختصر تعداد ہندوستان اور پاکستان سے آنے والوں کی بھی ہے۔ عقائد کی رنگارنگی نے یہاں بھی اپنے جلوے دکھائے ہیں، ایک محتاط اندازے کے مطابق وینزویلا میں مسلمانوں کی تعداد چالیس ہزار ہے، ان میں نصف سے زیادہ سُنی ہیں، دوسری بڑی تعداد شیعوں کی ہے، اس کے بعد دروزی اور نُصیری فرقے کے لوگ ہیں، جو نام کے لحاظ سے تو مسلمان ہیں ورنہ عقائد اور دوسرے شعائرِ دینی میں مسلمانوں سے الگ ہیں، چنانچہ یہ لوگ یہاں بھی عام مسلمانوں سے الگ تھلگ اپنی انفرادیت قائم رکھے ہوئے ہیں، شیعہ اور سُنی فرقوں نے ساتھ چلنے کی کوشش ضرور کی لیکن غیر فطری ساجھے داری زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی، شیعہ فرقہ کے لوگ جلد ہی الگ ہو گئے۔

ایک اخباری اطلاع کے مطابق دارالسلطنت کاراکاس میں سُنی مسلمانوں نے ایک تنظیم قائم کی ہے اور اسلامک سنٹر کے نام سے باضابطہ رجسٹرڈ کرا لیا ہے، دینی شعائر اور ثقافتی امور کی انجام دہی کے لیے ایک دو منزلہ عمارت خرید لی ہے۔ اس کی پہلی منزل میں نماز ادا کی جاتی ہے، عام دنوں میں تو لوگ کم آپاتے ہیں، البتہ جمعہ اور عیدین کے موقع پر اچھی خاصی تعداد جمع ہو جاتی ہے، دوسری منزل میں ایک بڑا ہال ہے جو دینی اجتماعات کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بعض دوسرے کمرے دفاتر، لائبریری اور دیگر ضروریات کے لیے استعمال ہوتے ہیں، وقتاً فوقتاً دینی موضوعات پر کانفرنسیں اور سیمینار منعقد ہوتے ہیں،، درسِ قرآن اور درسِ حدیث کا بھی اہتمام ہوتا ہے، اس نوع کے پروگراموں سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ دیارِ غیر میں رہنے والے مسلمانوں کے کانوں میں دین کی باتیں پہنچتی رہتی ہیں جو انہیں مسلمان ہونے کا احساس دلاتی ہیں اور اپنا تشخص برقرار رکھنے پر آمادہ کرتی ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ وہاں کی حکومت نے ایک قطعۂ آراضی سنٹر کو دے دیا ہے کہ اس میں مسجد اور مدرسہ قائم کریں۔ تنظیم سے وابستہ افراد اس کے لیے ضروری تیاریوں میں مصروف ہیں، یہ لوگ بجا طور سے ہمت افزائی کے مستحق ہیں۔

REGD. NO. ID (SE)/53 **ZIKR-O-FIKR** Vol. III Part-1
Reg No. 45862/86 Nov.-1987
G 1/278, Okhla, P.O. Jamia Nagar, New Delhi-110025

① حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی کی اصلاحی و دعوتی تقریروں کا پہلا سیٹ ①

مولانا ندوی نے جن اہم اسلامی ممالک اور اہم علاقوں کا ملک و بیرون ملک دورہ فرمایا وہاں انھوں نے وہاں کے مخصوص حالات اور مسائل کو سامنے رکھ کر اپنے تاریخی مطالعہ کا نچوڑ، قرآن سے استفادہ کا ثبت لباب اور اپنا درد دل رکھا، ان تقریروں اور خطبات میں ایسے حقائق و مضامین آگئے ہیں اور ان میں جو دعوت و پیغام اور نقشۂ عمل پایا جاتا ہے وہ نہ صرف اُن علاقوں کے لئے جہاں یہ تقریریں ہوئیں بلکہ وہ بیشتر اسلامی ممالک اور دوسرے علاقوں کے اہل فکر و نظر کے لئے لائق توجہ اور مستحق فکر و نظر ہیں، اس سلسلے کے حسب ذیل مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں جن کی قیمتیں ہماری فہرست کتب سے معلوم ہو سکتی ہیں۔

مجموعۂ اصلاحیات مولانا ابوالحسن علی ندوی

۱۔ "مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں":۔ جس میں بڑی جرأت کے ساتھ مغربی تہذیب کے نقائص پر نکتہ چینی اور مشرق کے پرستاران مغرب کی غلامانہ ذہنیت اور اندھی تقلید پر صاف صاف تنقید کی گئی ہے اور مشرق و مغرب کی درمیانی خلیج کو پاٹنے اور انسانیت کی صحیح رہنمائی و خدمت کے لئے ایک راہِ اعتدال کی نشاندہی کی گئی ہے۔ (عربی اردو اور انگریزی تینوں زبانوں میں دستیاب ہے)

۲۔ "پیامِ انسانیت":۔ پبلک جلسوں کی پانچ اہم تقریریں جن میں زندگی کے مسائل پر نئے طرز سے سوچنے اور نئے طریقے پر کوشش کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔
(فی الحال اُردو و ہندی دو زبانوں میں دستیاب ہے)

۳۔ "مقامِ انسانیت":۔ مخلوط اجتماعات کی پانچ اہم تقریریں جن میں اغراض و تعصبات، قوم پرستی اور سیاسی مقاصد سے بالاتر اور بالکل آزاد و بے تعلق ہو کر عام انسانوں کے سامنے وہ حقیقتیں رکھی گئی ہیں جن پر انسانیت کی نجات اور سلامتی موقوف ہے اور جن کو نظر انداز کر کے ہمارا یہ پورا تمدن اور پوری انسانی سوسائٹی اس وقت سخت خطرہ سے دوچار ہے۔
(فی الحال صرف اُردو اور ہندی میں دستیاب ہے)

۴۔ "نئی دنیا امریکہ میں صاف صاف باتیں":۔ مولانا ندوی کی ان اہم تقریروں اور خطبات کا فکر انگیز مجموعہ جو انھوں نے امریکہ و کنیڈا میں کی تھیں، جن میں مغربی تہذیب و امریکی معاشرت کا جائزہ، تجزیہ و مطالعہ پیش کیا، اور امریکہ میں مقیم مسلمانوں کے بارے میں مشورے، تجربے اور اندیشے ظاہر کئے ہیں۔ (عربی، اُردو، و انگریزی تینوں زبانوں میں دستیاب ہیں)

۵۔ "پاجا سراغ زندگی":۔ طلبائے علوم نبوت کا منصب و مقام، ملت کی ان سے توقعات، عصر حاضر میں ان کی ذمہ داریاں، طلباء و علماء مدارس کے لئے ایک مفید و اہم تحفہ (صرف اُردو میں)

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام بکس ۱۱۹ پوسٹ لکھنؤ
(ندوۃ العلماء)

Printed at Lahooti Print Aids, Jama Masjid, Delhi-110006
and published by Syed Taha Abdullah, G 1/278, Okhla,
P. O. Jamia Nagar, New Delhi-110052

ایک علمی، دینی اور ادبی ماہنامہ
ذکر و فکر (دہلی)
مرتبہ
خواجہ احمد فاروقی

مجلس ادارت

سید صباح الدین عبدالرحمٰن ● خلیق احمد نظامی
عبداللہ عباس ندوی ● خواجہ احمد فاروقی

خط و کتابت کا پتہ

جی ۱/۲۷۸ اوکھلا، ڈاکخانہ جامعہ نگر، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵

ایڈیٹر: خواجہ احمد فاروقی
منیجر: محمد شبیر ندوی
پرنٹر پبلشر: عبداللہ
مطبع: فاروقی پرنٹ ایڈرس، جامع مسجد دہلی ۶
قیمت: ۵۰ روپے سالانہ، فی پرچہ ۵
غیر ممالک سے ۲۰ ڈالر (یا اس کے بالمقابل سکہ ہندوستانی روپے میں)
تمام پرچے ہوائی ڈاک سے بھیجے جائیں گے اور وی پی نہیں بھیجی جائے گی

نوٹ

رقم، ڈرافٹ یا منی آرڈر کے ذریعہ ہی ارسال فرمائیں، اگر چیک سے رقم بھیجنا چاہیں تو مزید آٹھ روپے مصارف بنک کا اضافہ کر کے بھیجیں۔ نیز ڈرافٹ، منی آرڈر یا چیک مندرجہ ذیل پتہ پر بھیجیں:

ZIKR-O-FIKR (Monthly)
G-1/278, OKHLA, JAMIA NAGAR
NEW DELHI 110025

ماہنامہ

ذکر و فکر

دہلی

جلد	(۳)	ماہ ربیع الثانی	۱۴۰۸ھ
شمارہ	(۲)	ماہ دسمبر	۱۹۸۷ء

ترتیب

ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی

مذاکرات

دمشق کے ایک بزرگ عالم نے چند دن ہوئے بروئی (Buyunai) میں ایک مسجد کا سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب میں کہا:

"نُرِيْدُ مِئْذَنَةً تُعَانِقُهَا مِدْخَنَةٌ"

"ہم ایسا منارۂ مسجد دیکھنا چاہتے ہیں جس کے بالمقابل کسی مل کی چمنی بھی ہو"

بات نئی نہیں، پرانی ہے، مگر نئے انداز میں کہی گئی اس لیے نئی سی لگتی ہے۔ مگر پرانی یا قدیم ہونے کی وجہ سے غلط نہیں ہوگئی، بات سچی تھی، اور آج بھی سچی ہے کہ دین و دنیا کی تفریق ہی مسلمانوں کے زوال کی علامت ہے۔ یہ تفریق کہ، کچھ لوگ مسجد میں عبادت کریں، اور کچھ لوگ مل میں کام کریں۔ یا یہ کہ مسجد کی تعمیر دین کا کام سمجھا جائے، کارخانے اور ملوں کا بنانا دنیاوی کام قرار پائے۔ یہ تصوّر اس زمانہ میں نہیں تھا جب مسلمان اقبال مند اور سربلند قوم تھے، دینی اعتبار سے ممتاز تھے، وہ باغوں کی سینچائی، کھیتوں کی رکھوالی بھی اسی جذبے سے کرتے تھے جس جذبہ سے مسجدوں میں فرائض ادا کرتے، ہاں یہ ضرور تھا کہ وہ جب بازاروں میں خرید و فروخت میں منہمک ہوتے اس وقت بھی ان کے دل مسجدوں میں اٹکے رہتے، "قُلُوْبُهُمْ مُعَلَّقَةٌ بِالْمَسَاجِدِ" ایسا نہیں ہوتا کہ قیام و رکوع اور سجود میں بھی وہ اپنے کاروباری حسابات لگاتے۔

عرب ممالک میں یہود و نصاریٰ سب ہی بستے ہیں، خاص طور پر شام و مصر میں مسیحی بڑی تعداد میں ہیں، لبنان میں تو ان کا دعویٰ تھا کہ وہ اعداد و شمار میں دو فی صد بڑھے ہوئے تھے۔ بہرحال

زیادہ ہوں یا کم ان کی ثقافت کا اثر کم از کم شام ولبنان پر گہرا پڑا ہے، وہاں کی ادبیات اور صحافت پر ان کا قبضہ ہے، ان کی اصطلاحات کو سمجھ کر یا بغیر سمجھے ہوئے اکثر عرب ملکوں نے قبول کر لیا ہے، مثال کے طور پر اسی دین و دنیا کے مسئلہ کو لے لیجئے، یہ خالص مسیحی تصور ہے کہ دین سے اشتغال رکھنے والے، یا دین کا علم رکھنے والے "رجال الدین" (دین کا کام کرنے والے) کہلائیں کیونکہ وہ مسجدوں میں جاتے ہیں، مسئلے مسائل بتاتے ہیں، اور وقف کی آمدنی سے گزارا کرتے ہیں۔ دوسری قسم "عام انسانوں" کی وہ ہے جو تجارت و زراعت کا پیشہ کرتی ہے۔ ملوں اور کارخانوں میں کام کرتی ہے اور مسجدوں سے تعلق رکھنے کے علاوہ ہر قسم کے کام کی اس کو آزادی ہے، ان کو "رجال الاعمال" کہا جاتا ہے۔ اگرچہ اب یہ لفظ بڑے کاروباری اور تاجروں کے لیے خاص ہو گیا ہے، کیونکہ یہ اصطلاح سی بن گئی ہے، لیکن 'رجل الدین' اور 'رجل العمل' کی تفریق اسلامی عقائد پر ضرب کاری ہے اور مسلمانوں کے زوال و پسماندگی کی نشانی ہے۔ ڈاکٹر شیخ احمد کفتارو، وہ شامی بزرگ جنھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہم منارہ کے ساتھ چمنی دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کا مفہوم یہی ہے کہ مسلمانوں کی ترقی اور اسلام کی عزت اس بات میں ہے کہ مسلمان دین و عمل کا جامع ہو۔

برونی، جنوب مشرقی ایشیا کا ایک چھوٹا سا ملک ہے، جہاں پٹرول نکل آیا ہے اور دولت کی فراوانی ہو گئی ہے، وہاں کے باشندے ۹۹ فی صد مسلمان ہیں، چند قدیم مسجدیں وہاں پہلے سے موجود تھیں، ایک بڑی مسجد موجودہ سلطان نے اپنے والد 'عمر سیف الدین' کے نام پر بنائی ہے، اب ایک جامع مسجد شہر میں بنائی گئی ہے، لیکن وہاں کوئی انڈسٹری یا مل نہیں ہے صناعتی پسماندگی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے، شام کے عالم نے بات برمحل کہی، اور اچھے پیرایہ میں کہی لیکن اس کا اطلاق صرف برونی ہی پر نہیں بلکہ تمام عالم اسلام اور مسلم ممالک پر ہو سکتا ہے، کم و بیش ہر جگہ یہی صورت حال ہے کہ دینداری کا تقاضہ صرف مسجدیں رہ گئی ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ مسجدیں بنانے سے جتنی دلچسپی ہے اس قدر اہتمام مسجدوں کو آباد رکھنے کی نہیں ہے، علامہ اقبالؒ نے آج سے نصف صدی بیشتر کہا تھا:

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے، برسوں میں نمازی بن نہ سکا

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

موجودہ عالمِ اسلام کے لیے

فیصلہ کُن محاذ اور مرکزی میدانِ عمل

[مکۃ مکرمہ میں ۱۰۔۲۲ صفر ۱۴۰۸ ہجری، مطابق ۱۱-۱۵ اکتوبر ۱۹۸۷ء کو رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کا تیسرا اجتماع ہوا جس میں ۱۲۲ ملکوں سے اسلامی تنظیمات، جامعات، اور مسلم زعماء و مفکرین نے شرکت کی، اس کانفرنس کا رہبر مقالہ (گائڈ لائن)، ہندوستان کے عالم جلیل مفکر اسلام مولانا سیّد ابوالحسن علی الحسنی ندوی مدظلہٗ کا تھا، جس کو سن کر حاضرین مؤتمر نے مطالبہ کیا کہ اس کو مؤتمر کی اوّلین تجویز قرار دیا جائے، رابطہ عالم اسلامی کے نائب سکریٹری جنرل علامہ محمد العبودی نے جو اس اجلاس کی صدارت کر رہے تھے اس تجویز سے اتفاق کیا اور قرارداد مرتب کرنے والی کمیٹی کے حوالے کرنے اور علیحدہ سے پمفلٹ کی صورت میں شائع کرنے کا اعلان کیا۔

یہ مقالہ حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ کے ذوق و رجحان اور فکر و ضمیر کا ترجمان ہی نہیں ہے بلکہ ان کے مطالعہ تاریخ اور عالم اسلام سے قریبی واقفیت اور وہاں کی ہر تحریک کا براہ راست علم رکھنے، اور ماضی کے تمام تجربات دعوت کے نتائج کا صحیح جائزہ بھی ہے۔

ادارہ "ذکر و فکر" فخر و مسرت کے ساتھ یہ علمی و دینی تحفہ اردو میں سب سے پہلے شائع کر رہا ہے۔

______________ (ادارہ)

الحمد للہ وحدہ، والصلوٰۃ والسلام علی من لا نبی بعدہ۔

حضرات! ہم سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتے ہیں اور ان لوگوں کے شکر گزار ہیں جنھوں نے میرے لیے یہ موقع فراہم کیا کہ آپ سے دعوتِ اسلام کے موضوع پر کچھ عرض کروں، میرے لیے یہ بات باعثِ مسرت ہے کہ میرے مخاطب وہ حضرات ہیں جو اُمت کی فکری رہنمائی کر رہے ہیں اور اسلامی جمعیتوں اور تنظیموں کے ذمہ دار ہیں اور سب ہی دین کی خدمت سے وابستہ ہیں، اور سب سے زیادہ یہ بات میرے جذبات کے لیے مہمیز کا کام کر رہی ہے کہ یہ گفتگو وہاں ہو رہی ہے جو دعوتِ اسلام کا اوّلین مرکز، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کی جگہ اور بلدِ امین ہے میں اگر اپنے آپ کو مخاطب کر کے ایک عرب شاعر کا یہ شعر پڑھوں تو بیجا نہ ہوگا کہ:

حمامۃ جرعیٰ حومۃ الجندل اسجعی   فأنت بمرأی من سعاد ومسمع

حومۃ الجندل کی بلبل! (مناسب وقت ہے کہ) تو نغمہ سرا ہو، سعاد نگاہوں کے سامنے گوش برآواز ہے۔

حضرات! دعوتِ اسلامی کا موضوع کوئی نیا موضوع نہیں ہے، اس پر بہت کچھ لکھا اور بہت کچھ کہا جا چکا ہے، اور عصرِ حاضر میں تو اس پر کافی ریسرچ کیا گیا ہے، تحقیقی مقالات اور کتابیں لکھی گئی ہیں، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس موضوع پر پوری لائبریری تیار ہو چکی ہے[1] جو اپنی صوری اور معنوی ہر لحاظ سے ممتاز ہے، لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ اپنی گفتگو صرف ایک موضوع پر محدود رکھوں اور وہ ہے "دعوت دین کے فیصلہ کن محاذ اور اس کے مرکزی میدان عمل" جن سے نہ صرف دعوت کا رُخ متعین کیا جا سکے گا بلکہ عالم اسلام کی منزل کا تعین ممکن ہوگا، میں اپنے محدود مطالعہ، ماضی کے تجربات اور حقائق کی روشنی

---

[1] مجھے بھی اللہ تعالیٰ نے توفیق دی ہے کہ اس موضوع پر علمی اور تحقیقی انداز میں کچھ لکھوں، چنانچہ میری کتابیں: (۱) رجال الفکر والدعوۃ فی الاسلام (تاریخ دعوت وعزیمت) چار جلدوں میں۔ (۲) قرآن و سیرتِ نبوی میں دعوت دین کا اسلوب۔ (۳) ہندوستان میں اسلامی دعوت اور اس کا ارتقاء۔ (۴) دعوت کا حکیمانہ اسلوب اور مبلغین کے اوصاف۔ (۵) دینی دعوت ہی کے ذریعہ سوسائٹی کو جاہلیت سے بچایا جا سکتا ہے اور دین کو تحریف سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ (۶) علماء و مبلغین کے لیے اصلاح کا صحیح طریقہ۔ (۷) علماء کی تربیت اور دین کا داعی تیار کرنے میں اسلامی یونیورسٹیوں کا کردار، اسی موضوع پر ہیں۔

میں صرف انہی عملی گوشوں کی نشاندہی کروں گا، و باللہ التوفیق۔

ا مسلم عوام اور ان کے تمام گروہوں میں ایمان کی قوت کو بیدار کرنا، اور اس کو جلا دینا، کیونکہ ان گروہوں اور ان عوام کا اسلام سے وابستہ رہنا اور اس کے لیے ان کے دلوں میں جوش کا قائم رہنا ایک مستحکم اور بلند شہر پناہ کی حیثیت رکھتا ہے جس پر اس شہر اسلام کی بقاء کا دارومدار ہے، یہی نہیں بلکہ بہتیری اسلامی حکومتوں اور سربراہوں کو یہی چیز اسلام سے وابستہ رہنے پر مجبور کرسکتی ہے مسلمانوں کے دینی احساس کا ابھرنا اسلام کی قوت کا سرچشمہ اور اس کا راس المال ہے، اور یہی وہ خام مال ہے جو ہر پاک و مفید مقصد کے لیے استعمال ہوسکتا ہے، اور ایسے افراد کا وجود جوش عمل اور وسعت قلب و نظر اور اخلاص کے لحاظ سے پوری انسانی آبادی کا جوہر اور اس کا سب سے مفید اور مضبوط ترین مجموعہ ہوگا۔

ایمان کی پختگی اور دین کے لیے سرگرمی اور جوش عمل اسی وقت کارآمد ہوگی جب اس کے شرائط بھی پورے ہوں، اور ان افراد میں وہ اوصاف بھی پائے جائیں جن کی بنا پر وہ نصرت خداوندی کے مستحق ہوں، اور مشکلات پر قابو پانے اور دشمنوں پر غالب آنے کے سزاوار ہوں، وہ بنیادی شرائط یہ ہیں، عقیدہ کی تصحیح، صرف خدائے واحد کی عبادت، اور ہر قسم کے شرک اور غلط عقائد سے مبرّا ہونا، جاہلیت کے رسوم اور غیر اسلامی شعائر، نفاق، عمل اور عقیدہ میں دورُخی، قول و عمل کے درمیان تضاد، اور گزشتہ اقوام کی روش سے اجتناب جو اپنی بداعمالیوں کی پاداش میں اللہ کے عذاب اور بے تعلقی کی مستحق قرار دی گئیں، نیز موجودہ اقوام کی روش سے پرہیز جو اللہ کو بھول گئیں تو اللہ نے ان کو خود فراموش کردیا، اور جو دنیا کو تباہی اور ہلاکت کے راستہ پر چلا رہی ہیں۔

اسی کے ساتھ ساتھ دینی شعور کو صحیح راستے پر لگانا، اور اس شعور کی پرورش کرنا بھی ضروری ہے جس سے وہ مسائل و حقائق کو اچھی طرح سمجھ سکیں، دوست و دشمن میں تمیز کرسکیں اور نت نئے انداز کی تحریکوں کے دھوکہ میں نہ آئیں، تاکہ ہماری اگلی زندگی میں وہ المیے دوبارہ نہ پیش آئیں جو قومی نعرہ بازیوں اور جاہلیت کی تحریکوں کا شکار ہونے کے سبب پیش آئے یا جو لسانی تعصب اور رسم و رواج کی پابندی کی وجہ سے، نیز چالاک و ناپاک قیادتوں اور بیرونی سازشوں کے سبب مسلم

عوام کی تباہی کا سبب بنیں، اور دینی شعور اور فراست ایمان کی کمی کی وجہ سے مسلم عوام اپنی سادہ لوحی کا شکار ہو گئے۔

۲۔ مذہبی حقائق اور دینی تصوّرات کو تحریف اور عصر حاضر کے مغربی تصوّرات سے محفوظ رکھنا، سیاسیات و اقتصادیات کی اصطلاحوں کو دینی مقاصد کے بیان کرنے کے لیے استعمال کرنے سے باز رکھنا چاہیئے، اور دین کو خالص سیاسی نظریہ کے طور پر پیش کرنے اور عصر حاضر کے فلسفیانہ اصول سے اسلامی اصول کو مطابق کرنے کی مبالغہ آمیز کوشش کے نقصانات سے باخبر رہنا بھی ضروری ہے، کیونکہ دینی حقائق اسلام کے بنیادی اور ہمیشہ یکساں قائم رہنے والے اصول ہیں، وہ اپنی جگہ پر مستقل بالذات ہیں اور وہ خود اپنے معیار ہیں، ان معیاروں کو کسی دوسری کسوٹی پر جانچنے کی ضرورت نہیں ہے، اس کو ناپنے کے لیے خود اسی کا گز ہے، انبیائے کرام کی دعوت کا موضوع یہی اصول تھے، اور اسی کے لیے انھوں نے جہاد کیا، اور اسی کے لیے انھوں نے سعی و جدوجہد کی، اور انہی پیمانوں پر آسمانی کتابیں نازل ہوئیں۔

اسی طرح ان باتوں سے پرہیز بھی ضروری ہے جو اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان تعلق کو کمزور کرے، آخرت پر ایمان کی اہمیت کو گھٹائے اور مومن کے دل سے احکامِ خداوندی پر عمل کرنے کے جذبہ کو، اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے شوق کو، اللہ سے تقرّب کی تمنا کو اور اس کی رضا کے لیے اور اس کے ثواب کی امید میں کاوش کرنے کو بے اہمیت قرار دے، کیونکہ یہ باتیں اگر پیدا ہو گئیں تو امت کا تشخص اور اس کی انفرادیت مجروح ہوگی، اور عند اللہ ایسے لوگوں کا کوئی وزن نہیں رہے گا۔ اسی طرح بُت پرستی کے عقیدوں، صریح شرک، اور جاہلی عقیدہ و رواج کی بُرائیاں بھی ذہن نشین ہونا چاہیے۔ اور صرف دستور و نظام پر تنقید اور غیر اسلامی حکومتوں کی زبانی مخالفت کو کافی سمجھنا دین کے قدیم سماوی اسلوب سے روگردانی اور جدید سیاسی اسلوب کی پیروی ہے:

۳۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روحانی، جذباتی اور قلبی تعلق کی پختگی اور آپ کی ذات گرامی سے گہری محبت جو اپنی ذات، اہل و عیال اور آل و اولاد سے ہو، جیسا کہ صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اس حیثیت سے ایمان کہ آپ خاتم الرسل، مولائے کُل اور

بادی مسئل ہیں اور آپ سے تعلق خاطر دین کی بنیاد ہے لہذا ان عوامل سے بچنا ضروری ہے جو اس محبت کے سرچشمہ کو خشک کرنے کا سبب بنیں، یا کم از کم ان کو کمزور کریں، جذبات و احساسات میں سرد مہری پیدا کریں، اور اس کے نتیجہ میں سنّت پر عمل میں کوتاہی پیدا ہو، بے باکی اور دریدہ دہنی پیدا ہو، مزاج وافتاد ایسے رُخ پر پڑ جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سرمایۂ فخر باور کرنے اور آپ کی سیرت پڑھنے اور سمجھنے کا شوق کم ہو، اور آپ کی محبت کو اُبھارنے اور اس کو غذا دینے کے ذرائع سے روگردانی مذاق عام بن جائے، ہمارے موضوع کے اس پہلو پر ہر ایک کو توجہ کرنے کی ضرورت ہے اور خاص طور پر عرب بھائیوں کو اس کی زیادہ فکر کرنا چاہیے، کیونکہ عرب قومیت کی تحریکوں اور ماضی قریب کے حوادث نے ان کو اس سرچشمہ سے دور کرنے کی کوشش کی ہے جو ان کا سرمایۂ حیات ہے اور جس کے وہ زیادہ حقدار اور زیادہ ضرورت مند ہیں کیونکہ بعثت محمدیہ سے یہی سرزمین مشرف ہوئی، اور قرآن کریم ان کی زبان میں نازل ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی کی زبان میں گفتگو فرمائی۔

۴۔ تعلیم یافتہ طبقہ میں اور اس طبقہ میں اسلام پر اعتماد کی بحالی جن کے ہاتھوں میں تعلیم و تربیت اور وسائل ابلاغ کی باگ ڈور ہے، اسلام پر اعتماد کی بحالی کا مطلب یہ ہے کہ انھیں اس بات کا یقین ہو کہ اسلام کے اندر نہ صرف زمانہ کو ساتھ لے کر چلنے اور تعمیر و ترقی کے میدان میں ہر ایک سے آگے بڑھنے کی صلاحیت ہے بلکہ وہ پوری انسانی آبادی کی قیادت بھی کر سکتا ہے، اور وہی زندگی کی کشتی کو ماہرانہ صلاحیت سے کھے کر سلامتی و خوش حالی کے کنارے تک پہنچا سکتا ہے، انسانی آبادی کو ہلاکت اور خودکشی کی راہ سے نکال سکتا ہے جس میں مغرب کی بوڑھی اور اندھی قیادت نے اس کو ڈال دیا ہے، اور وہ سمجھ سکیں کہ وہ ایسی بڑی نہیں ہے جو ڈسچارج ہو چکی ہے یا وہ دیا نہیں ہے جس کا تیل خشک ہو چکا ہو اور جس کی بتی جل چکی ہو، بلکہ وہ ایک عالمی و سرمدی پیغام ہے اور سفینۂ نوح کی طرح تنہا سفینۂ نجات ہے جس پر سوار ہونے والے ہی غرق ہونے سے نجات پا سکتے ہیں۔

دین کی صلاحیت کے متعلق اعتماد کی کمی یا اس کا معدوم ہونا دراصل اس تعلیم یافتہ طبقہ کا مرض ہے جس نے مغربی ثقافت کے آغوش تربیت میں شعور کی آنکھیں کھولی ہیں یا جس کو مغرب کی بالادستی نے یہی باور کرایا ہے، یہی طبقہ پوری ملّت کی تباہی کا ذمہ دار اور ذہنی ارتداد کا سبب ہے، ساری دستوری یا تمدّنی

بدعنوانیاں جو پورے عالم اسلام کو کھوکھلا کر رہی ہیں وہ اسی طبقہ کی کم نگاہی یا بے راہ روی کا نتیجہ ہے، مگر یہی لوگ مسلم اقوام پر مسلط ہیں، ان اقوام پر مسلط ہیں جو صرف ایمان و قرآن کی زبان سمجھتا تھا اور جس کے اندر جوش عمل تھا، اور دین کے لیے قربانی کا جذبہ تھا، غرض اسی نظام تعلیم نے حکمراں طبقہ اور جمہور کے درمیان گہری اور وسیع خلیج حائل کر دی ہے جس کی وجہ سے ہر جگہ ایک عمومی بے چینی اور اضطراب کا دور دورہ ہے اور اس بات نے افراد کی ذہنی و عقلی قوتوں کو ایسے کاموں میں لگا دیا ہے جن کا کوئی فائدہ ان اقوام کو نہیں حاصل ہوا۔

۵۔ ضرورت ہے کہ مغرب سے درآمد کیا ہوا نظام تعلیم جو پورے عالم اسلام میں رائج ہے ایک بار نئے سرے سے اس کا جائزہ لیا جائے اور پوری طرح کھنگالا جائے اور اس کو ایسے قالب میں ڈھالا جائے جو مسلم اقوام کے قدوقامت پر راست آئے، اس کے عقیدہ و پیغام سے ہم آہنگ ہو اور جس سے مسلم قوم کی معنوی خصوصیت نمایاں اور اس کی انفرادیت آشکارا ہو، مادی والحادی عناصر سے پاک ہو تاکہ کائنات کا صرف مادی تصوّر اس کے سامنے نہ ہو، کیونکہ جہاں تک علوم کا تعلق ہے وہ سب ایک دوسرے کا کاٹ کرنے والی اکائیاں ہیں جب کہ نظام فطرت ایک بے قید اور سب کو پامال کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، تاریخ انسان کے اضطراب و بے چینی اور آپس کی جنگوں کے لامتناہی افسانوں کا پلندہ ہے ان کو بنیاد بنا کر جب بھی عقل انسانی کی پرورش اور اس کے نمو و بالیدگی کی کوشش کی جائے گی تو کامیابی کا دائرہ محدود سے محدود تر ہوگا۔

نظام تعلیم میں جزوی اصلاحات اور معمولی کتر بیونت کارآمد نہیں ہو سکتی، اس لیے ضرورت ہے کہ خواہ جس قدر بھی وسائل اور غور و فکر کی ضرورت پڑے اچھے سے اچھے ذہن و فکر سے مدد لی جائے، بہتر سے بہتر وسائل اختیار کیے جائیں تاکہ ایک پائیدار اور مفید نظام تعلیم و تربیت امت کو مل جائے کیونکہ اس کے بغیر عالم اسلام اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکتا، اپنی عقل اور اپنے ارادہ کے مطابق کام نہیں کر سکتا، اس کے بغیر نہ تو حکومتوں کو مسلمان کارندے مل سکتے ہیں نہ مخلص منتظمین مل سکتے ہیں، نہ ایسے مومن و مخلص افراد مل سکتے ہیں جو اسلامی تعلیمات کے مطابق سرکاری دفاتر، عوامی رفاہیت کے اداروں، انتظامیہ اور عدلیہ دانش گاہوں اور وسائل اعلام کو پابند کر سکیں تاکہ اسلام کا نظام معاشرت و حکومت پورے جمال و کمال کے ساتھ سامنے آئے اور مسلم سوسائٹی اپنی خصوصیات اور انفرادی

امتیازات کے ساتھ دنیا کے سامنے آئے۔

۶۔ اس مقصد کے لیے ایک بین الاقوامی پیمانے پر مضبوط تحریک ہونی چاہیے کہ دنیا کے پڑھے لکھے سمجھ دار طبقہ میں اسلام کے علمی خزانوں کا تعارف کرایا جائے اور مسلمانوں کے علمی و دینی کارناموں سے انھیں آگاہ کیا جائے، علوم اسلامیہ میں زندگی کی نئی روح پھونک کر متمدن دنیا پر یہ واضح کر دیا جائے کہ اسلام کے عائلی و اجتماعی قوانین دنیا کے بلند ترین اور وسیع ترین اصول پر مبنی ہیں، وہ اصول جو نظام فطرت سے ہم آہنگ ہیں اور ان میں کبھی کسی تبدیلی کا امکان نہیں ہے، اور اس کی نفع بخشی اور قوت کسی زمانہ میں نہ کم ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے، اور وہ انسانی زندگی کی رہنمائی وقت کے ہر دھارے پر اور زندگی کے ہر موڑ پر پوری ذمہ داری کے ساتھ انجام دے سکتی ہے، اور لوگوں کے بنائے ہوئے قانون "جن کو وضعی قوانین" کہا جاتا ہے سے بدرجہا بہتر و مفید اور پائیدار ہیں۔

۷۔ انسانی نفوس اور قومی وجدان میں تمدنی نظام کی جڑیں بہت گہری ہوتی ہیں، خاص طور پر ایسا نظام معاشرت جو دینی بنیادوں اور اس کی تعلیمات کے سایہ میں پروان چڑھا ہو، اور جس کی تعمیر میں ایک خاص انداز کے مذہبی ذوق کو دخل ہو، اور جس پر اس قوم کی چھاپ ہو ایسے نظام معاشرت (یا تمدن) سے کسی قوم کو الگ کرنا اس کو زندگی کے میدان سے خارج کر دینے اور عقیدہ و عبادت اور مذہبی مراسم کے تنگ چوکھٹے میں قید کر دینے اور اس کے حاضر کا رشتہ ماضی سے توڑ دینے کے مرادف ہے، لہٰذا اسلامی حکومتوں اور مسلم سوسائٹیوں کا فرض ہے کہ وہ ایک مستقل بالذات تمدن کی باریک بینی کے ساتھ تشکیل کریں جو مغرب کی کورانہ تقلید، بغیر پلاننگ کے سرسری اقدام، اور احساس کمتری کے آثار سے پاک ہو، اسلامی تمدن کی نمائندگی پورے طور پر اس کے مرکزی قیادت میں، اداروں میں، گھروں میں، اجتماعی جگہوں میں، ہوٹلوں میں، تفریح گاہوں میں اور کسی حد تک اس کے دفتروں اور ہوائی جہازوں میں اور سفارت خانوں میں ہونی چاہیے۔ اس سے صرف یہی نہیں ہوگا کہ اسلامی ممالک اسلامی زندگی کا ایک نمونہ پیش کریں گے بلکہ اسلام کی ایک خاموش تبلیغ بھی ہوگی۔

۸۔ مغربی تمدن بشمول مغربی علوم و نظریات کو ایجادات و امکانیات کے ایک خام مال کی حیثیت سے قبول کیا جائے جس سے عالم اسلام کے فکری رہنما اور سربراہ ایک ایسا پائیدار مناسب وقت تمدن تیار کریں جس کی بنیاد ایمان و اخلاق، پرہیزگاری اور رحم و انصاف پر ہو، دوسری طرف اس میں نمو و افزائش کی

گنجائش ہو، اس میں قوت واُمنگ ہو، جس کا اثر تمام شعبۂ حیات پر پڑے، پیداوار بڑھے اور عوام میں خوشحالی آسکے۔ خلاصہ یہ کہ مغربی علوم سے وہ چیزیں لی جائیں جن کی مسلم عوام یا مسلم ممالک اور حکومتوں کو ضرورت ہے جن سے عملی فوائد میسّر ہوں اور جن پر مغرب و مشرق کی چھاپ نہ ہو، اس کے علاوہ وہ چیزیں جن کی انھیں ضرورت نہیں ہے ان سے استغنا برتا جائے۔ مغرب سے معاملہ ایک ہمراہی اور مدمقابل کے جیسا ہو، کیونکہ اگر مشرق اس بات کا محتاج ہے کہ مغربی علوم سے بقدر ضرورت اخذ کرے تو مغرب بھی بہت سی چیزیں مسلم ممالک سے لے سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ مغرب کو ان ممالک سے سیکھنے اور حاصل کرنے کی زیادہ ضرورت ہو۔

۹۔ مسلم ممالک میں چند ایسے ملک بھی ہیں جنھوں نے ماضی میں دعوت اسلامی اور اسلامی تمدّن کی قابل ذکر اور شاندار خدمتیں انجام دی ہیں، اور عصر حاضر میں جو اس بات پر تُلی ہوئی ہیں کہ جس طرح ممکن ہو اسلامی عنصر کو ناپید کر دیا جائے یا جن کے یہاں "پروگریسو اسلام" کو مقبول بنانے کی کوشش ہو رہی ہے اور اسلام کی تفسیر سیاسی مصالح اور حکمرانوں کے شخصی ذوق و مزاج کے مطابق کی جا رہی ہے ان حکومتوں کو باور کرایا جائے کہ یہ سیاست ایک ناکارہ اور بانجھ سیاست ہے جو کسی اسلامی ملک میں کبھی کامیاب نہیں ہوئی۔ ان حکومتوں کو یہ باور کرانے کی ضرورت ہے کہ وہ بجائے ناممکن العمل اور غیر فطری کوششوں کے اپنی قوت اور اپنی امکانی صلاحیتوں کو ملک و ملّت کے مشترکہ دشمن کے خلاف صرف کریں جس سے ملک و ملّت کو تقویت حاصل ہو۔

جہاں تک ان ممالک کا تعلق ہے جن میں اکثریت مسلمانوں کی ہے اور حکمراں اسلام سے 'صلح کل' قسم کا معاملہ کرتے ہیں وہاں اسلامی قوانین کے نفاذ کی ضرورت ہے اور اس کے لیے فضا کو سازگار بنانے کی حاجت ہے، جو اسلامی قوانین کو نافذ کرنے میں معاون ثابت ہوں، اور قوانین اسلام کے نافذ کرنے کے نتیجہ میں جو اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت اور برکت و سعادت حاصل ہوگی اسے سمجھانے کی ضرورت ہے، نیز ان ممالک میں کوشش ہونی چاہیے کہ ایک مرکزی قیادت ہو جس کی بنیاد اسلام کے نظام شوریٰ پر ہو اور خیر و نفع کے کاموں میں آپسی تعاون جس کی اساس ہو، اور کم از کم اپنی کوتاہی کا احساس ضرور ہو کہ مسلمان "امامت عامہ" کے وجود سے محروم ہیں، امامت عامہ یا خلافت اسلامیہ جس کو قائم کرنا مسلمانوں کا فرض تھا اور جس کے نہ قائم کرنے کی ان سے پرسش ہوگی۔

۱۰۔ وہ ممالک جو غیر اسلامی ہیں وہاں اسلام کی دعوت اور اس کا تعارف حکمت و بصیرت کے ساتھ جاری رکھنا چاہیے اور وہ نہج اختیار کرنا چاہیے جس میں اسلامی تعلیمات کی روح جلوہ گر ہو، زمانہ کے مزاج کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہو۔

رہے وہ ممالک جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں اس بات کی فکر رکھنی ہے کہ اسلام کی صحیح نمائندگی ہو، اسلامی زندگی ایسی ہو جو دوسروں کو متوجہ کرے اور جس کی طرف لوگوں کے دل مائل ہوں، اخلاقی اور روحانی قدروں کی قیادت مسلمانوں کو سنبھالنا چاہیے، اور ملک کو گراوٹ اور تباہی سے بچانے کی ذمہ داری قبول کرنا چاہیے، اسلام صرف اس صورت میں اپنی ضرورت اور اہلیت ثابت کر سکتا ہے، اور مسلمان اپنی دعوتی مہم اور قائدانہ کردار ان ملکوں میں ادا کر سکتے ہیں۔

۱۱۔ آخر میں یہ عرض کرنا ہے (جو اس سلسلہ کی انتہائی بات نہیں ہے) کہ اسلام کی فطرت، اس کی تابناک تاریخ اور فطرت سلیمہ کا تقاضہ، اور بنی نوع انسان کی طبعی خصوصیت کا یہ مطالبہ ہے کہ ایک دعوتی، ایمانی حرکت مسلمانوں میں ضرور قائم رہے جو ایجابی انداز کی ہو اور مضبوط بنیادوں پر قائم ہو، داعیوں میں مردانہ صفات ہوں، بلند حوصلگی ہو، ان کی نگاہیں دور رس ہوں اور وہ دنیا کی عظیم طاقتوں کا مقابلہ کر سکیں، وہ طاقتیں جنھوں نے ناجائز اور ناحق مسلم و غیر مسلم سب ہی قوموں کے انجام کار کے مسائل اپنے ہاتھ میں لے لیے ہیں، لیکن یہ بات کہ داعی الی اللہ ان صفات کا حامل ہو یا ان کے اندر یہ صفتیں پیدا ہو جائیں اس وقت ممکن ہے جب کہ وہ پورے یقین اور اطمینان قلب کے ساتھ ایک طاقتور دعوتی تحریک میں شریک ہوں، اور ان کے اندر اسلام کی برتری کا عقیدہ ہو، اور اس بات پر ان کو یقین ہو کہ بشریت اس دین کی محتاج اور ضرورت مند ہے۔

دعوت اسلام کی سرگرمی میں قربانی کا جذبہ، سر فروشی کی دھن، کوہ کنی کی ہمت، تکلفات سے عاری زندگی گزارنے کی عادت اور اگر ضروری ہو تو خطرات میں کود نے کی جرأت (مغامرہ Risk) بھی مطلوب ہے، کیونکہ فطرت انسانی یہ ہے کہ وہ اسی ایمان کی عزت کرے جس میں قوت ہو، اس فرد کی عزت کرے جس کو اپنے اصول و عقائد پر اعتماد ہو، اور قابل فخر سمجھتا ہو، جس کے یہاں لذت اندوزی اور مال وجاہ کی بے وقعتی ہو، اور جس کے اندر اپنے آپ کو خطرات میں

ڈالنے کی ہمت ہے۔ انسانی فطرت ہمیشہ اس چیز کو اہمیت دیتی ہے جو شے نایاب اور اس کی دسترس میں نہ ہو، لہذا کمزور انسان قوی انسان کے احترام پر فطرتاً مجبور ہے۔ غریب آدمی امیر کی عزت کرتا ہے، ناخواندہ پڑھے لکھے آدمیوں پر رشک کرتا ہے، یہاں تک کہ ایک کینہ بھی شریف انسان کی عزت اپنے دل میں رکھتا ہے، اسلامی تاریخ جاں بازی کے کارناموں اور خطرات کا مقابلہ کرنے کے واقعات سے پُر ہے، وہ اصحاب علم و بصیرت جو اقوام و ملل کی تاریخوں سے واقف ہیں اور وہ لوگ جن کے ضمیر زندہ ہیں وہ مشرق و مغرب کی قیادتوں سے اُکتا چکے ہیں اور اُن سے نفرت کرنے لگے ہیں۔

ایک خلا کا پایا جانا، یعنی ایسی تحریک ایمانی اور دعوت دینی کا نہ پایا جانا جو اپنی جگہ پر قوی بھی ہو اور ایجابی بھی، اور ایک ایسی سوسائٹی کا نہ پایا جانا جو مضبوط بنیادوں پر قائم ہو اور مادی تمدّنوں کی پیدا کردہ خرابیوں سے پاک ہو، اور جو اسلام کی تعلیمات اور اس کی قدروں کی محافظ ہو۔ ایسی سوسائٹی کا نہ پایا جانا، اور دعوتی خلا اسلامی وجود کے لیے بڑا خطرہ ہے، صحیح عقائد اور اسلامی زندگی کے لیے خطرہ ہے، کیونکہ کسی ضروری چیز میں خلا جو بشریت کی نفع بخشی کے لیے ضروری ہو زیادہ طویل عمر کا مستحق نہیں ہوسکتا، ایسے خلا کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کوئی دوسری تحریک سامنے آئے گی جو بے راہ روی کی دعوت دے گی، بے مقصد و بے فائدہ عقائد کے لحاظ سے لغو اور ناقص، سلبی انداز کی تحریک جو تباہی و بربادی کا ذریعہ بنے گی، جن لوگوں نے مذاہب، تحریکات اور مختلف قسم کی دعوتوں کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ جب کوئی صحیح اور پائیدار اسلامی تحریک سامنے نہیں ہوگی تو ایک غلط قسم کی تحریک اس کی جگہ لے لے گی، اور اگر کہیں اس غلط قسم کی تحریک نے کسی درجہ میں خطرات کا مقابلہ کرلیا اور کچھ قربانیاں دکھا دیں اور مادی مظاہر سے اپنے آپ کو ذرا بلند دکھا دیا، اور مسلم ممالک میں اسلامی تعلیمات سے دوری کی وجہ سے جو فساد ہے اس کی نشان دہی کردی، اور بڑی طاقتوں کو ذرا للکار دیا، نعرہ بازیوں سے فضا کو اپنے حق میں استوار کرلیا اور پروپیگنڈوں سے اپنے تھوڑے کام کو پہاڑ بنا کر پیش کردیا تو پھر کیا ہے لوگوں پر اس کا سحر چل جاتا ہے اور سب اندھا دھند اس کے پیچھے لگ جاتے ہیں، خاص طور پر نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ یا نیم تعلیم یافتہ طبقہ میں اس کی دھوم مچ جاتی ہے، اور وہ لوگ جو بعض مسلم ممالک کی بے راہ روی

سے نالاں ہیں، ان پر اس طرح کی تحریکوں کا ایسا جادو چل جاتا ہے جس کو نہ کسی واعظ کا وعظ دور کر سکتا ہے اور نہ کسی صاحب ضمیر و قلم کا قلم، اور نہ کوئی منطقی استدلال کام دیتا ہے اور نہ کوئی علمی جائزہ اور تحقیق، پہلی صدی ہجری میں خوارج کی تاریخ، چھٹی اور ساتویں صدی ہجری میں باطنیوں اور فدائیوں کی تحریک کی تاریخ، حسن بن الصباح کے افسانے اور جو اس کے مرکز عمل "قلعۂ موت" میں ہوا کرتا تھا، اور بہتیری فوجی اور انقلابی تحریکوں کی تاریخ جو اسلام کے نام پر بگڑی ہوئی صورت حال کو از سر نو اُلٹ کر درست کرنے دعویٰ کرتی رہی ہیں اور محض جھوٹ اور مکر و فریب کا لبادہ اوڑھ کر پبلک کے سامنے آئیں، اسی طرح بعض معاصر انقلابی و عسکری تحریکیں جنھوں نے اپنی غلط رُخ پر چلنے والی تحریکوں کی مدد کے لیے اور اپنے سیاسی مقاصد کو پورا کرنے کے لیے ہزاروں نوجوانوں کو اپنے گرد جمع کر لیا جو ہر قربانی کے لیے تیار رہے، یہاں تک کہ بعض وہ حلقے اور گروہ جو اسلامی تعلیمات کے محافظ سمجھے جاتے تھے اور ان کے فکر و عمل میں بیداری پائی جاتی تھی وہ بھی اس زد میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے، اور قرآنی نصوص اور اسلامی عقائد کی روشنی میں کسی کو جانچنے اور پرکھنے کی ضرورت نہیں محسوس کی، اور نہ انھوں نے اسلام سے منسوب فرقوں کا انصاف کے ساتھ مطالعہ کیا۔

مسلم زعماء و مفکرین کے ذہن میں یہ بات ہوگی کہ سیلاب کی رو کو ایک سیلاب ہی روک سکتا ہے طوفان کا مقابلہ اس سے زیادہ قوت کا طوفان ہی کر سکتا ہے، عالم اسلام کی موجودہ جو حالت ہے اس کو معذرت کے ساتھ عرض کروں گا کہ وہ جمود کی حالت میں ہے، اس پر راحت طلبی اور گراں خوابی طاری ہے، اس کے اندر کوئی ایمانی مضبوط دعوت نہیں ہے اور نہ صحیح عقائد اور بلند و پاک مقاصد کے لیے قربانی اور فدائیت کا جذبہ ہے، فکری اور عسکری لحاظ سے بھی وہ خود کفیل نہیں ہیں، اور یہ بات ہمیشہ ایک خطرناک صورت حال کے پیدا ہو جانے کی آگاہی دیتی ہے، اور ہر طور پر غلط قسم کی کھوکھلی تحریکوں کے جال میں نوجوانوں کو ڈال دینے کے لیے زمین ہموار کرتی ہے، کیونکہ نوجوان موجودہ صورت حال سے نالاں اور جن کو صحیح میدان عمل نہیں مل رہا ہے، ان تحریکات کا شکار ہو جاتے ہیں کیونکہ وہاں ان کو کسی قدر سکون میسر آتا ہے

اگرچہ ان تحریکات کی حیثیت اس سراب کی ہے جس کا نقشہ قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"کسراب بقیعة یحسبه الظمآن ماء حتی اذا جاءه لم یجده شیئاً و وجد الله عنده فوفاه حسابه"[1]

" مثل سراب کے چٹیل میدان میں کہ پیاسا اس کو پانی خیال کرتا ہے یہاں تک کہ جب اس کے پاس آیا تو اس نے کچھ بھی نہ پایا اور اس کے پاس (قضائے) الٰہی کو پایا، سو اللہ نے اس کا پورا حساب چکا دیا"

لیکن یہ انسانی فطرت اور اقوام و ملل کا تجربہ ہے، اور جو لوگ بھی "عصر جدید میں اسلام" اور اسلام کے مستقبل کی فکر رکھتے ہیں اور جن کو عقیدہ کی صحت، خدا و رسول پر ایمان کی عظمت اور تعلیمات دین عزیز ہے ان کو اس حقیقت کو سامنے رکھنا چاہیے۔

میں اپنا یہ مختصر مقالہ ایک قرآنی آیت پر ختم کرتا ہوں جس میں اللہ تعالیٰ نے انصار و مہاجرین کی اوّلین مختصر جماعت کو مخاطب فرمایا ہے اور ان میں رشتہ مواخات کے قیام سے ساری دنیا اور انسانیت کے مقدر کو مربوط کیا ہے۔

"إلّا تفعلوه تکن فتنة فی الارض و فساد کبیر"[2]

" اگر یہ نہ کروگے تو زمین میں بڑا فتنہ اور بڑا فساد پھیل جائے گا"

---

[1] سورۂ نور ۳۹

[2] سورۂ انفال ۷۳

تحریر: محی الدین (ایڈیٹر آزاد اکیڈمی جرنل)
ترجمہ از انگریزی: محمد ثناء اللہ

مذہبی بنیاد پرستی ــــــ ایک تجزیہ

آجکل ایک رجحان یہ ہے کہ ہمارے سیاسی نظام کی ہر خرابی کی ذمہ داری مذہبی بنیاد پرستی کے سر تھوپ دی جاتی ہے۔ زمانہ حال کے بہت سے بے سوچے سمجھے الفاظ مثلاً بورژوا، دقیانوسی، رجعت پسند وغیرہ کی طرح یہ اصطلاح بھی لوگوں کی ایک خاص جماعت کو متہم کرنے کے لیے استعمال کی جارہی ہے، لہذا ہمیں دیکھنا چاہیے کہ اس لفظ کا حقیقی مفہوم کیا ہے، اور کس حد تک ہمارے موجودہ امراض کے اسباب کی شناخت میں یہ ہماری مدد کرسکتا ہے۔

بنیاد پرستی بائبل کی وحی کا نظریہ ہے جس کے مطابق بائبل کے الفاظ خدا کی جانب سے القا کیے ہوئے ہیں اور اسی وجہ سے الہامی صداقت کا قطعی ثبوت ہیں۔ شارٹر آکسفورڈ ڈکشنری میں اس لفظ کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

> "روایاتی آرتھوڈکس عقائد سے باضابطہ وابستگی (یعنی کلام مقدس کی حرف بحرف معصومیت، اور خطا سے مبرا ہونا) جو عیسائی ایمان کا اصول ہے۔"

انیسویں صدی میں بائبل کی ادبی و تاریخی تنقید کے ارتقا کے بعد ردعمل کے طور پر اس نظریہ کو تقویت ملی، اس نے قبل از تنقید روایاتی رائے اور طرز خیال کی (کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونوں کی) سختی اور مضبوطی کی نمائندگی کی، کہ خدا نے معجزانہ طور پر وحی کی صداقت کو بائبل کے مصنفین تک پہنچا دیا ہے۔ چنانچہ یہ اصطلاح عیسائیت سے متعلق ایک خالص دینی نزاع اور قیل وقال سے متعارف کراتی ہے جس کا دوسرے کسی مذہب سے کوئی سروکار نہیں۔ یہ عیسائیت کی مخصوص مذہبی نشوونما کا نتیجہ تھا اور اس قسم کی کوئی مثال دوسرے مذاہب میں نہیں ملتی۔ دوسرے مذاہب اور خصوصاً مشرقی مذاہب

سکے دینی صحیفوں کی تاریخی وادبی تنقید کے سلسلہ میں اس قسم کی کوئی کوشش اس وجہ سے نہیں کی گئی کہ یا تو ان کے صحائف بالکل مستند ہیں، یا ان کی تنقید ممکن ہی نہیں ہے۔ بہرکیف بنیاد پرستی اگرچہ خالص دینی امور میں ذہن کے ایسے انداز ور رجحان کو ظاہر کرتی ہے جو مذہب میں اصلاح کے لیے نئے خیالات یا نئی تجاویز کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا، اور اس کو عدم تغیر کے رجحان کا نمائندہ سمجھا جانے لگا ذہن کی کشادگی یا وسیع القلبی بے شک ایک اچھی بات ہے، لیکن اکثر و بیشتر اس کو "ترقی" کے مساوی بنا دیا جاتا ہے جس کا مطالبہ یہ ہے کہ تبدیلی بذات خود خیر کی حیثیت سے قابلِ پرستش شے ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اخلاقی اور ثقافتی اقدار کے دائرہ میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو مستقل ہو، اور تبدیل و تبدل سے ماوراء ہو۔

حقیقت تو یہ ہے کہ سماجی اور سیاسی فلسفوں کے بنیادی تصورات میں بمشکل ہی کوئی تغیر یا "ترقی" واقع ہوتی ہے۔ کسی بھی فلسفہ کے مختلف نظریات کو کسی اصلاح یا ترقی کے بجائے بنیادی نظریہ میں یا اس کے فکر میں جدّت یا اس سے تجاوز و انحراف سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ خیر جیسا بھی ہو، ہم کو اصل تنقیح طلب مسئلہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے، یعنی مذہبی بنیاد پرستی۔ اور اس سلسلہ میں چند مذاہب کے بنیادی عناصر و اجزائے ترکیبی کا تجزیہ کرنا چاہیے تاکہ ہم یہ دیکھ لیں آیا وہ مختلف گروہوں میں کسی بے آہنگی یا ناسازی کو فروغ دیتے ہیں۔

روڈلف اوٹو The Idea of the Holy کا مصنف ہے (یہ کتاب جرمن زبان میں Das Heilige کے نام سے ۱۹۱۷ء میں شائع ہوئی، اور اب کلاسیکی ہو گئی ہے) کے خیال میں تمام مذاہب کی ماہیت Holy (مقدس) کے مظہر میں پوشیدہ ہے، جس کا اظہار (Bipolar mystery (دو قطبی راز) سے کیا گیا ہے۔ یہ مسحور کن، پراسرار، دل کشی (Mysterium Facinaum) کو خوف و دہشت یا پراسرار عظمت (Mysterium Tremendum) کے ساتھ مربوط کرتا ہے۔ بہ ترِ معرفت کی حیثیت سے "مقدس" کو کبھی بھی پورے طور پر فہم و ادراک کے دائرہ میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ اس معنی میں اس کی جڑیں ایسی شے میں پیوست ہیں جو انسانی ادراک کے حدود سے ماوراء ہے۔ کچھ لوگ اس کو غیر عقلیت پسندی بھی کہہ سکتے ہیں، مگر یہ "شے" درحقیقت، حقیقت کے تمام ان نظریات اور تصورات کی نشاندہی کرتی

ہے جن کے ثبوت یا عدم ثبوت کا فیصلہ نہ تو سائنسی مشاہدہ کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی فکری مقبول اور تسلیم کردہ صورتوں میں اس کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر خدا کا وجود، مقصد حیات و کائنات، حیات بعد الموت، وقت کی حقیقت و فطرت، روحانی قوتوں اور ان کے تفاعلات (ایک دوسرے پر اثر انگیزی) وغیرہ کی معرفت کو ان ذرائع سے حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔ یہ وہ سوالات ہیں جن کا سائنس کے ذریعہ بھی کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا، اس کی معمولی وجہ یہ ہے کہ ہمارے حواس خمسہ ان سوالات کے سلسلہ میں مثبت یا منفی رائے کی تشکیل کے لیے قابل مشاہدہ مقدمات فراہم نہیں کرتے۔ سائنس صرف یہ کہہ سکتی ہے کہ ان ناقابل مشاہدہ اشیاء کے اثبات یا نفی کے لیے اس کے پاس کوئی علم و اطلاع موجود نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ سائنس کے لیے ان سوالات میں سے کسی کی نفی اسی طرح بے باکانہ ہوگی جس طرح ان کا اثبات و اعتراف۔ تاہم یہ نظریات انسانی وجود میں ایک تخلیقی کردار ادا کرتے ہیں۔ وہ انسان کے اندر انسانی وجود کی تکمیل کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ اوٹو کا کہنا ہے کہ مذہب "مقدس" کا مظہر ہے، جو نامعلوم یا پُراسرار ہے اور مذکورہ بالا سوالات کا جواب دے سکتا ہے اور اسی لیے یہ تمام مذاہب کا ایک لازمی جزو ہے۔ دوسرے علماء مثلاً ایلیڈ، بوبر اور پال ٹلچ کے افکار میں بھی ہم کو ایک ملتی جلتی صورت حال نظر آتی ہے۔ اوٹو کے نظریہ "مقدس (Holy) ایلیڈ کے متبرک (Sacred)، بوبر کے "من۔تو" (I-Thou) اور پال ٹلچ کے پیش کردہ مختتم یا آخری (Ultimate) میں قریبی نسبت اور تعلق ہے۔ مذاہب عالم کے ان علماء نے اپنے تجزیہ میں ان مشترک عناصر کی نشاندہی کی ہے جو تمام مذاہب کو باہم جوڑتے ہیں۔ "مقدس" کی معرفت، متبرک اور غیر متبرک کا "من۔تو" کا تعلق و رشتہ نیز اعتقاد کے تاثرات مل کر مختلف مذاہب کے اساسی روحانی رشتہ قرابت کو تشکیل دیتے ہیں۔ لیکن یہ کہنا غلط ہوگا کہ متذکرہ بالا مشترک عناصر کے روحانی ادراک کے معاملہ میں مختلف مذاہب کا تاثر یکسانیت کا حامل ہے۔

مثال کے طور پر "مقدس" اور "من۔تو" کے رشتہ کے تصور کو لیجیے۔ ہندو نقطۂ نظر سے اساسی حقیقت "برہما" میں مضمر ہے جو غیر شخص، غیر متعین اور غیر محدود ہے۔ وہ "نرگن" ہے یعنی اس کی ذات بے صفات ہے۔ Brihadaranyaka Upnishad میں وہ "نیتی نیتی" یعنی کچھ نہیں ہے۔ جسے بعد میں شنکر کے "ادوائتا وادنتا" فلسفیانہ نظام کی اساسی حقیقت کا نام دیا گیا ہے۔ دوسرے

مشہور مکتب فکر رامانوجے کی پیش کردہ لاثنویت کو آخری حقیقت مانا گیا ہے اور اس کو وشنو کی شخصیت میں ہستی مطلق، عالم مادی سے ماورا اور اس کے نفسیات سے بری اور محیط کل دیوتا کی شکل دی گئی ہے۔ لیکن اس کو تری مورتی کی شکل میں بھی مجسم کیا جاتا ہے جو ایک مستقل دیوتا نہیں ہے، بلکہ اس کی پوجا کسی بھی شکل میں یا کسی بھی نام سے کی جا سکتی ہے۔ جین مت نے اس اساسی حقیقت کو زندگی (جیو) کی فطری لافانی حیثیت سے تعبیر کیا ہے، اس کے عقائدی نظام میں اعلیٰ وجود یا خدا کے لیے کوئی جگہ مقرر کرنے کے بجائے زندگی کے ہمہ بین شعور کو درجہ دیا گیا ہے۔ بہر کیف ہندو مت کے دیوتا جین مت کے ماننے والوں کے نزدیک قابلِ قبول ہیں۔ لیکن ان دیوتاؤں کو پوجا کے رسوم میں ماتحت درجہ دیا گیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انہیں بھی "مکتی" کی ضرورت ہے جو صرف پوجا کے رسوم کے ذریعہ ہی حاصل کی جا سکتی ہے۔ بُدھ مت نے بھی "حقیقت منتہم" کے خیال کو تسلیم نہیں کیا، بلکہ اس کے بجائے ایک متحرک مادیت اور خانقاہی صوفیانہ زندگی کی تائید و حمایت کی، اور ذاتی کوششوں کے ذریعہ نجات اور روح کی مکتی کا راستہ اختیار کیا۔ موکش (Moksha) کا ہندوانہ تصور جین مت اور بدھ مت کے نظریات سے ملتا جلتا ہے اور حقیقت منتہم کے ساتھ روح انسانی کے اتحاد کو اپنا مطمح نظر بناتا ہے۔ چاروں ذاتیں (Varnas) مختلف راہوں سے موکشی کی حقدار ہیں۔ لیکن اپنے مخصوص سماجی مقام، لیاقتوں اور شخصیت کی انواع کے اعتبار سے موکشی کی تلاش کے لیے مختلف راستے انہیں اختیار کرنا ہوں گے۔

سامی الاصل مذاہب یعنی یہودیت، نصرانیت اور اسلام میں حقیقت دو کلی اقسام پر مشتمل ہے۔ خدا اور غیر خدا۔ خالق اور مخلوق، پہلی قسم کا ایک ہی فرد ہے، جو قائم بالذات اور قادر مطلق ہے، اور علت العلل ہے۔ صرف وہی خدا ہے جو ابدی، خالق، اور عالم مادی سے ماورا ہستی مطلق ہے۔ وہ ابدی طور پر مکمل، منفرد اور شریک و سہیم سے مبرا ہے۔ حتیٰ کہ عیسائی بھی جو تثلیث پر ایمان رکھتے ہیں، یہ اقرار کرتے ہیں کہ خدا ایک ہی ہے، اور اپنے گرجوں میں یہ دعا پڑھتے ہیں: "میں خدا پر ایمان رکھتا ہوں، باپ قادر مطلق ہے، اور آسمان اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے" تثلیث میں اصلاً باپ، بیٹے اور روح القدس ایک ہی خدا کے اجزا ترکیبی ہیں۔ دوسرا درجہ زمان و مکان اور تجربہ و تخلیق کا ضابطہ ہے جس میں تمام مخلوقات، عالم اشیاء، نباتات و حیوانات، نوع انسانی، آسمان و زمین اور جنت و

دو زمرے شامل ہیں۔ خالق اور مخلوق کا مرتبہ واضح طور پر اور مطلقاً الگ ہے جس حد تک ان کا وجود یا علم حقیقۃ الاشیاء اور ان کے کام کا تعلق ہے۔ یہ ابدی طور پر ناممکن ہے کہ ایک دوسرے سے مخلوط، گڈمڈ یا ایک دوسرے میں نفوذ کر سکیں، خالق کو وجودی لحاظ سے مخلوق میں تبدیل کرنا ممکن نہیں ہے، اور نہ ہی مخلوق کو مادیات سے بری اور جسم و شکل سے ماوراء قرار دیا جا سکتا ہے، جو کسی بھی راہ سے یا کسی بھی معنی میں خالق بن جائے۔ انسان ہی صرف وہ مخلوق ہے جس میں خدا کا ارادہ دوسری مخلوقات کی طرح غیر ارادی طور پر عمل پذیر نہیں ہوتا، بلکہ اس کے لیے انسان کی اپنی ذاتی رضامندی ضروری ہے۔ خدا نے، جو مخیر، کریم اور صاحب ارادہ و مقصد ہے، انسان کو بیکار یا تفریح کے لیے پیدا نہیں کیا۔ خدا نے انسان کو عقل و خرد سے آراستہ کیا، اس کو کامل بنایا اور عمل کا ذمہ دار بنایا۔ قیامت کا دن یعنی ذمہ داری منزل مقصود تکمیل، اخلاقی پابندی اور اخلاقی لزوم و تحکم کا لازمی نتیجہ ہے۔

خدا کی اطاعت یہ ہے کہ اس کے احکام کو محسوس کیا جائے، اور عملی جامہ پہنایا جائے، اس کے حکم کو عملاً نافذ کرنا آخرت میں آخری کامیابی، خوشی و آرام سے سرفراز ہونا ہے۔ ایسا نہ کرنا یعنی اس کی نافرمانی کرنا، سزا، تکلیف، رنج و الم اور ناکامی کے روحانی تکالیف کو اپنے اوپر عائد کرنا ہے۔

حقیقت مختتم اور انسان سے اس کے تعلقات پر اس مختصر بحث سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ مختلف مذاہب کے تصوراتی اختلافات لازمی طور پر ایک والتن شونگ (Weltanschauung) نظریہ وحدت کائنات و حیات پیش کرتے ہیں جن کا فلسفہ حیات بھی مختلف ہے۔ ایمان کا فرق و اختلاف، مذہب، عقائد، عبادت کے طریقوں، رسوم و اطوار، سماجی تنظیم و تشکیل اور زندگی کے دیگر پہلوؤں اور راہوں کے فرق و اختلاف میں منعکس ہوتا ہے۔ کچھ تھیاسوفی (محض وجدان سے خدا کے علم حاصل کرنے کے نظریہ کے قائلین)، بہر حال ان اختلافات و فروق سے تجاہل برتتے اور صرف نظر کرتے ہیں اور صوفیانہ باطنی تجربات کی ظاہری یکسانیت کی بنیاد پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ تمام مذاہب ایک اور یکساں ہیں، لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے اور اکثر اوقات غلط فہمی کا سبب بن جاتی ہے، اگر کسی مذہب کے ماننے والے ان کے اس نظریہ کی تردید کرتے ہیں تو پھر انہیں غیر روادار اور بنیاد پرست کا لقب عطا کیا جاتا ہے۔ حقیقی بات تو یہ ہے کہ صوفیوں اور ارباب باطن کے روحانی تجربات کسی ایک

مذہب کے احاطہ اور دائرہ میں بھی لازماً مماثل اور بعینہٖ یکساں نہیں ہوتے۔ ڈاکٹر رادھاکرشنن نے جو صوفیت کو مذہب پر ترجیح دیتے ہیں اور اس کو روحانی ترقی کا بہترین طریقہ سمجھتے ہیں، یہ تسلیم کیا ہے کہ روحانی تجربات کی داخلی یکسانیت کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ان میں مکمل یکسانیت ہے، ان کے وسیع دائرے میں انفرادی اختلافات بھی ہوتے ہیں، مشرق میں مثلاً اپنشید، بھگوت گیتا، شنکر، رامانوجا، رام کرشن، جین مت، بدھ مت اور جلال الدین رومی کے روحانی تجربات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اسی طرح مغرب میں افلاطون، پال، پروکلس، تاؤلر، پلاٹینس اور راکھارت کی عارفانہ تحقیقات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اختلافات اور تضادات، نسل، آب وہوا یا جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے ہی نہیں ہوتے۔ مختلف روایات اور رجحانات وثقافت یا نسل کے حامل لوگوں کے روحانی تجربات ایک ہی دائرہ میں رہتے ہوئے مختلف ہوسکتے ہیں۔ باطنی تجربات کے اختلافات سے قطع نظر متصوفین اور ارباب باطن اتحاد مذاہب کی بنیادیں استوار کرنا تو دور رہا، خود بھی ہمیشہ کسی ایک مذہب، روحانی یا اخلاقی نظام سے وابستہ رہے ہیں۔ اور آج تک کسی مثبت مذہبی عقیدہ یا اخلاقی نظام کی تشکیل نہیں کر سکے ہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مختلف مذاہب میں کوئی چیز بھی مشترک نہیں ہے۔ سچائی کی تلاش میں ان کے اختلاف کے باوجود "انسانیت" کے بنیادی اقدار پر سب مذاہب متفق ہیں، جیسے سچائی، انصاف، وفاداری اور وفاشعاری کی تعلیم سبھی دیتے ہیں، جھوٹ، ظلم، بے وفائی، اور شیطانی حرکتوں سے ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں، سارے مذاہب کریم النفسی، رحم دلی، اچھائی اور سخاوت و فراخدلی کو پروان چڑھاتے ہیں اور جلا بخشتے ہیں، سارے مذاہب خودغرضی، مظالم پسندی، حرص وطمع اور کمینگی و دون ہمتی کی مذمت کرتے ہیں ___ استواری وثابت قدمی، نفس پر قابو اور شیریں مزاجی کو صاد کرتے ہیں، تمام مذاہب نظم وضبط، تعاون، دوستی اور سماجی انصاف کی تعلیم دیتے ہیں، مگر جرائم اور گناہ کو ناپسند کرتے ہیں۔ تمام مذاہب اپنے متبعین میں "حقیقت مختتم" کا شعور پیدا کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ پرہیزگار، کریم النفس، فیض رساں، مہرباں، رحم دل اور روادار بن سکیں۔ تمام مذاہب میں یہ قدریں مشترک ہیں، کوئی مذہب یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ یہ قدریں اس کی ملکیت ہیں، ساتھ ہی ساتھ یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ کسی بھی مذہب کے پیروکار کے لیے یہ اقدار اس لیے قابلِ یقین ہوتی ہیں،

کہ وہ اس کے اپنے ایمان کی بنیادوں سے ماخوذ ہیں۔ ایک بار جب وہ ان بنیادی حقیقتوں کو جوان اقدار کو جواز و حلت یا جزا و سزا بخشتی ہیں، خیرباد کہہ دیتا ہے تو پھر اس شخص کے لیے ان سے وابستہ رہنا دشوار ہوجاتا ہے۔ خصوصاً ان حالات میں جب کہ ان اخلاقی اقدار میں سے کوئی چیز اس کے لیے تکلیف دہ اور ذاتی مفاد کے خلاف ہو۔ یہ تو ایمان ہی کی طاقت ہے جو افتاد اور فلاکت میں بھی ثابت قدم رہنے کا حوصلہ عطا کرتی ہے اور مشکلات و مصائب میں بھی ان اخلاقی قدروں پر ثابت قدم رہنے کی ہمت بخشتی ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ بنیادی مبادیات کسی ایک مذہب کے ساتھ خاص نہیں ہیں، کیونکہ مخصوص تصورات کے بغیر کسی بھی سماجی فلسفہ کی تشکیل و تکوین نہیں کی جاسکتی۔ یہ بنیادی تصورات ہی تو ہیں جن پر اس کی پوری عمارت کھڑی ہوتی ہے۔

بنیادی تصورات سے وابستگی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان لوگوں کو برداشت نہ کیا جائے جو اس فلسفۂ حیات سے اتفاق نہ کریں اور اس کے قائل نہ ہوں۔ مذہب میں رواداری اس یقین سے پیدا ہوتی ہے کہ مذاہب کی رنگارنگی تاریخی حالات اور اثرات کا نتیجہ ہے۔ اس طرح یہ عقیدہ مقابلہ اور جوابی کارروائی کو مختلف مذاہب کی ابتدا و ارتقاء کے عالمانہ جائزہ و تحقیق میں تبدیل کردیتا ہے اور مذہب کی اصل شکل کو اس کے تاریخی الحاقات و زوائد سے پاک کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ دینی و اخلاقی فلسفوں کے مقابلہ میں سماجی فلسفوں میں بنیاد پرستی مزاحمت کی شکل اختیار کرسکتی ہے کیونکہ اکثر ان کے دائرہ اثر اور دلچسپی میں تصادم ہوسکتا ہے۔ لیکن مذہب میں ایسا نہیں ہے۔ اس کی ساری دلچسپی فرد کی اصلاح اور نفس کی رفعت تک محدود ہے۔

اب ہمیں تاریخ پر بھی ایک نظر ڈال لینا چاہیے، ہمیں یورپ کی تاریخ کو خاطر میں لانے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ مغربیوں کے برخلاف مشرقیوں کے یہاں مرکزی گرجا یا مذہبی جبر و عقوبت کی روایت نہیں رہی ہے۔ عہد وسطیٰ میں جب مغرب نام نہاد غیر آرتھوڈکس عقائد اور رسوم پر عمل پیرا نہ ہونے والوں کو سزا و عقوبت دینے میں مشغول تھا اور مذہبی عدالتیں ایسے لوگوں کے لیے سخت جسمانی تکلیفیں پہنچانے کے لیے قائم کی جارہی تھیں جن کے ذریعہ ملزموں کی آخری سزا زندہ جلا دینے کی صورت میں دی جارہی تھی، اس وقت میخائل دی الڈر نے جو انطاکیہ کا یعقوبی بطریق تھا، اسلام کی رواداری کے بارے میں ان الفاظ میں اعتراف کیا تھا: یہی وجہ ہے کہ خدائے انتقام نے ادیبوں کی شرارتوں کو دیکھتے

ہوئے جنھوں نے اپنے اقتدار کے بل پر ہمارے گرجوں اور خانقاہوں کو تاخت و تاراج کیا، اور بے رحمی کے ساتھ ہمیں ذلیل کیا ـــــــ جنوبی خطہ سے بنی اسماعیل کو ہمیں نجات دلانے کے لیے بھیج دیا۔"

اسی زمانہ میں ہندوستان میں "حقیقت مختتم" کی تلاش میں رام نوجا اور رغبار کا عوام کے ذریعہ بھگتی کی تحریک کا آغاز کیا گیا۔ بھگتی کے علمبرداروں میں مہادیو، راما نند، چیتنیہ دیو، کبیر، گرونانک اور دوسرے بہت سے لوگ تھے، جنھوں نے لوگوں کو صحیح طور پر ہندو فلسفہ اور ہندو مذہب کو سمجھنے کی دعوت دی۔ ان کے دل انسانی ہمدردی سے لبریز تھے۔ اور ان کا نصب العین ہندو مت کی اصلاح، خدا اور بندے کے درمیان بلاواسطہ تعلق پیدا کرنا، قوم کے اخلاقی معیار کو بلند کرنا اور ہندو اور مسلمان کے درمیان خلیج کو پُر کرنا تھا۔

یہ معلین عالم گیر انسانی اخوت قائم کرنے کے لیے اٹھے، انھوں نے مذہبی رسم و رواج کی پابندی اور استحصال پر تنقید کی، دوسری طرف سلسلۂ چشتیہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، قطب الدین بختیار کاکیؒ، نظام الدین اولیاؒ، بابا فرید گنج شکرؒ اور سلیم چشتی کے ذریعہ عوام کو قرآن و سنت کے بتائے ہوئے راستہ کی اقتدا کرنے اور مکمل اخلاص کے ساتھ خدا کی اطاعت و بندگی کی دعوت دے رہا تھا۔ اس رجحان کا اظہار حضرت نظام الدین اولیاؒ کے اس قول سے ہوتا ہے۔ جب انھوں نے کچھ لوگوں کو بتوں کی پرستش کرتے دیکھا، تو انھوں نے کہا: "ہر قوم کی اپنی راہ، اپنا مذہب اور اپنا مکہ ہے"۔ اپنے مرید نصیر الدین چراغ دہلی کو مشورہ دیتے ہوئے انھوں نے کہا تھا: "لوگوں کے مظالم اور اذیتوں کو برداشت کرتے ہوئے ان کے ساتھ زندگی بسر کرو۔ محبت کریم النفسی اور رحم دلی سے جواب دیتے رہو۔" پروفیسر حبیب لکھتے ہیں کہ غیر مسلموں کو تبدیل مذہب کرانا سلسلۂ چشتیہ کے مشن کا کوئی جزو نہیں تھا۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے جو آٹھویں صدی کے ہندوستان کے صاحب کمال عالم دینیات مانے جاتے ہیں، اور ہندوستان میں احیاء و تجدید کی تمام اسلامی تحریکوں کے پیش رو سمجھے جاتے ہیں، یہ کہا تھا: "دین تو صرف ایک ہے، باقی اختلافات و فروق شریعت اور قوانین سے تعلق رکھتے ہیں۔"
مشہور ہندوستانی وہابی تحریک کو شمالی مغربی سرحدوں میں اپنے ہیڈ کوارٹروں تک ہندوستان

[illegible] کی بہم رسانی میں ہندوؤں کی سرگرم امداد حاصل رہی۔ ۱۹۱۵ء تک وہاں یہ محاذ گرما رہا۔
گوالیار کے مہاراجہ اس تحریک کے ہمدردوں میں سے تھا۔ دیوبند مکتب فکر کے دو نصب العین تھے:

۱۔ مسلمانوں میں قرآن وحدیث کی خالص تعلیمات کی تبلیغ کی جائے۔

۲۔ ہندوستان سے غیر ملکی حکمرانوں کو نکالنے میں ہندوؤں سے تعاون لیا جائے۔

ہندو اور مسلمانوں میں کسی قسم کے تصادم و ٹکراؤ سے دور رہ کر ان حقیقی دینی تحریکوں نے دونوں قوموں کے درمیان دوستی اور تعاون کو فروغ دیا اور جلا بخشی۔

اب اگر کسی مذہب کے اصول وعقائد سے وابستگی دوسرے مذہب کے پیروکاروں سے کشیدگی اور بیگانگی کا سبب نہیں بنتی، تو پھر مذہب کو اس کے لیے کیوں ملزم ٹھہرایا جاتا ہے؟ ہمیں اس کے حقیقی اسباب کی تلاش کرنا چاہیے۔

ا۔ اولین سبب سیاسی مقاصد کے لیے مذہب کا غلط استعمال ہے۔ تاریخ ہمارے سامنے بہت سی مثالیں پیش کرتی ہے جب خدا کے سچے انسانوں کے سامنے دولت اور طاقت کی پیش کش کی گئی تو انھوں نے کچھ بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مؤرخ ضیاء الدین برنی لکھتا ہے:

> "فیروز شاہ نے شیخ قطب الدین کی خدمت میں ایک لاکھ تنکہ ارسال کیے، مگر شیخ نے جواب دیا: "دو سیر چاول اور ایک دانگ گھی ہی مجھ جیسے درویش کے لیے کافی ہے۔"

جب علاء الدین خلجی نے خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی خدمت میں حاضری دینے پر اصرار کیا تو خواجہ نے یہ پیغام بھیجا:

> "میرے گھر میں دو دروازے ہیں، بادشاہ اگر ایک دروازہ سے داخل ہوگا تو میں دوسرے دروازے سے نکل جاؤں گا۔"

ان نفوس قدسیہ اور خدا رسیدہ اشخاص کے برعکس بہت سے لوگ ہیں جو طاقت اور شکوہ حاصل کرنے کے لیے لوگوں کے دینی جذبات کو مشتعل کرتے ہیں۔ تقسیم ہند سے قبل مسلم لیگ کے لیڈروں کا مسلمانوں کی بہبود اور ان کے مفاد کی حمایت اور جمعیۃ العلماء کے دینی علماء کا کردار جو مسلمانوں کے مذہبی خیال کی سچی نمائندگی کر رہے تھے، زمانہ قریب کی تاریخ کا واقعہ ہے۔ یہ کوئی

مقامی مظہر نہیں ہے۔ جرمن نازیت، عیسائیت کی تعلیمات کی ایسی ہی مخالف تھی جیسی یہودیت کے خلاف صیہونیت۔ اموس الون (Amos Alon)، جو خود یہودی ہے، اپنی کتاب (The Israelis : Founders and sons) میں لکھتا ہے:

"ان کا برتاؤ اکثر و بیشتر کھلے عام اور بعض اوقات حماقت آمیز طور پر ربانیوں (یہودیوں کے فقہاء و علماء یا ربانونیت) کے خلاف تھا۔ ۱۹۲۰ء کے شروع میں نوجوان الحاد پرست رہنماؤں کا گروہ کفارہ کے دن سور کے گوشت کھاتے ہوئے دیوار گریہ کی طرف گیا تھا۔ بن گورین نے نیویارک میں غیر مذہبی طریقہ سے اپنی بیوی پاؤلا سے شادی کی، اس نے بعد میں شادی کی مذہبی تقریب پر عمل کرنے سے انکار کر دیا۔ اس بعد بھی وہ اپنے آپ کو یہودی مفاد کی حمایت کرنے والا ظاہر کرتا رہا۔ اس قسم کی قیادت اپنے آپ کو اپنی قوم و ملت کی محافظ اور اس کی ناصر و حامی ہونے کا دعویٰ کرتی ہے اور مسلسل یہ اعلان کرتی رہتی ہے کہ ان کے ہم مذہب محاصرہ کی حالت میں ہیں۔ ان میں سچائی اور انصاف کا احترام نہیں ہوتا۔ ہاں وہ دوسروں کے یہاں ضرور غلطیاں تلاش کرتے ہیں۔ وہ مخالف و رقیب ملت پر الزام تراشی اور بدنامی کے لیے پیہم مہم جوئی میں سرگرم رہتے ہیں۔ وہ اپنی قوم کی اچھی وکالت کرنے والے تو ہو سکتے ہیں لیکن خود اپنے لوگوں کو غلط اطلاعات دے کر اور ان کی رائے کو فاسد اور آلودہ کر کے گمراہ اور غلط رہنمائی کا کام بھی انجام دیتے ہیں۔ فطرۃً وہ اپنے آپ کو آزاد خیال ظاہر کرتے ہیں اور اپنے مخالفین کو بنیاد پرست یا قدامت پسند، جن کی باتیں سنے جانے تک کی قابل نہیں! واضح طور پر یہ سیاست میں مذہب کی دخل اندازی کے برعکس مذہب میں سیاست کی بیجا دخل اندازی کا معاملہ ہے۔"

۲۔ سیکولرازم کی بنیاد تمام جمہوری ممالک میں تمام مذاہب کے لیے مساوی احترام پر ہے۔ ہندوستان، برطانیہ، فرانس، ریاست ہائے متحدہ امریکہ، کناڈا وغیرہ۔ لیکن بہرحال ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو ان ممالک کو "عوامی جمہوریتوں" میں تبدیل کرنا پسند کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ سیکولرازم نہ صرف زندگی کے سیاسی اور معاشرتی پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے بلکہ ثقافتی اور اخلاقی پہلوؤں کو بھی محیط

ہے۔ ان کے خیال میں سارے مذاہب زندگی کا ایک تعریبی نقطۂ نظر رکھتے ہیں لہذا اس کا مقام ان کے اپنے فلسفۂ حیات کو حاصل ہونا چاہیے۔ حالانکہ یہ فلسفۂ حیات بھی فی نفسہٖ فریب ہی ہوتا ہے۔ اور مذہبی اعتقاد کی طرح چند مخصوص مفروضوں پر مبنی ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ لوگ تمام مذاہب کو حقیر سمجھتے ہوئے ہر مذہب کے پیرکاروں پر بنیاد پرستی کی مہر ثبت کرنے میں کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اور جب بھی کوئی موقع ان کے ہاتھ آتا ہے تو وہ تمام مذاہب کو منسوخ کر کے اپنا نظریہ رائج کرنا چاہتے ہیں ــــ!

۳۔ بنیاد پرستی کی اصطلاح کے ذریعہ موجودہ زمانے کے کچھ سماجی فلسفے اپنا حلقۂ اقتدار سیاست اور معیشت سے بڑھا کر مذہب اور اخلاق تک وسیع کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی نظر میں زندگی لمحہ بہ لمحہ تغیّر پذیر ہے، زندگی حرکت کا نام ہے اور حرکت کے ساتھ انسانی معاشرت، سیاست اور معیشت کے ساتھ ساتھ اخلاقی اور مذہبی تصوّرات میں بھی تبدیلی ناگزیر ہے، لہذا اخلاق و مذہب کو بھی ان سماجی فلسفوں کے مطابق اپنے آپ میں تبدیلی پیدا کرنے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ یہ عصری سماجی فلسفے یہ بات قطعاً نظر انداز کر دیتے ہیں کہ جس طرح وہ ایک مخصوص نظریہ حیات کے مبلغ ہیں اسی طرح مذاہب بھی زندگی کا اپنا نظریہ رکھتے ہیں اور اس حیثیت سے انہیں مذاہب پر کوئی برتری حاصل نہیں ہے اور نہ انھیں اس کا کوئی حق پہنچتا ہے کہ انسانی زندگی کے متعلق دوسرے نظریات کو اپنی قدروں، اعتقادات و اعمال میں تبدیلی لانے پر مجبور کر سکیں۔ وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ زندگی میں حرکت و تبدیلی خارجی سطح پر واقع ہوتی ہے اور ماحول کو متاثر کرتی ہے جب کہ داخلی طور پر انسان آج بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ ابتدا میں۔ خوشی، غم، مسرت، محبت، نفرت، حُسنِ اخلاق، رحم، مروت، بے رحمی، ظلم جیسے جذبات و احساسات میں آج تک کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے، اور اگر کہیں کوئی تبدیلی بظاہر نظر آتی ہے تو وہ موجودہ سماجی ڈھانچے میں بے اعتدالی اور فطرتِ انسانی سے بغاوت کا نتیجہ ہے۔ مثال کے طور پر مغرب کے کچھ ممالک نے امرد پرستی اور محرمات کے درمیان جنسی تعلقات کو قانونی جواز عطا کر دیا ہے، لیکن ہر صحیح الخیال شخص تسلیم کرے گا کہ ان افعال قبیحہ کا رواج سماجی گراوٹ اور بد اخلاقی کے عام ہونے کا نتیجہ ہے اور اس سے بہ حیثیت مجموعی انسانی معاشرہ کو نقصان ہی پہونچتا ہے۔ آفاقی اخلاقی اقدار و نظریات کی روشنی

میں ان خرابیوں کو غلط روی سمجھتے ہوئے اُن حالات میں تبدیلی کا مطالبہ کرے گا جن میں یہ خرابیاں پروان چڑھتی ہیں۔

۴۔ انصاف اور سبھوں کے ساتھ مساوی اور یکساں برتاؤ جمہوریت کی اصل روح اور جوہر ہے۔ لیکن کچھ ایسے بھی لوگ ہیں جو مختلف اسباب کی بنا پر اپنے آپ کو دوسروں کے مقابلہ میں "زیادہ مساوی" سمجھتے ہیں، اگر ان کے ساتھ کیا گیا برتاؤ کمزور یا پست ذات کے ساتھ مساویانہ ہوتا ہے تو اس سے ان کی "انا" مجروح ہوتی ہے۔ وہ اپنا یہ پیدائشی حق سمجھتے ہیں کہ انھیں اپنی خواہش کے مطابق برتاؤ سے سرفراز کیا جائے، اکثر وہ اپنے مصالح کو حاصل کرنے میں حکومتوں کو مجبور کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اپنے ساتھ ناانصافی کا برتاؤ ہونے پر پسماندہ عوام میں آکر آزردگی اور ناراضگی کا اظہار کرتے ہیں تو یہ حضرات ان پر جسارت آمیز گستاخی اور بے ادبی کا الزام عائد کرتے ہیں اور یہ واویلا مچاتے ہیں کہ یہ دوسروں کے ساتھ انصاف اور مساوات بنیاد پرستوں کی ڈھارس اور تشفی کے لیے ہے ـــ جو ان کی نظروں میں ناقابل معافی گناہ ہے۔

۵۔ یہ واقعہ ہے کہ جہاں بھی اقلیتوں کا وجود ہے، اکثریت کا مذہب، ثقافت انھیں ہضم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ کسی قوم کی صحت مندی اور توانائی کی یہ ایک علامت ہے کہ وہ اپنے آپ کو وسیع کرنے کی فکر کرے اور مختلف ثقافتوں کو جذب کرنے کی کوشش کرے۔ ایسا کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ وہ ان تمام انسانوں کے سامنے سچائی کو بے لاگ اور صاف طریقہ سے پیش کر دے کیونکہ تمام انسان سچائی کو محسوس کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس کے برخلاف استبداد سے کام لینا، دروغ بیانی اور حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا کمزوروں کی علامت ہے جو اس کے اپنے فلسفۂ حیات، اخلاقیات اور مشن میں خود اعتمادی کے فقدان کو ظاہر کرتی ہے۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ جو اشخاص اپنے نظام زندگی کی برتری کو ثابت کرنے کے لیے خود اعتمادی اور قابلیت رکھتے ہیں وہ وہی مردانِ خدا ہیں جو محض تعداد بڑھانے یا دوسروں پر بالادستی حاصل کرنے کے لیے یا دوسروں کو جذب و ہضم کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے، اور وہ کم ظرف اشخاص جو اس معاملہ میں سرگرم رہتے ہیں، ان کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ دوسروں کو رجعت پسند، ظلمت پسند اور بنیاد پرست سے متہم کرتے رہیں!

۶۔ ہر قوم، برادری، مذہبی فرقہ یا گروہ کا طبعی میلان اور رغبت یہ ہوتی ہے کہ اپنے مذہبی، ثقافتی

اور نسلی تشخص کی بقا کی تدبیر کی جائے اور اس کی حفاظت کی جائے۔ اس میں اس حد تک کوئی غلط بات نہیں ہے جب تک کہ یہ انتہائی تنگ نظری اور جنگ جویانہ فرقہ پرستی میں تبدیل نہ ہو جائے۔ نوع انسانی کی حیرت انگیز و حیران کن گوناگونی اور اختلاف کے پیچھے لاینفک انسانی فطرت کارفرما ہوتی ہے، مذہب و تمدن کی گوناگونی مجموعی طور پر حسن اور رنگ و آہنگ میں اضافہ کرتی ہے۔ لیکن جب اس کا منظر گم ہو جائے یا ظاہری رواداری حقیقی ہونے کے بجائے مشروط ہو تو پھر اس کا ناگزیر نتیجہ بے آہنگی اور بنیاد پرستی کا جھوٹا اتہام اور الزام تراشی ہی ہوگی۔

کسی عقیدہ یا دھرم سے پُرجوش و پُرشوق وابستگی دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان دوستی تعاون اور سماجی ارتباط کی راہ میں حائل نہیں ہوتی۔ کسی بھی مذہب کا کوئی سچا پیرو کار اطاعت و بندگی کی تعریف کر سکتا ہے خواہ یہ ان معبودوں کی نذر کی جارہی ہو جن پر اس کا ایمان نہیں ہے غیر آہنگی اور کشیدگی کا خطرہ اس وقت سر اٹھاتا ہے جب لوگ انسانی ذہن کے اس تنوع کے امکان کو محسوس کرنے میں ناکام ہو جاتے ہیں جس کا عکس قوم و ملت کے اختلاف کی شکل میں جلوہ گر ہوتا ہے اور سماجی ڈھانچہ پر اثر انداز ہو کر انھیں مختلف شخصیت عطا کرتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک گروہ اپنی مخصوص روایات اور طریقۂ عمل کے احاطہ میں خود مختار ہوتا ہے۔ لیکن سماج کے ایسے ہر گروہ یا ملّت کو اپنے احاطۂ اختیار میں مداخلت اسی طرح ناپسندیدہ ہوتی ہے جتنی اس کے ذریعہ دوسروں کی آزادی میں خلل اندازی۔ ایسا ہر طبقہ، گروہ یا ملّت فطری طور پر اپنی اندرونی آزادی کو برقرار رکھنے پر مصر ہوتی ہے اور اس کو اس یقین دہانی اور ضمانت کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس کے داخلی معاملات میں کسی قسم کی دخل اندازی نہیں ہوگی۔ خصوصًا ان معاملات میں جن کا تعلق ایمان و عقائد سے ہے۔ یہ رجحان فطری طور پر تحفظ و بقا پر مبنی ایک حیاتیاتی (Biological) رجحان ہے اس لیے جب قوم کے افراد جبلی طور پر یا دوسروں کے جارحانہ رویہ سے یہ محسوس کرتے کہ مدنی و اجتماعی زندگی کا وہ حصہ جس سے ان کا تعلق ہے خطرہ میں ہے تو ان کے دفاعی رجحان کا اندازہ حیاتیاتی معیار سے کرنا چاہیے۔

لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ حقیقی اور صحت مند رواداری کو فروغ دیا جائے۔ مذہبی تنوع کے ناگزیر ہونے کا احساس دلایا جائے اور یہ بتلایا جائے کہ ان میں سے ہر ایک کے لیے معاشرہ میں مناسب گنجائش موجود ہے۔ یہ وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

ادب کے گنجہائے گراں مایہ

ذرۂ خاک کا اقبال:

ایک دوسری جگہ اسی آب و گل کی قسمت وقیمت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شہباز محبت کو سینۂ آدمؑ کے سوا کوئی آشیانہ نہ ملا، آسمان کی بلندی اور عرش و کرسی کی وسعت سے گزرتا ہوا اس نے دلِ عاشق کو اپنا نشیمن بنایا، اسی بلاغت طراز قلم سے تحریر فرماتے ہیں:

"آب و خاک کو کم نہ سمجھو، جو کچھ کمالات ہیں آب و خاک ہی کے اندر ہیں، اور جو کچھ اس دنیا میں آیا ہے آب و خاک ہی کے ساتھ آیا ہے، اس کے علاوہ جو کچھ نظر آتا ہے نقش بدیوار سے زیادہ نہیں لکھنے والوں نے کہا ہے کہ شہباز محبت نے آشیانۂ عزت سے پرواز کی، عرش کے پاس سے گزرا عظمت دیکھی گزر گیا، کرسی پر پہنچا وسعت دیکھی گزر گیا، آسمان پر پہنچا رفعت دیکھی آگے بڑھ گیا، خاک پر پہنچا محنت دیکھی اتر آیا۔"

اس مضمون کو کسی شاعر عارف نے انسان کا ترجمان بن کر یوں ادا کیا ہے:

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ تو اس میں سما سکے

ایک دوسری جگہ انسان کا مرتبہ بیان کرتے ہوئے اور اس کے حال پر اس کے پیدا کرنے

والے کی نظرِ عنایت اور نگاہِ محبت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اے بھائی! خالق کا اس آب و خاک کے ساتھ خاص معاملہ اور خاص عنایات ہیں، ایک روایت میں آیا ہے کہ جب ملک الموت اس امت میں سے کسی کی روح قبض کرتا ہے تو رب العزت کی طرف سے ان کو خطاب ہوتا ہے کہ پہلے میرا سلام پہنچانا پھر رُوح قبض کرنا تم نے قرآن مجید میں پڑھا ہوگا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بے واسطہ مومنوں کو سلام کہے گا، فرماتا ہے: "سَلٰمٌ قَوْلاً مِّنْ رَّبٍّ رَّحِیْمٍ" لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، جس طرح اس کا کلام ازلی ہے، اس کا سلام بھی ازلی ہے، اگر اس مشتِ خاک کے ساتھ یہ قدیم نظرِ عنایت نہ ہوتی تو ازل میں اس کو سلام بھی نہ کیا جاتا۔ ایک شاعر نے اس مضمون کو بیان کیا ہے:

آنرا کہ ز محبوب سلامے باشد | وز حضرت او بدو پیامے باشد
در حلقۂ بندگانش خورشید منیر | قصّہ چہ کنم کم از غلامے باشد[1]"

سرِّ الٰہی کا حامل:

ایک دوسرے مکتوب میں انسان کی اشرفیت اس کے منصبِ خلافت اور اس کے علوِ ہمت کا راز یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ سرِّ الٰہی کا حامل اور نفخت فیہ من روحی کے شرف سے مشرف ہے، رسالت صحفِ آسمانی اور دولتِ دیدار اس کی خصوصیات ہیں فرماتے ہیں:

"حق تعالیٰ نے اٹھارہ ہزار عالم میں سے کوئی گروہ انسانوں کے گروہ سے زیادہ عالی ہمت نہیں پیدا کیا اور انسانوں کے سوا کسی گروہ کے متعلق یہ ارشاد نہیں ہوا کہ "نفخت فیہ من روحی" اور کسی گروہ میں پیغمبروں کو مبعوث نہیں فرمایا، اور نہ آسمانی کتابیں نازل کیں، اور نہ کسی گروہ کو

---

[1] مکتوب پنجاہ و یکم (۵۱)

سلام کہلایا، نہ کسی گروہ کو اپنے دیدار کی نعمت عطا فرمائی، وہ آدمی ہی تھے جو اپنی محبت کی قوت اور اپنی ہمت کی بلندی کی وجہ سے طاقتِ فراق نہیں رکھتے تھے، دنیا میں ان کے دل سے حجاب اُٹھایا اور عقبیٰ میں اُن کی آنکھوں سے پردہ اُٹھایا، اسی کا نتیجہ ہے کہ دنیا میں وہ اس کے سوا کسی کے طالب نہیں اور عقبیٰ میں اس کے جمالِ جہاں آرا کے سوا ان کی آنکھوں نے کچھ نہ دیکھا اور یہ سبق انھوں نے مکتب مازاغ البصر وما طغیٰ میں پڑھا تھا۔ کسی شاعر عارف نے خوب کہا ہے:

الا اے مرغ حکمت واں زمانے　　چو خواہی یافت بہ زیں آشیانے
پرواز معانی باز کن پر　　سرائے ہفت در را باز کن در
چوں تو بر سدرہے حضرت نشینی
تو باشی جملہ و خود را نہ بینی[1]

مسجود و محسود:

ایک دوسری جگہ انسان کا وہ مرتبہ بیان کرتے ہوئے جس کی وجہ سے وہ مسجود ملائک اور محسود خلائق بن گیا۔ تحریر فرماتے ہیں:

"میرے بھائی، جس چیز نے تم کو فرشتوں کا مسجود اور افلاک کا محسود بنا دیا ہے وہ بہت بڑی چیز ہے، انسان اپنے وجودِ خاکی میں کیسا ہی مکدّر ہو معنوی اعتبار سے ایسا منور و مقدس ہے کہ ملکوتی اثرات اور بشری اوہام، اس کی حقیقت دریافت کرنے سے عاجز و قاصر ہیں جب اس معنی کی شعاع جلوہ فگن ہوتی ہے ملائک حیران اور آسمان سرگرداں ہوتا ہے وہ تواضع سے سر بگریباں اور یہ ہیبت سے لرزہ براندام۔

---

[1] مکتوب پنجاہ وسوم (۵۳)

خواجہ فریدالدین عطارؒ نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے:

فرشتہ گر بہ بیند جوہر تو | دگر رہ سجدہ آرد بر در تو
نہ مسجود ملائک جوہر تست | نہ تاجے از خلافت بر سر تست
خلیفہ زادۂ گلخن رہا کن | بہ گلشن شو گدا طبعی رہا کن
بمصر اندر برائے تست شاہی | تو چوں یوسف چرا در قعر چاہے[1]"

دل آگاہ:

لیکن انسان اور نوع انسانی کی اشرفیت اور خصوصیت اس مضغۂ گوشت کی وجہ سے ہے جس کو دل کہتے ہیں اور دل کی قدر و قیمت اور زندگی و قوت اس جوہر کی وجہ سے ہے جس کو محبت کہتے ہیں۔ دل کے متعلق فرماتے ہیں:

"عرش پیدا کیا مقربین کے سپرد کیا، بہشت پیدا کی رضوان کو اس کا پاسبان بنایا اور دوزخ پیدا کی، مالک کو اس کا دربان بنایا، لیکن جب مومن کا دل پیدا کیا فرمایا، دل رحمٰن کی دو انگلیوں کے درمیان ہے۔[2]"

ایک دوسرے مکتوب میں دل کی وسعت و قوت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اگر کوئی چیز دل سے زیادہ عزیز اور قیمتی ہوتی تو اپنی معرفت کا موتی اسی میں رکھتا، یہی معنی ہے اس ارشاد کے کہ: نہ میرا آسمان مجھے سما سکتا ہے نہ میری زمین، اگر میرے لیے گنجائش ہے تو مومن بندہ کے دل میں، آسمان میری معرفت کا اہل نہیں، زمین اس بات کی متحمل نہیں، بندۂ مومن کا دل ہی ہے جس نے اس بوجھ کو اٹھایا، رستم کا گھوڑا بھی رستم کو اٹھا لیتا ہے، لیکن جلالِ الٰہی کا آفتاب جب پہاڑ پر جس سے زیادہ عالمِ اجسام میں زیادہ جمنے والی اور عظیم کوئی چیز نہیں، جب ایک بار چمکا، تو وہ بھی ریزہ ریزہ ہو گیا

---

[1] مکتوب پنجاہ و ششم (۵۶)، [2] مکتوب چہل و سوم (۴۳)

وجعلہ دکتا، تین سو ساٹھ مرتبہ مومن کے دل پر چمکتا ہے اور وہ "ھل من مزید" کا نعرہ لگاتا رہتا ہے، اور پکارتا رہتا ہے: الغیاث الغیاث پیاسا ہوں۔[۱]"

شکستہ تر، عزیز تر :

دل کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہر چیز ٹوٹ کر بے قیمت ہو جاتی ہے لیکن یہ جتنا ٹوٹا ہوا ہوتا ہے اتنا ہی بیش قیمت ہوتا ہے۔[۲] فرماتے ہیں :

"اے بھائی، ٹوٹی ہوئی چیز کوئی قیمت نہیں رکھتی مگر دل جتنا ٹوٹا ہوا ہوتا ہے اتنا ہی بیش قیمت ہوتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی ایک سرگوشی میں فرمایا کہ: "آپ کو کہاں تلاش کروں؟ — جواب ملا: میں اُن لوگوں کے پاس ہوتا ہوں جن کے دل میری وجہ سے ٹوٹے ہوئے ہوتے ہیں۔[۳]"

محبت کی فرمانروائی :

دل کا سرمایہ محبت ہے، اور محبت تمام عالم اور سارے زمانوں کو محیط ہے، اس عالم سے اس عالم تک اس کا سکہ رواں ہے۔ فرماتے ہیں :

"حدیث محبت تینوں زمانوں پر محیط ہے اوّل و آخر درمیان اسی کا دَور دورہ ہے محققین نے کہا ہے کہ یہ عالم اور وہ عالم سب طلب کے لیے ہیں، اگر کوئی کہے کہ وہ عالم، عالمِ طلب نہیں ہے، یہ ناممکن ہے۔ ہاں نماز روزہ نہیں ہوگا لیکن طلب ہوگی۔ روزِ قیامت تمام احکام پر قلم نسخ پھر جائے گا، لیکن یہ دو چیزیں ابدالآباد تک رہیں تک رہیں گی — الحب للہ والحمد للہ۔[۴]"

---

[۱] مکتوب سی و ہشتم (۳۸)

[۲] اسی کو اقبال نے اس طرح کہا ہے :

نہ بچا بچا کے تو رکھ اسے، ترا آئینہ ہے وہ آئینہ — جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

[۳] مکتوب ششم (۶) [۴] مکتوب چہل و ششم (۴۶)

علامہ عبد السلام الدرعی النّاصری کا سفرنامۂ حج

(۷)

الدھناء۔ الأبرقان۔ بدر

ینبع سے دن کے تین ساڑھے تین گھنٹے گزرنے کے بعد (قبل ظہر) قافلہ کا کوچ ہوا، گرمی اپنے شباب پر تھی، اور تاحد نظر ریت اور بالو تھی، شام ہوتے ہی سقائف پہنچ گئے مگر ٹھہرے نہیں، یہ دو پہاڑوں کے درمیان ایک وسیع میدان ہے جہاں ببول کے درخت لگے ہیں، کسی زمانہ میں یہاں ایک پھونس کا چھپر تھا، جس میں سرشام کوئی شمع روشن کردی جاتی تھی اور اس کو 'دار الحاج' کہتے تھے، مگر اب وہاں اس طرح کی کوئی چیز نہیں ہے بس ایک صحرا ہے جس میں پانی نہیں ہے، ہاں اس کے کنارے کہیں ایک کنواں ہے، جس کا علم صرف یہاں کے بدّوؤں کو ہے اور یہیں سے دھناء کا علاقہ شروع ہوجاتا ہے۔ اس کی بستیوں میں الخلصاء ہے جس کا ذکر قاموس میں ہے۔ الروض المعطار میں ہے کہ دھناء، یمامہ سے مکہ کے راستے میں واقع ایک ریگستان کا نام ہے، اس ریگستان کے طول کا علم نہیں، البتہ اس کی چوڑائی تین راتوں میں طے ہوتی ہے، ھجر سے چار میل پر ہے، اس کی وسعت ضرب المثل ہے۔ کہتے ہیں فلاں مقام دھناء سے بھی زیادہ وسیع ہے (اوسع من الدھناء)۔ العبدری نے لکھا ہے کہ دھناء ینبوع کے ضلع کا مقام، اس کے رہنے والے یا یہاں کی چیزوں کی نسبت "دَھَنی" اور "دھناوی" سے کی جاتی ہے، قاموس میں ہے کہ یمامہ وہ شہر ہے جہاں مسیلمہ کذاب نے نبوّت کا دعویٰ کیا تھا، یہ مقام بصرہ سے ۲۶ مرحلہ پڑتا ہے اور ھجر

یمن کا ایک قصبہ ہے، اور اسی نام کی ایک بستی مدینہ منورہ سے قریب بھی ہے[1]۔
اس مقام پر بھی بہت سے حجاج کا خیال ہے کہ وہ "انوار و تجلیات" کا مشاہدہ کرتے ہیں، خواہ ان کو کوئی روشنی نظر آئے یا نہ آئے، جب یہاں پر قافلہ پہنچا تو مصری حجاج نے زور زور سے کہنا شروع کیا" العادۃ، العادۃ[2] یا رسول اللہ" اور دعائیں کرنے لگے، درود وسلام پڑھتے رہے، اور آخر میں، جیسا مصری عوام کا معمول ہے باواز بلند کہا ' الفاتحۃ ' اور پوری رات اسی طرح گزار دی۔ عورتیں" ولا ویل" سے مسلسل اپنی مسرت کا اظہار کرتی رہیں[3]، اور ہر چہرہ پر شادمانی کے آثار نمایاں تھے اور بدر کی بستی میں پہنچنے اور اس کے قریب ہونے کی امید نے نئی امنگ دلوں میں بھر دی، اونٹوں کی چال میں بھی تیزی آ گئی، فجر سے پہلے 'دھناء' کے ریگستان میں قافلہ غلط راستے پر پڑ گیا تھا، اور تقریباً ایک فرسخ غلط سمت چلتے رہے، پھر اپنی صحیح سمت پر آئے تو 'الابرقان' کی بستی قریب آ گئی اور چاشت کے وقت ہم لوگ یہاں پہنچ گئے۔ الأبرقان کا محل وقوع بدر اور دھناء کے درمیان ہے، ایک طرف ریگستان ہے، دوسری طرف چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا سلسلہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں کسی زمانہ میں لوگ مختلف طریقوں پر مسرت کا اظہار کرتے تھے، اصحاب بدر کی فتح و نصرت پر طبلے بجاتے تھے۔
دو گھنٹے آرام کرنے کے بعد قافلہ نے بدر کی طرف رخ کیا، ہر حاجی کثرت سے درود

---

[1] مصنف سفرنامہ جس دھناء کا ذکر کر رہا ہے وہ نجد کے مشرق میں واقع ہے، اور بہت طویل و عریض ریگستان ہے، جس کے حدود میں یمامہ واقع ہے۔ جیزان کے علاقہ میں بھی ایک مقام کا نام الدھناء ہے، رہا وہ مقام جو بدر اور ینبع کے درمیان ہے وہ اب ویران ہو چکا ہے، بدائع الزھور اور درر فوائد المنظمۃ میں اس کی تشریح ہے۔ (حمد الجاسر)

[2] "العادۃ" 'العادۃ' کا متعین مفہوم نہیں معلوم۔ لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مطلب سالانہ یا معمول کے مطابق "صدقہ خیرات" ہے۔ (ع ع ن)

[3] مسرت کا اظہار کرنے کے لیے عرب عورتیں ایک خاص طریقہ سے آواز نکالتی ہیں جس میں لفظ نہیں ہوتا، اور اس کا اب بھی معمول ہے۔ (ع ع ن)

پڑھ رہا تھا، کوئی زور سے کوئی آہستہ آہستہ، آنکھیں تو تقریباً ہر شخص کی نم تھیں، ظہر کے بعد بدر کی بستی سے باہر نخلستان میں قافلہ نے کجاوہ اتارا، یہاں وہ زمین ہے جس نے میرے آقا و مولیٰ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم چومے ہیں، یہاں آپ سربسجدہ ہو کر اللہ تعالیٰ سے دیر تک دعائیں مانگتے رہے ہیں، یہاں ملائکہ نے اگر مسلمانوں کے دوش بدوش کفار سے جنگ کی ہے، اس امت کا فرعون ابوجہل یہیں مارا گیا، یہاں کے پہاڑوں پر حضور انورؐ کی نگاہیں پڑی ہیں، شعراء نے اس پاک سرزمین سے اپنی عقیدت مندیوں کا اظہار طرح طرح سے کیا ہے، کسی نے کہا ہے:

۱۔ یا أهلَ بدرٍ لقد طابت مآثرکم — وقد علا قَدْرُکم فی ارفع الدَّرَجِ

۲۔ فُزْتُم بغفران اوزارٍ وحسن ثنا — علی المدی نشر من طیّب الأَرَجِ

۳۔ یکفیکُمْ فی عُلاکم قول مادِحِکُم — هُمْ اهل بَدْرٍ فلا یخشون من حَرَجِ

ترجمہ: ۱۔ اے اہلِ بدر آپ کے کارنامے بہت بلند ہیں، جس سے آپ کی قدر و منزلت بھی بلند ہے، بلندیوں کے تمام زینے آپ نے طے کر لیے۔

۲۔ آپ نے لغزشوں اور گناہوں کے معاف کرا لینے کی کامیابی حاصل کی، اور حسن ستائش آپ کے حصہ میں آئی، جس کی عطر بیز خوشبو ہمیشہ ہمیشہ قائم رہے گی۔

۳۔ آپ کی تعریف میں آپ کے مدح خوانوں کا یہ کہنا کافی ہے کہ: "یہ بدر والے ہیں، ان کو کسی بات کا کھٹکا نہیں ہے"۔ (یعنی آخرت کی پرسش کا کوئی خطرہ نہیں ہے سیدھے فردوس بریں میں جائیں گے)۔

ایک دوسرے شاعر نے کہا ہے:

۱۔ یا أهلَ بَدْرٍ فُزْتُمْ بمزیّة — ما نالها احد من الاخیار

۲۔ شارَکْتُمُ الأَمْلاکَ فی قهرِ العدا — وظهورِ دینِ المصطفیٰ المُخْتارِ

ترجمہ: ۱۔ اے اہلِ بدر! آپ نے وہ خصوصیت حاصل کی ہے جو اللہ کے پسندیدہ بندوں میں بھی کسی کو اب تک نہیں ملی ہوگی۔

۲۔ آپ دشمنوں کو پسپا کرنے اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو غالب کرنے کے لیے فرشتوں کے شریک کار ہو گئے۔

اسی طرح کے متعدد قطعے اور بے شمار قصیدے اہلِ بدر کو مخاطب کر کے اور اہلِ بدر کی شان میں کہے گئے ہیں اور کہے جا رہے ہیں ان سب کا نقل کرنا سفرنامے کے مقاصد کو بدل دے گا، البتہ امام غزالی کے دو شعر ضرور نقل کروں گا جو انھوں نے کسی کو اپنے خط میں لکھ کر بھیجے تھے اور میرے پاس ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا یہ قطعہ موجود ہے۔ وہ دمشق سے سیدھے مدینہ منورہ گئے تھے اور وہاں سے بدر ہوتے ہوئے مکہ مکرمہ گئے تھے، بدر پہنچ کر انہوں نے کہا:

۱۔ أَتَيْنَا مِنَ الْبَدْرِ الْمُنِيرِ مُحَمَّدٍ   بِجَدِّ السری حتی نزلنا علی بدر

۲۔ فهذا بَدِيعٌ ليس في اللفظ مثله   وهذا جناسٌ ليس في النظم والنثرِ

ترجمہ: ۱۔ چودھویں کے ضوفگن ماہتاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور سے ہم آ رہے ہیں اور سواری کو تیز چلاتے ہوئے بدر کے مقام پر پہنچے (بدر چودھویں کے چاند کو بھی کہتے ہیں اور مقام کا نام بھی ہے، یہ رعایتِ لفظی ملحوظ رہے)۔

۲۔ یہ وہ "صنعتِ بدیع" ہے جس کی لفظوں میں مثال نہیں مل سکتی۔ اور یہ وہ "ضلع جگت" ہے جو کسی نظم یا نثر میں دستیاب نہیں ہو سکتا۔

بدر کی یہ رات زندگی کی ایک یادگار رات تھی، ہر جگہ چراغ روشن تھے، شمعیں مختلف انواع واقسام کی فروزاں تھیں، شربت کے پیالے رگ رگ کو سیراب کر رہے، رات بہت جلد کٹ گئی، احساس بھی نہیں ہوا کہ گرم ہوائیں چل رہی ہیں، ہمارے قافلے کے پہنچنے سے پہلے 'شامیوں' کا ایک قافلہ پہلے سے خیمہ زن تھا، ایک دوسرے سے ملے، زبانوں سے پہلے آنکھوں نے ایک دوسرے کو مرحبا کہا، سینوں سے پہلے دلوں نے معانقہ کیا، اور کیوں نہ ہو ہم سب ایک ہی شمع کے پروانے تھے، سب کی منزل ایک، قبلۂ دیدہ و دل ایک، اور اسی جگہ پر ہم سب اکٹھا ہو گئے تھے جہاں نزول رحمت پروردگار سے مٹی آج بھی نرم ہے۔

وہ ایک بار ادھر سے گئے مگر اب بھی   ہوائے رحمتِ پروردگار آتی ہے   (مترجم)

ابو سالم لکھتے ہیں: بدر کی بستی نور کی وادی ہے، فتح و نصرتِ اسلام کی مشک بیز ہوائیں چلتی ہیں، جس سے سینہ روشن اور دل شادمان ہے، ہر شے جمالِ مصطفویؐ کا عکس ہے، بھلا نبوت ـــ اور وہ بھی نبوت محمدیؐ ایسی چیز ہے جس کے آثار چھپائے جا سکیں، وہ علاقہ جس کے کسی حصہ پر بھی میرے آقا

و مولیٰ کا قدم پاک پڑ چکا ہو اس کو کوئی طوفان بھی نہیں مٹا سکتا، اس بستی پر برکات نبوت کا سایہ آج بھی ہے، عام طور پر چیزیں سستی ہیں، پانی انتہائی سبک اور میٹھا، یہاں کے نخلستان کے کھجوروں کا ذائقہ سب سے سوا ہے، یہاں سے کچھ دور پر، جہاں بدّوؤں کے خیمے ہیں، وہ راستہ مامون نہیں ہے، لٹیروں کا کوئی مذہب نہیں ہے، قاتلوں کا کوئی دین نہیں ہے، لیکن بدر کی بستی ان سے اور ان کی چیرہ دستیوں سے محفوظ ہے، میں اس کی شہادت دیتا ہوں اور اپنا مشاہدہ بیان کرتا ہوں۔

اس بستی کا نام قبیلۂ جُہینیہ کے ایک شخص بدر بن یاسر کے نام پر رکھا گیا ہے اس کا یہاں ایک کنواں تھا اور جب پانی وافر ملنے لگا تو آس پاس کے لوگ یہاں آکر آباد ہو گئے۔ ایک پہاڑ بستی سے ایک فرلانگ دور ہے جو ہر جگہ سے نظر آتا ہے، اسی کے دامن سے ایک چشمہ رواں ہے، اس کے قریب نخلستان ہے، اور اس کے سامنے ایک میدان ہے جو پتھروں سے گھیر دیا گیا ہے، لوگوں کا خیال ہے، جس کی تصدیق شامی قافلے کے حجاج نے بھی کی کہ یہی شہدائے بدر کا مقبرہ ہے اور بستی سے قریب جو گول دائرہ کی شکل کا پہاڑ ہے اس کے مغربی جنوب میں ایک ٹیلہ ہے جس پر گنبد بنا ہوا ہے، یہیں پر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پائے مبارک پڑے تھے اور ان کا نشان رہ گیا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ شہدائے بدر کو دفن کرنے کے لیے آپ جب تشریف لائے تو یہاں بیٹھ گئے تھے، اس مقام پر گنبد بنا دیا گیا ہے[۱]

اس احاطہ کے باہر ایک پتھر پر میں نے ان شہدار کے نام دیکھے جو بدر میں شہید ہوئے تھے، ان کی تعداد چودہ[۱۴] ہے، ان کے نام اس طرح لکھے ہوئے ہیں :

عبیدہ بن عبد المطلب (ان کو میدانِ جنگ سے زخمی ہونے کی حالت میں الصفراء تک لایا گیا جہاں ان کی روح پرواز کر گئی، ان کی قبر کے نشان واضح ہیں)۔ عمیر بن ابی وقاص

---

[۱] جو مرور زمانہ سے منہدم ہوگیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بعض مشرکانہ عقائد رکھنے والے بدعتیوں نے اس مقام کی تقدیس شروع کر دی تھی، اس لیے عقیدہ کی حفاظت کے خیال سے اس کو آخری دور میں منہدم کر دیا گیا اور عریش کی مسجد کو باقی رکھا گیا بلکہ اور وسیع کر دیا گیا جہاں خدائے واحد کی عبادت ہو اور جو غزوۂ بدر کا مقصد اوّل تھا۔ (معالم المدینۃ المنورۃ صبحی درویش)

الزھری۔ ذوالشمالین یعنی عبداللہ بن عمیر الخزاعی۔ مبشر بن عبد المنذر۔ عاقل بن البکیر اللیثی صفوان۔ سعد بن خیثمہ۔ حارثۃ بن سراقۃ۔ عمیر بن الحمامؒ الاسلمی۔ مہجع بن الخطاب (؟) یزید بن الحارث۔ رافع بن المعلی الجشمی۔ عوف و معوذ (حارث بن رفاعہ کے دونوں لڑکے جنھوں نے ابوجہل پر وار کیا تھا) یا لیتنی کنت معھم فافوز فوزاً عظیماً (کاش ہم بھی ان کے ساتھ ہوتے اور عظیم کامیابی حاصل کرتے)

یہاں ایک اور مسجد ہے جو پتھروں سے گھیرے ہوئے احاطہ کی شکل میں ہے، اس کی نسبت حضرت سیدنا علی کرّم اللہ وجہہ سے کی جاتی ہے۔

ان مقامات پر خاصی تعداد میں اہل حاجت بھی ہوتے ہیں جو حجاج کی سخاوت کے طالب ہوتے ہیں اور ہر شخص کو اس کا مقسوم مل جاتا ہے، علامہ ابن جابر الاندلسی نے واقعۂ بدر کو ایک طویل نظم 'قصیدۂ لامیہ' میں منظوم کیا ہے، جس کا مطلع ہے:

بدا یوم بدر وھو کالبدر حولہ   کواکب فی افق المواکب تنجلی

یعنی بدر کا دن ظاہر ہوا۔ اور وہ چودھویں کے چاند کی مانند ہے جس کے گرد ستارے کاروانوں کے افق پر چمک رہے ہیں۔

آخری شعر صلاۃ و سلام پر مشتمل ہے اور اس سے پہلے کے ایک شعر کا مصرعۂ اولیٰ مرتب سفرنامہ شیخ حمد الجاسر نے حذف کر دیا ہے اور فٹ نوٹ پر لکھا ہے: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست دعا کرنا شرک ہے۔ دعا عبادت کی ایک قسم ہے جو اللہ کے علاوہ کسی اور سے نہیں کی جا سکتی اس لیے میں نے پہلا مصرعہ حذف کر دیا۔" دوسرا مصرعہ یہ ہے:

وحبك ذخری فی الحساب ومدخلی

(اور آپ کی محبت میرا سرمایہ ہے قبر کے لیے اور یوم حساب کے لیے)

بدر کے وسط قصبہ میں ایک مسجد ہے جہاں جمعہ بھی ہوتا ہے، جمعہ کے امام کا نام "شریف رُزینی" ہے ان کو اس خدمت کا معاوضہ یہ ملتا ہے کہ جب کھجور کی فصل ہوتی ہے تو ایک ڈالی بطور مدد کے ان کو دی جاتی ہے، اس مسجد کے دروازے پر ایک بڑا چشمہ ہے جس کا پانی بہت کھارا نہیں ہے اور اگر مشکیزہ (قِربَہ) میں رکھا جائے تو ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔

اس مسجد کی بنیاد سب سے پہلے حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے رکھی تھی، ان کے بعد متعدد بار اس مسجد کی تعمیر اور توسیع کا کام ہوتا رہا ہے، آخری تعمیر میرے زمانہ میں مصر کے بادشاہوں کی ہے۔ اس مسجد میں ایک پیدائشی نابینا حافظ صاحب کو دیکھا جو ہمہ وقتی خادم مسجد ہیں، ان کا نام عبداللہ بن احمد ہے، انھوں نے مجھ سے اپنی اہلیہ کی بیماری کا ذکر کیا، اور میں نے ان کو ایک تعویذ لکھ کر دیا۔[1] حافظ صاحب نے بتایا کہ اس قصبہ کے باشندے قبیلۂ صُبح سے تعلق رکھتے ہیں، مگر ان کا یہ بیان شیخ ابوسالم کے قول سے متعارض ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ اس جگہ کے لوگ بہت امن وسلامتی کے ساتھ رہتے ہیں اور باوجود اس کے کہ ان کے پڑوسی قبیلۂ صُبح کے بدکردار لوگ ہیں، ہو سکتا ہے کہ قبیلۂ صُبح کے لوگ پہلے یہاں سے دور رہتے ہوں پھر کچھ دنوں بعد یہاں آکر آباد ہو گئے ہوں اور اس بستی کے لوگوں پر غالب آ گئے ہوں، واللہ اعلم۔ حافظ صاحب نے بتایا کہ قبیلۂ صُبح کے افراد دو ہزار ہوں گے جو چاروں طرف کے پہاڑوں پر ایک دائرہ کی شکل میں آباد ہیں، ان کا خاندانی سلسلہ ایک صحابی حضرت وایل بن بدر سے ملتا ہے، یہ لوگ قبیلۂ حرب کے حلیف ہیں، پہلے کسی زمانہ میں ایک دوسرے کے دشمن تھے اور ان کے درمیان لڑائیاں ہوئی تھیں، اور اہلِ حرب نے ان کو اپنی آبادیوں سے نکال دیا تھا، اور ان کے گاؤں مٹا دیے تھے، وہ لوگ پہلے ینبع میں آکر آباد ہوئے ایک عرصہ بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے وطن میں واپس آنے کا موقع فراہم کر دیا اب پھر یہ لوگ اپنے پُرانے حلیف حرب کے ساتھ ہو گئے، ان سبھوں کا فقہی مسلک شافعی ہے، اگرچہ ان میں کچھ زیدی شیعہ بھی ہیں، شیعوں کی آبادی بہ کثرت اس علاقہ میں ہے، یہ لوگ دھناؤ سے لے کر طائف تک، اور مدینہ منورہ اور اس کے عوالی (نسبتاً بلند حصے جو مدینہ منورہ کے گرد ہیں) میں موجود ہیں، ان کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہے، لیکن قبائل حجاز میں ان کا کوئی وزن نہیں ہے، عام طور پر یہ لوگ شرپسند فسادی ہیں۔

---

[1] تمیمہ (تعویذ) اگر آیات قرآنیہ یا ادعیۂ ماثورہ پر مشتمل ہے تو مضائقہ نہیں ہے، لیکن اگر ان میں حروف مقطعہ (الگ الگ حروف) ہیں یا غیر شرعی دعائیں ہیں، تو اس کا لٹکانا جائز نہیں ہے جیسا کہ علمائے محققین نے صراحت کی ہے۔ (حمد الجاسر)

فائدہ:

مسجد عریش کے مقابل میں ایک "مسجد نصر" ہے، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی "قصوی" ٹھہری تھی، جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا یہیں پر شہداء کے مقابر ہیں اور اس کی نسبت حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کی جاتی ہے۔

العبدری کا بیان ہے کہ ان کے زمانہ میں بدر کے اکثر باشندے رافضی ہیں، اور مدینہ منورہ تک پھیلے ہوئے ہیں، علامہ عبدالسلام الدرعی مصنف سفرنامہ کہتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ بدر میں شیعوں کی کثرت خلاف توقع نہیں ہے کیونکہ یہاں زیدی شیعوں کا عمل دخل رہا ہے، اور یہ لوگ حجاز میں مکہ مکرمہ تک پھیلے ہوئے تھے، مگر مدینہ منورہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) میں کسی زمانہ میں غلبہ نہیں رہا ہے، البتہ یہ صحیح ہے کہ ہر زمانہ میں حج کے لیے آتے ہیں اور ان میں ایک تعداد مستقل اقامت اختیار کرلیتی ہے، ان میں شیعہ بھی ہیں اور بدعتی بھی۔ لہٰذا یہ کہنا تو غلط ہے کہ ان کی کثرت ہوگئی ہے، مگر اتنا ضرور ہے کہ یہ لوگ معمولی تعداد میں آکر رہ پڑے ہیں، چھٹی اور ساتویں صدی ہجری میں روافض کی کثرت ہوگئی تھی، اور ان لوگوں نے ایک بار حرم نبوی شریف کی دیواروں میں آگ بھی لگادی تھی، بلکہ ایک وقت میں یہ لوگ اتنے بڑھ گئے تھے کہ امام، قاضی، سب شیعہ تھے، علامہ ابن جبیر نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ آتش زدگی کے اثرات انھوں نے حرم نبوی شریف کی دیواروں پر خود دیکھے تھے، اس پر انھوں نے چند شعر بھی کہے تھے:

لم یحترق حرم النبی لحادث   یخشیٰ علیہ، وما بہ من عار

لاکنما ایدی الروافض لامست   تلک الرسوم فطھرت بالنّار

(حرم نبوی کسی ایسے حادثہ میں نہیں جلا کہ اس کے تلف ہوجانے کا خطرہ ہو، اور نہ اس کے لیے کوئی عار کی بات ہوئی۔ ہاں یہ ہے کہ رافضیوں کے ہاتھوں نے اس کے نقوش پر ہاتھ لگایا تو آگ سے اس کو پاک کردیا گیا)۔

اس کے علاوہ بھی چند لوگوں کے اشعار نقل کیے گئے ہیں، جس کا مفہوم یہ ہے کہ حرم شریف کو آگ اس لیے لگائی گئی کہ روافض نے صحابہ کرام پر سب وشتم کرکے اس کے تقدس کو لوٹ کردیا تھا۔

العبدری نے مزید لکھا ہے کہ مقابر بدر کے مغربی جانب ایک لِصب (معمولی سی گھاٹی)

ہے، حجاج وہاں بھی حصولِ برکت کے لیے جایا کرتے تھے بلکہ اژدھام ہوجایا کرتا تھا، یہی نہیں بلکہ ایک دوسرے سے اُلجھ بھی جایا کرتے تھے، اور سب کوشش کرتے تھے کہ اس گھاٹی کی چوٹی پر چڑھ جائیں وہاں جانے کی خواہش کیوں کرتے تھے اس کے اسباب بھی بیان کرتے ہیں مگر ان کی کوئی اصل نہیں ہے، میں نے وہاں جاکر جو دیکھا تو صرف چند جلے ہوئے سیاہ پتھر نظر آئے، اور ایک غار قسم کی چیز دیکھی، لوگ اس میں جاکر برکت کے حصول کی تمنا کرتے ہیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ ایسی باتیں منسوب کرتے ہیں جن کی کوئی حقیقت یا اصلیت نہیں ہے، ان لوگوں کی ناواقفیت کا یہ عالم ہے کہ بدر وحنین کا نام بغیر واوٴ عطف کے اس طرح لیتے ہیں جیسے دونوں ایک ہی جگہ کے نام ہوں کہتے ہیں بدر حنین[1]۔ یہ بات یہاں تک بڑھی کہ ناصر الدین جیسے مشہور مصنف نے 'بدر حنین' ایک ساتھ لکھ دیا ہے حالانکہ دونوں غزوات کے مقامات میں کافی فاصلہ ہے اور دونوں کے زمانے بھی الگ الگ ہیں، غزوۂ بدر ۲ھ ہجری میں ہوا، اور یہ مقام مدینہ منورہ سے چار یوم کی مسافت پر ہے، اور غزوۂ حنین ۸ھ ہجری میں ہوا اور یہ جگہ مکہ مکرمہ اور طائف کے درمیان ہے۔

مصری حجاج کا یہ بھی دستور ہے کہ وہ اپنے ساتھ کافی تعداد میں موم بتیاں لاتے ہیں اور کچھ لوگ شمعدان ساتھ رکھتے ہیں اور جب ان مقامات سے گزرتے ہیں تو اونٹوں کے کوہانوں پر، گھوڑوں کی زینوں پر، گدھوں اور خچروں کی پشت پر جما دیتے ہیں اور رات بھر جلائے رکھتے ہیں، اور ہر خیمہ میں کافی روشنی کرتے ہیں، چنانچہ یہاں کے مقامی عرب فروخت کرنے کے لیے موم بتیاں بھی لاتے ہیں تاکہ اگر کوئی حاجی مصر سے ساتھ نہ لایا ہو تو ان سے خرید کر رسم پوری کرے، اور مشہور یہ ہے کہ غزوۂ بدر کے موقع پر صحابۂ کرام نے بہت روشنی کی تھی اور آگ جلا جلا کر روشنی کرتے تھے، حالانکہ یہ بھی غلط فہمی ہے، آگ روشن کرنے کا واقعہ فتح مکہ کے موقع پر پیش آیا تھا تاکہ دشمنوں کو مرعوب کیا جائے، اور کفار کو مسلمانوں کی قوت کا اندازہ ہو، مگر اب نہ کفار ہیں اور نہ اظہارِ شان کا کوئی موقع ہے، مگر آگ جلا کر روشنی کرنے کا دستور ان لوگوں میں چل پڑا ہے، اور زیدی شیعہ حضرات کے یہاں یہ رسم خاص ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ بعض لوگ ناواقفیت کی بنا پر اس کو

---

[1] جیسے ہندوستان وپاکستان کے مسلمان 'مکہ مدینہ' بغیر واوٴ عطف کے بولتے ہیں۔

حج کے شعائر میں داخل سمجھتے ہیں، میرے پاس متعدد حجاج ایسے آئے جن کے پاس شمعیں نہیں تھیں وہ فتویٰ چاہتے تھے کہ ان کو کیا کرنا چاہیے، کوئی دم دینا پڑے گا یا صدقہ ؟ جب میں نے ان سے بتایا کہ یہ بالکل ہی لغو اور بے اصل بات ہے تو کچھ لوگ مطمئن ہو جاتے، اور بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو شک ہے، کیونکہ عام رواج سے روگردانی آسان بات نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ اپنے دین اور اپنے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت پر ہم سب کو ثابت قدم رکھے۔

بدر سے مشرق کی جانب جب ہمارا قافلہ آگے بڑھا تو وادی الصفراء کا راستہ اختیار کیا، اس راستے سے شام کا قافلہ جارہا تھا، مصری قافلہ جس میں مَیں تھا اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں افراد زیادہ ہیں اور اسی اعتبار سے اونٹ، خچر، اور سامان زیادہ ہے۔ مگر شامیوں کے اونٹ زیادہ تندرست اور مضبوط قسم کے ہوتے ہیں اور یہ لوگ جہاں پڑاؤ ڈالتے ہیں وہاں خیمے بہت خوبصورتی اور نظم کیساتھ نصب کرتے ہیں، خیموں کے درمیان کھلا راستہ رکھتے ہیں گویا ایک دائرہ میں ایک قسم کا محلہ بن جاتا ہے، اور سامان کے بجائے اپنے ساتھ اشرفیاں، قیمتی جواہرات رکھتے ہیں جس سے اپنی ضروریات کی چیزیں خرید لیتے ہیں، اور ان کے انداز میں وقار ہوتا ہے چہروں پر سکینت اور عبادت کا اثر معلوم ہوتا ہے، رہا وہ قافلہ جو مدینہ منورہ سے آتا ہے اس کے افراد بہت کم اور زاد راہ بہت ہی کم ہوتا ہے مگر ان کے چہروں پر خشیتِ الٰہی کا اثر ہوتا ہے، محبت کرنیوالے اور محبت سے پیش آنے والے لوگ ہیں، یہ لوگ مدینہ منورہ سے بدر، اور بدر سے جدّہ جاتے ہیں اور وہاں سے مکہ مکرمہ کا رُخ کرتے ہیں، جب ہم لوگ وادی صفراء میں اترے اور ایک شامی بزرگ کے خیمے میں بیٹھے تھے کہ ایک مدنی بزرگ آئے اور بڑے اخلاق و نوازش کا اظہار کیا اور ہم سب کے ہمارے نام معلوم کیے، میرے قافلہ کی عورتوں تک کے نام انھوں نے اپنی نوٹ بک میں لکھے اور اصرار سے دعوت دی کہ جب مدینہ منورہ حاضری ہو تو ان کے مکان پر ہم لوگ ٹھہریں یا کم از کم ملاقات کے لیے آئیں اور یقین دلایا کہ وہ سب ہماری خدمت میں ہوں گے۔ ہم ان کے اخلاق سے متاثر ہوئے مگر سب سے زیادہ جس بات نے متاثر کیا وہ یہ کہ یہ بزرگ مدینہ منورہ سے آرہے تھے، میرے آقا و مولیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر کے رہنے والے ہیں، ان کو دیکھ کر ہی دل اُمڈ آیا اور آنکھوں پر قابو نہ رہا۔

وادی الصفراء میں یکم ذی الحجہ کو ہم پہنچے، اور شب پنجشنبہ کی تھی، جس سے ہم لوگ زیادہ خوش ہوئے، اور فالِ نیک لیا۔

(جاری)

خواجۂ اُردو نواز کا اعزاز

۷؍اکتوبر ۸۳ء کی شام کو 'پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کے ساتھ ایک شام' کے عنوان سے غالب اکیڈمی نے ایک محفل آراستہ کی، اور خواجہ صاحب کے احباب، قدردان، ان کی یونیورسٹی کے ذمہ داروں نے شرکت کی۔ سید حامد صاحب سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے صدارت کی۔ وزیر ہند جناب ضیاء الرحمٰن انصاری کے ہاتھوں 'ارمغانِ فاروقی' کی رسمِ اجرا ہوئی۔

خود خواجہ صاحب نے اس موقع پر جو تقریر کی وہ ادبی دنیا کے لیے ایک تحفہ ہے، اس کے تمہیدی صفحات کو حذف کر کے اصل تقریر کو 'ذکر و فکر' کے قارئین کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔ ———— (ادارہ)

خواتین وحضرات!

۴۷ء کے بعد جب میں نے اردو کا کام شروع کیا ہے، اُس وقت دلّی، وہ دلّی نہیں تھی جس کا ذکر آپ نے اپنے بزرگوں سے سُنا ہوگا۔ ایک صحرائے لق و دق تھا اور ہُو کا عالم۔ اردو کے ایم۔ اے نایاب تھے۔ بس ایک لڑکا تھا، وہ بھی فاتر العقل۔ شاید یہی شوریدگی اسے شعبہ میں لے آئی تھی۔ لوگ پاکستان کی طرف بھاگے چلے جا رہے تھے۔ یہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ وہاں حوریں جامِ کوثر لیے کھڑی ہوں گی اور غلمان خدمت کے لیے صف آرا ہوں گے۔ دلّی میں جھلّی والے اور مزدور تک مرادآباد اور میرٹھ سے آکر مزدوری کرتے تھے یا ترکاری بیچتے تھے سخن داں اور سخن ور کیسے۔

میری مصیبت دو طرح تھی۔ ایک طرف وہ لوگ تھے جو کہتے تھے کہ ہماری تو جانوں پر، اور روزی پر بَن رہی ہے اور آپ ہر وقت اردو، اردو الاپتے رہتے ہیں۔ دوسری طرف ایسے لوگ تھے جو اردو کو پاکستان کا تہذیبی نشان سمجھتے تھے۔ اس کے رسم خط کو مٹانا چاہتے تھے اور ہرگز ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ دہلی میں جو ہندوستان کا قلب و جگر اور جمہوریہ ہند کا دارالخلافہ ہے۔ اس میں اردو کا کوئی کام بھی ہو سکے۔ ان لوگوں نے کتنی نچلی سطح پر جا کر مخالفت کی ہے، عرض نہیں کر سکتا۔ پھر کچھ لوگ ایسے تھے جو صنعتی، میکانکی اور مادی ترقی ہی کو، تہذیب کے مقابلے میں سب کچھ سمجھتے تھے اور اردو کو جو ہندوستان کی سالمیت اور مشترکہ تہذیب کی علامت ہے، اسے برابر نفع نقصان کی ترازو میں تولتے رہتے تھے۔

میری طبعِ غیور کو یہ گوارا نہیں ہے کہ میں گلہ و شکایت کا دفتر کھولوں یا اس کی تفصیل بیان کروں۔ صرف اتنا عرض کروں گا کہ میں نے ناقابلِ بیان دشواریوں اور دقّتوں میں اردو کی خدمت کو سرانجام دیا ہے ——— دوسرے یہ ڈر بھی ہے کہ اس ناوک فگنی اور قدر اندازی کے ذکر سے کہیں محبوب کے دست و بازو کو نظر نہ لگے۔ اب نہ شکوہ ہے، نہ شکایت ہے۔ بس شکر ہی شکر ہے ؂

ہزار حشر میں پرسش ہوئی مگر ہم نے
نہ دل کا زخم دکھایا، نہ اُن کا نام لیا

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اُردو کا شعبہ، اب حقیقتِ بسیط ہے۔ اس کا شمار ہندوستان کے بڑے شعبوں میں ہوتا ہے۔ اس کا نام بین الاقوامی نقشہ پر ثبت ہو چکا ہے اور اس کے کاموں کو ذمہ دار علمی و ادبی حلقوں میں پسند کیا جاتا ہے۔

مجھے اس کی بھی بڑی مسرت ہے کہ آپ نے اس جلسہ کا انعقاد، حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کی سرزمین پر غالب اکاڈمی میں کیا ہے۔ اِس کے بیان کرنے میں مَیں عجیب قسم کا حجاب محسوس کر رہا ہوں کہ جب میں مخالفتوں سے تنگ آ جاتا تھا تو بالکل غیر وقت، روضۂ انور پر حاضر ہوتا "تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی" اور اپنے خدائے رحیم و کارساز سے رجوع کرتا اور اس کے بعد طبیعت کو عجیب خوشی، طمانیت اور تقویت حاصل ہوتی۔

میں اس سرزمین کو اپنی عقیدت وارادت کا سلام پیش کرتا ہوں اور خوش ہوں کہ آپ نے مجھے اس پلیٹ فارم سے خطاب کرنے کا شرف بخشا۔ جس طرح شبنم، چمنستان کو، اور نسیم سحر، پھولوں کو شگفتہ اور شاداب کر دیتی ہے۔ اسی طرح آپ کے اس دعوت نامے نے اور اس تقریب نے مجھے خوش وقت اور ممنون و مسرور فرمایا۔

خواتین و حضرات! آپ نے جو کارنامے میرے نام سے منسوب کیے ہیں، ان میں مجھے بقدر خواہشِ دل یا بقدر ذوق و شوق کامیابی نہیں ہوئی۔ لیکن اگر ذوق و شوق کی کوئی قیمت ہے تو مجھے اس کے حق دار بننے میں کوئی عذر نہیں۔

میری تو صرف یہ تمنّا ہے کہ میں اردو کی ایسی خدمت انجام دے سکوں جس سے میری زندگی بامعنی اور بامقصد بن جائے۔ یہ مرحلۂ شوق ابھی طے نہیں ہوا ہے۔ میری یہ بھی آرزو ہے کہ میں ایسی لازوال سطریں لکھ سکوں جو دردمند انسانیت کے لیے مرہم بن سکیں اور ہمت کو بلند کر دیں جو ہمیں مشکلات میں خدمت کرنے، محبت کرنے اور مسکراتے رہنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

جناب صدر! مجھ سے بعض دوستوں نے پوچھا ہے کہ آپ نے اپنی خود نوشت کا نام عمرِ رائیگاں کیوں رکھا ہے، معارف کے اڈیٹر مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے لکھا ہے اس کا نام عمرِ درخشاں ہونا چاہیے تھا۔ ایک عزیز کہنے لگے، یہ کفرانِ نعمت ہے، آپ ملامتیہ فرقہ میں کب سے داخل ہو گئے۔

میرا تصور، روزِ حساب کا یہ ہے کہ مجھ سے ایک ایک قطرہ، ایک ایک دانہ اور ایک ایک لمحہ کا حساب لیا جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے بہت وقت ضائع کیا ہے اور میں اس حساب فہمی Accounta-bility کو سوچ کر کانپ جاتا ہوں۔

جناب صدر! میں اس کی وضاحت بھی کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے جو کچھ کام کیا ہے اور جس کا ذکر اجمالاً ارمغانِ فاروقی اور عمرِ رائیگاں میں موجود ہے۔ وہ تنہا میرا کارنامہ نہیں ہے۔ اس میں میرے طالب علموں، میرے ساتھیوں، میرے دوستوں اور میرے وائس چانسلروں کا اتنا ہی حصّہ ہے جتنا میرا ہے۔

شہد کی مکھیاں مختلف پھولوں سے رس چوستی ہیں۔ اِن رسوں سے شہد بنتا ہے، نہ معلوم کتنے رس مل کر ایک رس بناتے ہیں۔ شہد کا کوئی قطرہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ صرف ایک پھول کے رس سے بنا ہے۔ بہت سے پھولوں کے رس مل کر شہد کو وہ درجہ دیتے ہیں جس سے اس کا شمار نعایمِ بہشت میں ہوتا ہے۔

ایک فارسی شاعر نے کہا ہے: "مجھے یہ کہنے کی جرأت نہیں ہوسکتی کہ اس باغ کے پھول، چمن اور بہار میری وجہ سے ہیں۔ پھول محبوب کی بدولت ہیں، چمن محبوب کی بدولت ہے۔ بہار محبوب کی بدولت ہے اور محبوب، میرے دم سے ہے۔" کہتا ہے:

نہ می گویم، دریں گلشن، گل و باغ و بہار از من

بہار از یار، و باغ از یار، و گل از یار، و یار از من

آپ نے ان کاموں کی روداد تو سُن لی اور پڑھ لی جو مجھ سے اچھے یا بُرے ممکن ہوسکے لیکن جو کام میں نہیں کرسکا اور جس کی حسرت باقی ہے، اُن کی طرف بھی اشارہ کردوں:

میں نے ڈاکٹر ذاکر حسین صدر جمہوریہ ہند اور وزیٹر دہلی یونی ورسٹی کی خدمت میں ایک میمورنڈم پیش کیا تھا جس میں یہ درخواست کی تھی کہ دہلی یونی ورسٹی میں اردو کا Advanced Centre قائم ہو۔ اس پر نیشنل پروفیسر ڈاکٹر ڈی۔ ایس۔ کے آزادی، راؤ، گیان پیٹھ انعام یافتہ ڈاکٹر جوشی، کاکا صاحب کالیل کر اور ذکر وغیرہ کے دستخط تھے۔ ذاکر صاحب نے مدد کا وعدہ فرمایا تھا لیکن جس دن اور جس وقت ان سے اس معاملہ میں تفصیلی گفتگو کرنا تھی، اُسی روز اور اسی وقت انھوں نے رحلت فرمائی۔ وہ اب دنیا میں موجود نہیں لیکن ان کی برکت اور ان کا فیضان اور ان کی باتوں کی خوشبو میرے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے اور مجھے امید ہے کہ ہمارے شعبہ کے ساتھی اس کام کو آگے بڑھائیں گے۔ میرے ایک پرانے دوست اور رفیق نے یہ بشارت دی ہے کہ اس کام میں کچھ پیش رفت ہوئی بھی ہے۔

عزیزو اور دوستو! آج کی صحبت سے فائدہ اٹھا کر میں ایک بات زبان کی اہمیت کے سلسلہ میں کہنا چاہتا ہوں، ۱۹۵۰ء میں بی بی سی نے لندن سے ایک پروگرام نشر کیا تھا جس کا عنوان تھا، زبان اور تعلیم۔ اس میں سر والٹر موبرلے اور پروفیسر بلیکٹ وغیرہ دانشور شامل تھے۔ ان سب نے اس بات پر زور دیا کہ یونی ورسٹی گفتگو کا مرکز ہے۔ یہ گفتگو استاد اور استاد کے درمیان، استاد اور طالب علم کے درمیان اور طالب علم اور طالب علم کے درمیان ہونا چاہیے اور یہ مقصد صرف زبان کی تعلیم ہی سے حاصل ہوسکتا ہے۔ لیکن آزادی کے بعد ہم نے کانگریس کی لسانی پالیسی کو، گاندھی جی کو اور ان کے آدرشوں کو قتل کردیا اور زبان، ہماری گدی سے کھینچ لی گئی۔

آج ہماری یونی ورسٹیوں کے طلبا، اپنا مافی الضمیر نہ اردو میں ادا کرسکتے ہیں، نہ ہندی میں، نہ پنجابی میں، نہ انگریزی میں۔ آج ان طالب علموں میں جو انتشار اور بے چینی نظر آتی ہے اس کا بھی ایک بڑا سبب زبان کی شدید

[illegible] ہے۔ ہماری علمی ترقی اور جمہوری سماج کی بنیادیں مضبوط کرنے کے لیے یہ از بس ضروری ہے کہ اردو کی [illegible] یونی ورسٹیاں ہوں۔ ایک شمال میں اور دوسری جنوب میں۔ جن میں تمام سائنسی اور سماجی علوم، مادری زبان اردو کے ذریعہ پڑھائے جائیں۔ ہمارے یہاں بعض حضرات عجیب احساسِ کمتری میں مبتلا ہیں۔ کہتے ہیں کہ اردو کا رسم خط بدل دیجیے سارا مسئلہ طے ہو جائے گا۔ میں عرض کرتا ہوں کہ یہ شیروانی نہیں ہے کہ صبح کو آپ نے سفید پہنی اور شام کو جب آپ کھانے پر گئے تو سیاہ زیب تن فرمالی۔ دونوں میں جسم و جان کا تعلق ہے اور رسم خط کے بدلنے سے بقول پنڈت نہرو بالکل ایک غیر زبان وجود میں آجاتی ہے۔

۱۹۴۵ء میں جنرل میک آرتھر نے جاپان کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اس نے جاپانیوں سے کہا کہ آپ اپنا رسم خط بدل دیں یہ بہت پیچیدہ اور دشوار ہے۔ رومن اختیار کر لیجیے، جاپانی جنگ عظیم دوم میں ہار چکے تھے۔ زخموں سے چور چور تھے لیکن انھوں نے کہا یہ ہمارا تہذیبی معاملہ ہے۔ ہم اسے بہتر سمجھتے ہیں اور کسی حال میں رسم خط کو تبدیل کرنے کے لیے تیار نہیں۔

اب یہی پیچیدہ اور دشوار رسم خط ہے جس کی بدولت جاپان میں سو فی صد خواندگی ہے سو فی صد روزگار ہے۔ ان کا معیارِ زندگی، جرمنی اور امریکہ کے برابر ہے۔

اردو صرف رات اور زلف کی کہانی نہیں ہے۔ اس میں ریاضی، کیمیا، طبیعات، حیاتیات، طب، ہیئت، اور دیگر سائنسی اور سماجی موضوعات پر ۱۸۴۰ء سے لے کر دار الترجمہ اور جامعہ عثمانیہ تک مسلسل لکھا جا رہا ہے، اور یہ شرف، اس درجہ میں کسی اور ہندوستانی زبان کو حاصل نہیں ہے۔

ایک ایسی اہم زبان کی یونی ورسٹی، وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے، اردو کو جو دولت ارثاً ملی ہے وہ مشترکہ تہذیب کی دولت ہے۔ اس نے آزادی کی تحریک کو گاؤں گاؤں پھیلایا ہے۔ انقلاب کی چنگاریاں روشن کی ہیں، غریبوں کو جگایا ہے، دل میں ٹھنڈک اور نظر میں وسعت پیدا کی ہے۔ جس وقت انسانی اقدار جل رہی تھیں، اردو نے تہذیبی قدروں کی پرورش کی اور تیز و تند ہواؤں میں انسان دوستی اور فراخ دلی کے چراغ روشن کیے، ایک ایسی زبان کی یونی ورسٹی، نئے ہندوستان کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ میں نے یہ تجویز ۱۹۶۸ء میں اور پھر ۱۹۷۰ء میں پیش کی تھی اور اس کو تمام ماہرین تعلیم نے پسند کیا تھا۔ جب پنجابی یونی ورسٹی، ہندی یونی ورسٹی اور تامل یونی ورسٹی ہو سکتی ہے تو اردو کی یونی ورسٹی بھی جلد یا بدیر ضرور ہو گی۔ یہ ہندوستان کی تقدیر ہے اور مجھے اس میں مطلق شبہ نہیں۔

ترتیب: شفیق الرحمٰن ندوی

عالم اسلام کی علمی و ثقافتی سرگرمیاں

ماہ صفر کے نصف اخیر میں رابطہ عالم اسلامی نے جشن سیمیں (SILVER JUBILEE) منایا، اس جشن مسرت کو با مقصد اور نتیجہ خیز بنانے کی غرض سے اس موقع پر ایک عالمی کانفرنس منعقد کی گئی جو رابطہ کے زیر انتظام تیسری عالمی اسلامی کانفرنس تھی۔ قبل ازیں دو عالمی کانفرنسیں سالہائے گزشتہ میں منعقد ہو چکی ہیں، دنیائے اسلام اور دنیائے عرب کے چھ سو سے زائد مسلم دانشوروں، اور ممتاز شخصیتوں کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی، مدعوئین کی معتد بہ تعداد نے کانفرنس میں شرکت کی اور عملی حصہ لیا۔ ہندوستان سے عالم اسلام کی مشہور شخصیت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی نے شرکت فرمائی، موصوف رابطہ عالم اسلامی کے بنیادی رکن ہیں، ہندوستان سے رابطہ کے دوسرے بنیادی رکن، مولانا محمد منظور صاحب نعمانی ہیں، جنھوں نے علالت کے سبب اظہار معذرت کر دیا۔ ہندوستان سے بعض دیگر مسلم شخصیتیں بھی کانفرنس میں شرکت کے لیے مدعو تھیں۔

کانفرنس پانچ روز تک جاری رہی۔ مساجد کونسل اور فقہ اکیڈمی کے جلسے الگ ہوئے، کانفرنس کی مختلف نشستوں میں دعوت اسلامی سے متعلق مختلف امور زیر بحث آئے۔ ماضی کی روشنی میں دعوت و ارشاد کے کام کو زیادہ ثمر آور بنانے کے لیے متعدد تجویزیں زیر غور آئیں، عالم اسلام کے مسائل اور مشکلات (جس میں سر فہرست بیت المقدس کی بازیابی، ایران عراق جنگ، فلسطینی پناہ گزینوں کے مسائل ہیں) زیر بحث آئے، دنیا کے مختلف علاقوں میں آباد مسلم اقلیتوں کے مسائل اور ان کے ساتھ تعاون کے امکانات پر بھی غور و خوض کیا گیا۔

رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کا قیام ۱۹۶۲ء میں عمل میں آیا تھا، اس وقت پورا عالم عرب جمال عبدالناصر

کی تعداد اور شخصیت اور عرب قومیت کے سحر میں گرفتار تھا، وحدت اسلامی کی آواز دب کر رہ گئی تھی، خطرہ محسوس کیا جانے لگا تھا کہ عرب قومیت کا ریلا کہیں وحدت اسلامی کے تصور کو بہا نہ لے جائے، ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے شاہ فیصل کو توفیق بخشی اور انھوں نے دنیائے اسلام کے علماء و مفکرین کو جمع کیا اور ان کے مشورے سے رابطہ عالم اسلامی کے قیام کا اعلان کیا، اس اعلان کے لیے مکہ مکرمہ سے زیادہ موزوں کوئی دوسری جگہ نہیں ہو سکتی تھی، ہر قسم کی قومیتوں اور علاقائیتوں کے خلاف پہلی آواز مکہ مکرمہ سے بلند ہوئی تھی۔ اس لیے عرب قومیت کے خلاف بھی آوازہ یہیں سے بلند ہونا چاہیے تھا، اس لیے بھی کہ یہاں کا آوازہ مسلمان گوش شنوا سے سُنتے ہیں اور عقیدت کے دل سے مانتے ہیں، آج سے پچیس برس قبل جو پودا لگایا گیا تھا آج وہ ایک تناور درخت بن چکا ہے، اس کی شاخیں دور دراز علاقوں تک پہنچ چکی ہیں، عرب قومیت کا فسوں توڑنے میں دیگر عوامل کے علاوہ رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ نے بھی قابل ذکر اور لائق ستائش کارنامہ انجام دیا ہے۔

گزشتہ پچیس برسوں میں رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کی سرگرمیوں اور دائرۂ کار میں وسعت اور پھیلاؤ ہوا ہے، وہ مختلف جہتوں میں مصروف عمل ہے اور متعدد شعبہ جات اس کے تحت کام کر رہے ہیں، تقسیم کار کی بدولت اس کی افادیت میں اضافہ ہوا ہے، چند اہم شعبہ جات یہ ہیں:

۱۔ مجلس تاسیسی، اس کے ارکان کی تعداد اس وقت ۵۵ ہے۔ یہ رابطہ کی سپریم باڈی ہے، اغراض و مقاصد کی تعیین اور پالیسی طے کرنا اس کے ذمہ ہے۔
۲۔ جنرل سکریٹریٹ، مجلس تاسیسی کے فیصلوں کی تنفیذ اس کے فرائض منصبی میں داخل ہے۔
۳۔ مساجد کونسل
۴۔ اسلامی ریلیف ایجنسی
۵۔ فقہ اکیڈمی
۶۔ بورڈ برائے تلاش و تحقیق سائنسی اعجاز در قرآن و سنت
۷۔ شعبۂ ائمہ و دعاۃ (مبلغین)
۸۔ شعبۂ تعلیم و ثقافت
۹۔ سنٹر برائے تقسیم کتب

۱۰۔ ادارہ نشر واشاعت۔

جشن سیمیں کے موقع پر ایک دستاویزی فلم تیار کی گئی ہے جو عالم اسلام کے وزراء اعلام اور دیگر ممتاز اداروں اور شخصیتوں کو پیش کی گئی تاکہ دعوت وارشاد کے میدان میں رابطہ عالم اسلامی کی کارگزاریوں سے دوسرے خطوں کے لوگ بھی آگاہ ہوسکیں، اسی ضمن میں ۴۰۰ صفحات کی ایک کتاب بھی شائع ہوئی ہے، جس میں رابطہ اور اس کے ذیلی اداروں کی گزشتہ ۲۵ برس کی کارگزاریوں کا سارا ریکارڈ آگیا ہے، نیز اس میں رابطہ کے بنیادی ارکان، مساجد کونسل، فقہ اکیڈمی اور بعض دیگر اہم شعبوں سے وابستہ سربرآوردہ افراد کا اجمالی تعارف آگیا ہے ایک نمائش کے ذریعہ ادارہ نشر واشاعت اور اسلامی ریلیف کونسل کی کارگزاریوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔

ترکی میں اسلامی بیداری کے آثار

اخباری اطلاعات مظہر ہیں کہ ترکی میں اسلامی بیداری کے آثار نمایاں ہوتے جارہے ہیں، کمال اتاترک کے پرستاروں اور سیکولرزم کے علمبرداروں کی تمام تر محنت وکاوش اس کو روکنے میں کامیاب نہیں ہوسکی ہے، اب تو اسلام پسند طبقے کی جانب سے اسلامی شریعت کے نفاذ کی آواز بھی بلند ہونے لگی ہے۔

اخباری رپورٹوں کے بموجب گزشتہ دوتین دہائیوں کے دوران تیز رفتاری کے ساتھ مسجدوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے، کمال اتاترک اور ان کے بعد عصمت انونو کے دورِ حکومت تک مسجدوں کی تعمیر پر پابندی تھی، عربی رسم الخط پر پابندی لگی، عربی زبان میں اذان قابلِ تعزیر پائی، سیکولرزم کے پرستاروں نے ایک ایک کرکے اسلامی شعائر مٹانے کی سعی نامشکور کی، لیکن ان کی ساری کوششیں نقش برآب ثابت ہوئیں، ترک عوام کے دلوں میں دبی ہوئی ایمانی چنگاری کو مکمل طور پر سرد کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ مرحوم عدنان مندریس کے دورِ حکومت میں جب عربی زبان میں اذان کی آواز لوگوں کے کانوں میں پڑی تو والہانہ سڑکوں پر نکل آئے۔ پہلی بار انھوں نے مسجدوں کی تعمیر سے پابندی ہٹائی، اور دینی تعلیم کی اجازت دی تو دونوں میدانوں میں تیز رفتاری آئی، مسجدیں بھی کثرت سے تعمیر ہوئیں، مدرسے بھی قائم ہوئے اور

تشنگانِ علوم دین کی صف میں اضافہ ہوا، بالآخر یہی چیزیں مرحوم عدنان مندریس کے حق میں جرم عظیم ثابت ہوئیں اور ان ہی کی پاداش میں انھیں حکومت ہی سے نہیں زندگی سے بھی ہاتھ دھونا پڑا، مسرت کی بات ہے کہ انھوں نے اپنے خون سے جس شجر مبارک کی آبیاری کی تھی اس کا نمو جاری رہا، بلکہ اس میں تیزی آئی ہے۔

اخباری بیان کے مطابق چھٹی دہائی تک مسجدوں کی جو تعداد تھی اب ان میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے، ابھی پچھلے دنوں ترکی کے موجودہ صدر نے انقرہ میں ایک مسجد کا افتتاح کیا ہے، پہلے حفظ قرآن پاک اور دینی تعلیم کے کل ۱۹ مدرسے تھے جن میں زیر تعلیم طلبہ کی تعداد صرف ۲۰۰۰ تھی، اس وقت مدارس کی تعداد ۱۶۷ تک جا پہنچی ہے، اور ان سے فیضیاب ہونے والے طلبہ دو لاکھ انیس ہزار سے متجاوز ہیں۔

گزشتہ چند برسوں کے درمیان اسلامی بیداری کی یہ نمایاں ترین علامت ظاہر ہوئی ہے کہ ترکی میں عورتیں اور لڑکیاں پردہ اختیار کرنے اور سر ڈھانپنے لگی ہیں، ایسا کسی جبر و دباؤ کے تحت نہیں ہو رہا ہے بلکہ پردہ کی احادیث کے بارے میں مکمل اطمینان قلب کے بعد ہو رہا ہے اس کا محرک صرف اور صرف جذبۂ ایمانی ہے، ورنہ ہر طرف سے بے حجابی کی ترغیب دی جا رہی ہے، ترقی پسندی، روشن خیالی، مساوات مرد و زن، اور آزادیٔ نسواں کے پُرفریب اور دلکش نعروں کے ذریعہ عریانیت کی پوری حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے، ترکی جیسے ملک میں جو سرتاپا مغربی تہذیب میں غرق ہے مسلمان عورت کا پردہ اختیار کرنے کا فیصلہ کوئی معمولی اقدام نہیں ہے، عزم و ہمت اور حالات کے خلاف نبرد آزما ہونے کا جذبہ ہی اس پر آمادہ کر سکتا ہے۔

صحوۃ اسلامیۃ (اسلامی بیداری) سے اغیار ہی لرزہ براندام نہیں ہیں" اپنے" بھی لرزاں و ترساں ہیں، اور اسلامی بیداری کی راہ روکنے میں کوشاں ہیں، چنانچہ ترکی ہی سے ایک افسوسناک خبر یہ آئی ہے کہ ہائی ایجوکیشن کونسل نے "حجاب" کو ممنوع اور خلاف قانون قرار دیا ہے، یونی ورسٹیوں میں ان لڑکیوں کے داخلہ پر پابندی لگادی ہے جو پردہ چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوں۔ بعض خبروں کے بموجب اس قانون پر عمل درآمد بھی شروع ہو گیا۔ بعض طالبات امتحان ہال سے باہر کر دی گئیں کیوں کہ ان کے سر ڈھکے ہوئے تھے، بعض کا نام یونی ورسٹی سے خارج کر دیا گیا، ایک استانی کو "باپردہ" ہونے کے جرم میں

ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑتا، ترکی سے آمدہ اس نوع کی خبریں تعجب خیز نہیں کہ وہاں کلیدی عہدوں پر سیکولرزم کے داعی اور پرستار ہی فائز ہیں، البتہ ترک عوام کے دل جذبۂ ایمانی سے معمور ہیں اس لیے اس طرح کی بندشیں اسلامی بیداری کے دھارے کو روکنے میں انشاء اللہ کامیاب نہ ہوں گی۔

کوالالمپور میں سمینار

ملیشیا کے مرکزی شہر کوالالمپور میں "دورِ حاضر اور اسلام" کے موضوع پر گزشتہ دنوں ایک سمینار ہوا۔ سمینار کی ایک اہم خصوصیت جو اس کی افادیت میں اضافہ کا سبب بنی یہ تھی کہ مقامی اور بیرونی مسلم مفکرین اور دانشوروں کے علاوہ غیر مسلم صحافیوں کی ایک معتد بہ تعداد کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ اخباری اطلاعات کے مطابق جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک فلپائن، تھائی لینڈ، ہانگ کانگ، چین، انڈونیشیا اور ملیشیا کے ۲۲ غیر مسلم صحافی سمینار میں شریک ہوئے۔ سمینار پانچ روز تک جاری رہا اور اس میں بہت سارے اہم مسائل زیر بحث آئے بطور نمونہ چند یہ ہیں:

۱۔ اسلام بمقابلہ دیگر ادیان و ملل	۲۔ اسلام ماضی و حال کے آئینے میں
۳۔ زمانہ حاضر میں اسلامی شریعت کی افادیت	۴۔ اسلامی مکاتب فکر
۵۔ اسلام میں خاندانی نظام	۶۔ اسلام اور موجودہ اقتصادی نظام
۷۔ جدید علوم اور ٹیکنالوجی میں مسلمانوں کا حصہ	۸۔ اسلام کے تمدنی جلوے

ایک خاص مجلس مذاکرہ "اسلام بیسویں صدی میں" کے عنوان سے منعقد ہوئی، سمینار کا انتظام ملیشیا کے پریس کونسل نے رابطہ عالم اسلامی کے تعاون سے کیا تھا، افتتاح وزیر تعلیم پروفیسر انوار ابراہیم نے کیا اور رابطہ کی نمائندگی استاذ عدنان خلیل باشا نے کی۔

غیر مسلم دانشوروں اور صحافیوں کی تحریروں میں آئے دن ایسی چیزیں آتی رہتی ہیں جو مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوتیں بلکہ ان کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے اور وہ اپنی اندرونی کیفیات کے اظہار کے لیے احتجاج کی راہ اختیار کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، بعد میں مضمون نگار اور متعلقہ اخبارات و رسائل اظہار معذرت کرتے ہیں، اس سے انکار نہیں کہ ایک طبقہ محض دل آزاری کے لیے ایسی حرکتوں

کا ارتکاب کرتا ہے، لیکن یہ بھی امر واقعہ ہے کہ اکثر و بیشتر غیر مسلم مضمون نگاروں کی تحریروں میں ایسی
چیزیں محض ناواقفیت اور ناقص معلومات کے سبب در آتی ہیں ورنہ ان کی نیت بُری نہیں ہوتی!
پہلے طبقہ کی اصلاح دشوار ہے، البتہ اسلامی تعلیمات کا تعارف کرا کے دوسرے طبقہ کو صحیح معلومات
سے روشناس کرایا جا سکتا ہے، یوں اس کی طرف سے پہنچنے والی دل آزاری سے بچا جا سکتا ہے،
اسلام کا تعارف کرانے میں سمینار، مجلس مذاکرہ اور ڈائلاگ کی نشستیں زیادہ موثر کردار ادا کر سکتی
ہیں، سمینار کے ذمہ داروں نے بڑی تعداد میں غیر مسلم صحافیوں کو دعوت دے کر اچھی شروعات کی ہیں،
ہندوستان میں اس خدمت کا آغاز عالم اسلام کے معروف مفکر و دانشور مولانا سید ابوالحسن علی صاحب
ندوی نے کیا ہے، چنانچہ کئی اہم شہروں میں ڈائلاگس کی نشستیں ہو چکی ہیں اور ان کے مثبت اثرات
مرتب ہوئے ہیں، بعض دیگر مسلم تنظیمیں بھی مشترکہ پلیٹ فارم سے اسلام کا تعارف کرانے کی
خدمت انجام دیتی رہی ہیں، اس نوع کی خدمت جہاں کہیں ہو اور جس پلیٹ فارم سے ہو قابلِ قدر
اور قابلِ ستائش ہے۔

فلپائن میں اسلامی یونی ورسٹی

برطانیہ میں مسلم طلبہ کی تنظیم کے آرگن "مجلۃ الغرباء" کی ایک خبر کے بموجب فلپائن کے دارالسلطنت
منیلا میں پہلی اسلامی یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا ہے، اس کی افتتاحی تقریب میں عالم اسلام سے بڑی
تعداد میں مسلم دانشور اور مفکر شریک ہوئے۔ یونی ورسٹی کے ذریعہ ایک طرف مسلم طلبہ کی تعلیم کا نظم ہوگا،
تو دوسری طرف سمپوزیم اور سمینار کے ذریعہ اسلام کا تعارف کرایا جائے گا۔ اسلام کے بارے میں
پھیلی ہوئی غلط فہمیاں دور کی جائیں گی، اس طرح فلپائن میں آباد مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان
اختلافات کی خلیج پاٹنے کی فکر و سعی کی جائے گی، نیز عیسائی اسکولوں اور کالجوں میں زیر تعلیم مسلم طلبہ
کے مسائل حل کرنے کی فکر و تدبیر کی جائے گی۔

آسٹریا میں اسلام کی آواز

آسٹریا میں مسلم تنظیم کے ذمہ دار ڈاکٹر اسماعیل بالیک نے ایک انٹرویو میں کہا ہے کہ

وہاں کے ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے ان کو موقع فراہم کیا اور اوقات مخصوص کیے ہیں تاکہ وہ مختلف اسلامی تہواروں اور دینی موقعوں پر اسلامی تعلیمات پیش کریں، اور آسٹریا کے عوام کو اسلام سے روشناس کرائیں۔

آسٹریا میں ستر ہزار مسلمان آباد ہیں، یہاں کی حکومت نے ۱۹۷۰ء میں ایک قانون بنایا، جس کے مطابق ہر مذہب کے لوگوں کو دینی شعائر ادا کرنے کی مکمل آزادی دی گئی، نیز اپنے مذہب کی دعوت و تبلیغ کی بھی آزادی دی گئی۔ وہاں پر آباد مسلمانوں نے اس آزادی سے فائدہ اٹھایا اور اسلامی تعلیمات سے دوسروں کو متعارف کرایا، جس کے مثبت نتائج برآمد ہوئے اور بڑی تعداد میں لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے، صیہونی عناصر کی طرف سے اسلام کے خلاف پروپگنڈہ بھی ہوتا ہے اور اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلانے کی کوشش جاری رہتی ہے اس کے باوجود اسلامی تعلیمات کی کشش لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے، اور لوگ اسلام کے سایۂ عاطفت میں چلے آتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ۱۹۷۰ء کے بعد اسلام لانے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔

ماریشیس میں دینی مکاتب

گزشتہ دنوں ماریشیس کی وزارت تعلیم نے مصری سفارت خانہ کے تعاون و اشتراک سے قرآن کانفرنس منعقد کیا، جس میں عالم اسلام کی مختلف ممتاز شخصیتوں اور مسلم تنظیموں کے نمائندوں نے شرکت کی، رابطہ عالم اسلامی کی نمائندگی استاذ منیر محمد سعید قطب نے کی، اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے ماریشیسی وزیر تعلیم نے بتایا کہ ان کی حکومت ایک بڑا اسلامی سنٹر قائم کرنا چاہتی ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس سنٹر کے ذریعہ دوسرے دینی مکاتب اور اسلامی مراکز کی نگرانی و سرپرستی کی جائے گی۔ علمی، ثقافتی اور دوسرے تعلیمی میدانوں میں ان کے ساتھ تعاون کیا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ یہ سنٹر دیگر اسلامی مراکز اور حکومت کے درمیان رابطہ کا کام دے گا، خوشی کی بات یہ ہے کہ حکومت کے علاوہ دوسری سیاسی پارٹیوں نے بھی اسلامی سنٹر کے قیام کے پروگرام سے اتفاق کیا ہے۔

قبل ازیں ماریشیش کے چیمبر آف کامرس کے چیرمین جناب عبداللہ ہندوستان آئے

تھے، انھوں نے مارٹینیں کے مسلمانوں کے دینی وثقافتی حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ وہاں مسلمان بچوں اور بچیوں کی دینی تعلیم کے لیے تقریباً پانچ سو دینی مکاتب ہیں، ۱۲۰ مسجدیں ہیں، ابتدائی مرحلے میں عربی بنیادی مضمون کی حیثیت سے داخل ہے، برصغیر سے جانے والے افراد کے بچوں کے لیے اردو کی تعلیم کا بھی نظم ہے، اردو سے دلچسپی کا ایک سبب یہ بھی بتایا کہ اس میں اسلامی علوم کا بڑا ذخیرہ منتقل ہو گیا ہے، عربی کے علاوہ کسی دوسری زبان میں دینی لٹریچر کا اتنا بڑا ذخیرہ موجود نہیں ہے۔

اطالوی زبان میں ترجمۂ قرآن

اخبار العالم الاسلامی مکہ مکرمہ کی ایک خبر مظہر ہے کہ روم میں واقع سعودی سفارت خانہ اطالوی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ کر رہا ہے، اس مقصد کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی جا چکی ہے، جو اس کے مختلف مراحل کی ذمہ داریوں کو انجام دے گی، رابطہ عالم اسلامی کے جنرل سکریٹری نے اس منصوبے پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے، اور ترجمہ کرنے والی کمیٹی کے افراد کو انگریزی اور فرانسیسی میں رابطہ کی طرف سے شائع شدہ ترجمے فراہم کیے گئے ہیں۔

کتابوں کی نمائش

ہر سال موسم خریف میں مغربی جرمنی کے شہر فرانکفورٹ میں کتابوں کی ایک عالمی نمائش کا اہتمام ہوتا ہے، جس میں دنیا کے مختلف ممالک کے اشاعتی ادارے شریک ہوتے ہیں اور اپنے یہاں کی کتابیں نمائش میں پیش کرتے ہیں، اس سال ۱۶ اکتوبر کو اس کا افتتاح ہوا ہے اور دسمبر تک جاری رہے گی، اس نمائش میں نوّے ممالک کے تقریباً سات ہزار اشاعتی ادارے شریک ہیں، خود جرمنی کے دو ہزار سے زائد اشاعتی اداروں نے اپنی کتابیں نمائش کی زینت بنائی ہیں۔ دنیائے عرب کے جن ممالک نے شرکت کی ہے ان میں سے چند یہ ہیں: مصر، شام، سعودی عرب، کویت، الجزائر، سوڈان، لبنان اور لیبیا، دیگر فوائد کے علاوہ نمائش سے ایک اہم فائدہ یہ حاصل کیا جا سکتا ہے کہ اسلامی موضوعات پر دنیا کی مختلف زبانوں میں تیار دینی لٹریچر کو نمائش کے ذریعہ عام کیا جا سکتا ہے اور اس طرح اسلام کا تعارف کرایا جا سکتا ہے۔

REGD. NO. ID (SE)/53 **ZIKR-O-FIKR** Vol. III-Part 2
Reg No. 45862/86 Dec.-1987
G 1/278, Okhla, P O. Jamia Nagar New Delhi-110025

① حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی کی اصلاحی و دعوتی تقریروں کا پہلا سیٹ ①

مولانا ندوی نے جن اہم اسلامی ممالک اور اہم علاقوں کا ملک و بیرون ملک دورہ فرمایا وہاں انھوں نے وہاں کے مخصوص حالات اور مسائل کو سامنے رکھ کر اپنے تاریخی مطالعہ کا نچوڑ، قرآن سے استفادہ کائنات کا باب اور اپنا دردِ دل رکھا، ان تقریروں اور خطبات میں ایسے حقائق و مضامین آگئے ہیں اور ان میں جو دعوت و پیغام اور نقشۂ عمل پایا جاتا ہے وہ نہ صرف ان علاقوں کے لئے جہاں یہ تقریریں ہوئیں بلکہ وہ بیشتر اسلامی ممالک اور دوسرے علاقوں کے اہلِ فکر و نظر کے لئے لائق توجہ اور مستحق فکر و نظر ہیں، اس سلسلے کے حسبِ ذیل مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں جن کی قیمتیں ہماری فہرست کتب سے معلوم ہو سکتی ہیں

مجموعۂ اصلاحیات مولانا ابوالحسن علی ندوی

۱۔ "مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں":۔ جس میں بڑی جرأت کے ساتھ مغربی تہذیب کے نقائص پر نکتہ چینی اور مشرق کے پرستارانِ مغرب کی غلامانہ ذہنیت اور اندھی تقلید پر صاف صاف تنقید کی گئی ہے اور مشرق و مغرب کی درمیانی خلیج کو پاٹنے اور انسانیت کی صحیح رہنمائی و خدمت کے لئے ایک راہِ اعتدال کی نشاندہی کی گئی ہے (عربی اردو اور انگریزی تینوں زبانوں میں دستیاب ہے)

۲۔ "پیامِ انسانیت":۔ پبلک جلسوں کی پانچ اہم تقریریں جن میں زندگی کے مسائل پر نئے طرز سے سوچنے اور نئے طریقے پر کوشش کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔
(فی الحال اُردو و ہندی دو زبانوں میں دستیاب ہے)

۳۔ "مقامِ انسانیت":۔ مخلوط اجتماعات کی پانچ اہم تقریریں جن میں اغراض و تعصبات، قوم پرستی اور سیاسی مقاصد سے بالاتر اور بالکل آزاد و بے تعلق ہو کر عام انسانوں کے سامنے وہ حقیقتیں رکھی گئی ہیں جن پر انسانیت کی نجات اور سلامتی موقوف ہے، اور جن کو نظرانداز کر کے ہمارا یہ پورا تمدن اور پوری انسانی سوسائٹی اس وقت سخت خطرہ سے دوچار ہے۔
(فی الحال صرف اُردو اور ہندی میں دستیاب ہے)

۴۔ "نئی دنیا امریکہ میں صاف صاف باتیں":۔ مولانا ندوی کی ان اہم تقریروں اور خطبات کا فکر انگیز مجموعہ جو انھوں نے امریکہ و کنیڈا میں کی تھیں، جن میں مغربی تہذیب و امریکی معاشرت کا جائزہ، تجزیہ مطالعہ پیش کیا، اور امریکہ میں مقیم مسلمانوں کے بارے میں مشورے تجربے اور اندیشے ظاہر کئے ہیں۔ (عربی، اُردو، و انگریزی تینوں زبانوں میں دستیاب ہیں)

۵۔ "پاجا سراغِ زندگی":۔ طلبائے علومِ نبوت کا منصب و مقام، ملت کی ان سے توقعات، عصرِ حاضر میں ان کی ذمہ داریاں، طلباء و علماء مدارس کے لئے ایک مفید و اہم تحفہ (صرف اُردو میں)

مجلس تحقیقات و نشریاتِ اسلام بکس ۱۱۹ پوسٹ **لکھنؤ**
(ندوۃ العلماء)

Printed at Lahooti Print Aids, Jama Masjid, Delhi-110006
and published by Syed Taha Abdullah, G 1/278, Okhla,
P. O. Jamia Nagar, New Delhi-110052

ایک علمی، دینی اور ادبی ماہنامہ،

ذکر و فکر (دہلی)

مرتبہ

خواجہ احمد فاروقی

مجلس ادارت

خلیق احمد نظامی

عبداللہ عباس ندوی — خواجہ احمد فاروقی

خط وکتابت کا پتہ

جی ۱/۸ ۲۷ ، اوکھلا ، ڈاکخانہ جامعہ نگر ، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵

ایڈیٹر : خواجہ احمد فاروقی

منیجر : محمد شبیر ندوی

پرنٹر پبلشر : نظر عبداللہ

مطبع : لاہوتی پرنٹ ایڈس ، جامع مسجد دہلی ۶

قیمت : ۵۰/ روپے (سالانہ) فی پرچہ ۵/

غیر ممالک سے ۲۰ ڈالر (یا اس کے بالمقابل سکہ ہندوستانی روپے میں)

تمام پرچے ہوائی ڈاک سے بھیجے جائیں گے اور وی پی نہیں بھیجی جائے گی

نوٹ

رقم ڈرافٹ یا منی آرڈر کے ذریعہ ہی ارسال فرمائیں۔ اگر چیک سے رقم بھیجا جائے تو مزید آٹھ روپے مصارف بنک کا اضافہ کرکے بھیجیں۔ نیز ڈرافٹ، منی آرڈر یا چیک مندرجہ ذیل پتہ پر بھیجیں۔

ZIKR-O-FIKR (Monthly)
G-1/27/8, OKHLA, JAMIA NAGAR
NEW DELHI

ماهنامہ

ذکر و فکر

دھلی

جلد ــــــــ (۳) جمادی الاول ــــــ ۱۴۰۸ھ
شمارہ ــــــــ (۲) جنوری ــــــ ۱۹۸۸ء

ترتیب

افتتاحیہ، مقالات، جائزے، تحقیقات اور ادبیات

ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی

مذاکرات

گذشتہ ماہ دسمبر ۱۹۸۶ء کا شمارہ جس وقت پریس میں تھا، اس کی مجلس ادارت کا پہلا نام تاریخ کی امانت بن چکا تھا۔ ایک نامور محقق، مؤرخ، اور پچاس سے زیادہ علمی کتابوں کا مؤلف اپنی زندگی کا سفر مکمل کرکے ابدی زندگی کے حدود میں داخل ہوگیا۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب شبلی اسکول کے آخری ستون تھے، صاحب طرز ادیب، اور وسیع النظر صحافی تھے، علم وفضل کے ساتھ اخلاق اور شرافت کا نمونہ تھے، ان کی عمر ۷۰ سال کی تھی، علم وتحقیق کے اس کوہکن کو موت کے لیے ایک بہانہ کی ضرورت تھی، رکشے سے گرے، ٹرک سے ٹھوکر لگی اور قصۂ عمر چند سکنڈوں کے اندر تمام ہوا۔

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

وہ مسندِ شبلی کی زینت تھے، مولانا سید سلیمان ندوی اور شاہ معین الدین احمد ندوی کے علمی کاموں کے وارث اور اس دبستانِ علم وادب کی آبرو ان سے قائم تھی جس کو شبلی وسلیمان نے اپنے خونِ جگر سے شاداب کیا تھا۔

'فکر ونظر' کی مجلس ادارت میں ان کا نام اس رسالہ کے لیے باعثِ فخر تھا۔ انھوں نے اپنی مشغولیتوں کی بنا پر اس کے لیے کچھ لکھنے کا ارادہ کیا مگر لکھ نہ سکے، اپنی زندگی کی آخری گھڑیوں میں چند سطریں انھوں نے حضرت سید احمد شہیدؒ کے متعلق لکھی تھیں جو اس رسالہ کے لیے پہلی اور ان کی زندگی کی آخری سطر ہے، اس تحریر کی تقریب یہ ہوئی کہ راقم نے اس سیمینار کے متعلق اداریہ لکھ کر انھیں دکھا دیا جو سید احمد شہیدؒ پر ندوہ میں منعقد ہوا تھا اور جس میں وہ شریک تھے۔ مرحوم نے اس کو پڑھ کر کہا، سید صاحبؒ (سید احمد شہیدؒ) پر چند جاندار جملوں کا اضافہ کیجیے، عرض کیا آپ ہی رہنمائی فرمائیں، چنانچہ قلم برداشتہ چند سطریں تحریر کیں اور کہا اس کو اپنی تحریر میں شریک کرلو۔ راقم ہرچند کہ ان کو اپنے اساتذہ کی صف میں سمجھتا رہا، جن کے وہ ہم عمر اور رفیق تھے مگر ندوہ کے جس علمی طرز سے طبیعت مانوس ہے وہاں کسی دوسرے کا مضمون کجا ایک جملہ بھی بغیر حوالہ کے نقل کرنا علمی جرم ہے اس لیے حکم کی تعمیل نہ کرسکا اور ان کی تحریر انہی کے نام سے اپنی تحریر سے

علیحدہ کر کے نقل کر دی۔

سید مرحوم ایک نامور عالم و دانش ور، صاحب قلم ادیب، اور وسیع النظر مؤرخ ہی نہیں تھے ایک صاحب دل بھی تھے، جس میں گداز تھا، درد تھا، اور بے پناہ وسعت تھی، اپنوں کے لیے بھی اور غیروں کے لیے بھی، جب بھی کوئی ان کے معاصرین میں سے کوئی بزم ہستی سے اٹھ جاتا سید صباح الدین کا قلم خون کے آنسو ٹپکاتا جو صفحۂ قرطاس پر آکر منجمد ہو جاتا۔

۱۹۵۳ء میں حضرت سید صاحبؒ (مولانا سید سلیمان ندوی) کی وفات ہوئی، ان کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے جابجا جلسے ہو رہے تھے، مخدوم و مربی مولانا سید ابوالحسن علی حسنی مدظلہٗ نے محسوس کیا کہ ندوہ بھی ایک رسمی تعزیت کا جلسہ اور روایتی انداز کا ریزولیشن پاس کر کے رہ جائے۔ ناکافی ہے۔ طبقۂ علماء کا ایک گل سرسبد اٹھ گیا تھا، علم و تحقیق کا آفتاب نصف النہار غروب ہو گیا تھا اور ندوہ کے وہ لعل شب تاب تھے، ندوہ میں ان کا جنازہ اٹھے تو ذرا دھوم سے اٹھے، ان کے علوم و معارف پر مقالات پڑھے جائیں، ان کی انفرادیت کو نمایاں کیا جائے، آئندہ نسلوں کے لیے ان کے نقوش قدم اجاگر کیے جائیں۔ ایک دو روزہ جلسہ ہوا، اس وقت تک "سیمینار" کا رواج عام نہیں ہوا تھا۔ حضرت سید صاحبؒ کے معاصر اور محب قدیم مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے پہلے جلسہ کی صدارت کی، ملک کے تمام مکاتب اور مدارس و جامعات کے منتخب ترین حضرات تشریف لائے، جن میں مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی ناظم ندوۃ المصنفین، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی ناظم دارالمصنفین، مولانا مسعود علی ندوی سب ہی موجود تھے۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے اپنے لیے جو موضوع انتخاب کیا تھا وہ سید صاحبؒ کے قلم سے نکلے ہوئے 'وفیات' کے منتخب اجزا تھے، جب ان کی باری آئی مائیکرو فون کے سامنے کھڑے ہوئے تو آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے، آواز گلوگیر ہو گئی، وہ اپنا مقالہ سنائے بغیر اپنی نشست پر بیٹھ گئے۔

حضرت سید صاحبؒ کے بعد سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب بھی اپنے معاصرین کے اٹھ جانے پر نوحہ کناں رہے۔ "بزم رفتگاں" کے کچھ اقتباسات اس شمارے میں پیش کیے جا رہے ہیں۔ جہاں تک ادب و انشاء کا تعلق ہے صاف محسوس ہوتا ہے کہ لائق شاگرد نے نامور استاد کے قلم سے قلم ملا دیا ہے، اور جہاں تک

احساسات غم کا تعلق ہے وہ محسوس ہوتا ہے کہ ان میں فن کی آورد نہیں بلکہ سوز دروں کی آمد ہے، اپنے معاصرین کا اعتراف بڑی وسعت قلبی کا طالب ہے، یہ خاندانی جوہر اور شرافت نفس کی دلیل ہے۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب پر بہت کچھ لکھا جا رہا ہے اور لکھا جائے گا، وہ اپنی تصنیفات کے ذریعہ بڑی لمبی عمر پائیں گے، ان کی کتابیں اپنے عنوانات پر منفرد ہیں۔ بزم صوفیہ، بزم تیموریہ، مسلمان حکمرانوں کی رواداری سے لے کر بابری مسجد سے متعلق جو دستاویزیں انہوں نے جمع کر دی ہیں وہ عرصۂ دراز تک ہماری نسلوں کی علمی رہنمائی کریں گی۔ خدا ان کی تربت پر اپنی رحمتوں کے پھول برسائے۔

وسط اکتوبر میں ایک بین الاقوامی اجتماع مکۃ المکرمہ میں منعقد ہوا، یہ اجتماع رابطۂ عالم اسلامی کی دعوت پر "مکہ کانفرنس" یا "مؤتمر مکہ" کے نام سے ہوا جس میں ۱۲۲ ملکوں کے نمائندوں نے شرکت کی۔ نمائندگی ملکوں یا تنظیموں کی نہیں تھی بلکہ مدعوئین کی ذاتی شہرت اور عالم اسلام میں ان کی منزلت کی بنا پر تھی، اس میں شک نہیں کہ اس میں خاصی تعداد اپنی طلب و خواہش پر شاہدین کی حیثیت سے پہنچ گئی تھی، اور عربوں کی مہمان نوازیوں کے دروازے سب کے لیے یکساں کھلے تھے، لیکن کارروائیوں میں شرکت مندوبین تک محدود تھی۔

یہ مؤتمر مکہ کوئی نئی یا ہنگامی قسم کی کانفرنس نہیں تھی، سب سے پہلے ۱۳۴۲ھ میں مملکت سعودی عرب کے مؤسس ملک عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن (متوفی ۱۳۶۳ھ) نے طلب کی تھی جس میں تمام مسلمانوں کے اہم دینی و علمی رہنما شریک ہوئے تھے، ہندوستان سے وفد خلافت بھی شریک ہوا تھا جس کی سرکردگی حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے کی تھی۔ دوسری مؤتمر شاہ سعود بن عبدالعزیز نے ۱۳۸۲ھ میں بلائی تھی، جس میں 'رابطۂ عالم اسلامی' کا قیام عمل میں آیا۔ تیسری کانفرنس مؤتمر المنظمات الاسلامیۃ کی دعوت ۱۳۹۲ھ میں ملک فیصل بن عبدالعزیز مرحوم کے ایماء و اجازت سے رابطۂ اسلام کے سکریٹری جنرل شیخ محمد صالح قزاز نے دی، اسی کانفرنس میں حکومت پاکستان سے مطالبہ کیا گیا کہ قادیانیوں کو علیحدہ اقلیت قرار دیا جائے چنانچہ اس کانفرنس کے دو ماہ بعد پاکستان پارلیمنٹ میں یہ تجویز منظور ہوئی۔ پہلی کانفرنس جو ملک عبدالعزیز مرحوم نے بلائی تھی اس کو اس سلسلۂ مؤتمرات سے علیحدہ کر دیا جائے تو یہ مؤتمر تیسری مکہ کانفرنس تھی۔

اس اجتماع کا موضوع، دعوت اسلام کا مستقبل میں نقشۂ عمل تجویز کرنا تھا، اس موضوع پر سیر حاصل بحثیں ہوئیں اور مستقبل کے نقشۂ عمل میں موزوں اضافہ ہوا، عراق و ایران جنگ، اور گزشتہ حج کے موقع پر ایرانی شورش پسندوں نے اپنی قیادت کے اشارہ پر جو طوفانِ بدتمیزی برپا کیا تھا اس سے عالم اسلام نہ صرف یہ کہ واقف تھا بلکہ تمام دردمندان ملت اس سے بے چین تھے، اس لیے اس کا ذکر آنا قدرتی امر تھا اور وہ بھی جب کہ مکہ مکرمہ میں کانفرنس ہو رہی تھی جہاں یہ شورش برپا کی گئی تھی، اور جو تمام عالم اسلام کا قبلہ ہے ہر مسلمان کے دل و نگاہ کا تار اس وادیٔ ابراہیم سے بندھا ہوا ہے جس کی طرف رُخ کر کے وہ اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ مگر عام طور پر سمجھا جا رہا تھا، اور بدگمانی و سرگرانی کی فضا میں یہ رائے قائم کر لی گئی تھی کہ یہ سارا اجتماع اسی غرض سے ہے۔ علمائے اسلام کی بڑی تعداد نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ ایرانیوں کا ارض حرمین میں مستقلاً داخلہ بند کر دیا جائے، ان کے عقائد باطلہ کا شرعی تقاضہ یہی ہے، مگر سعودی عرب کے علماء اور عالم اسلام کی بعض مقتدر شخصیتیں اس حد تک جانے کو تیار نہ تھیں، ان سب نے مل کر طے کیا کہ یہ شورش ایک سیاسی چال ہے، لہٰذا اس کا تعلق سعودی عرب کے انتظامیہ سے ہے، اس کو حق ہے کہ وہ ان شورشوں کی بنا پر ان پر پابندی لگائے اور ان سے مطالبہ کرے کہ آئندہ اسی وقت ان کو اجازت دی جا سکتی ہے جب وہ اپنے عمل سے تائب ہوں، اور ایران کی خمینی انتظامیہ اس کا عہد کرے۔ سعودی عرب حکومت اپنی جگہ پر مضبوط حکومت ہے، اس کو کسی دوسرے ملک سے رضاکار بلانے یا کسی معاونت کی حاجت نہیں ہے لیکن اگر ضرورت پڑی تو پورا عالم اسلام اپنے تمام اندرونی و باہمی اختلافات کو نظر انداز کر کے حرمتِ کعبہ کے لیے تمام بندشوں کو توڑ کر ہر قسم کی قربانیاں دینے کے لیے تیار پایا جائے گا۔

مسلمان اپنی کمزوری کی بنا پر ضرب المثل ہو چکے ہیں، افتراق و خود غرضی نے ان کو ٹولیوں میں تقسیم کر رکھا ہے، اختلاف فکر اور اختلاف مذاق و رجحان کی بنا پر ایک ٹولی کے اندر کئی کئی گروہ پائے جاتے ہیں، افراد کی سیرتیں بھی معیاری کیا غیر معیاری اقوام کے ہم پلّہ نہیں ہیں، لیکن ان تمام انفرادی و اجتماعی خرابیوں اور کوتاہیوں کے باوصف دو چیزیں ایسی ہیں جن میں وہ کسی قسم کا سودا نہیں کر سکتے۔ رند و زاہد، فاسق و پارسا، نیک و بد سب کے سب متحد ہو کر ہر مقابلہ کے لیے تیار اور ہر خطرہ کو قبول کرنے کے لیے مستعد ہو جاتے ہیں ـــ ان میں ایک تو ذات گرامی ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی، آپ کی ذات گرامی

پر اگر کسی نے چھینٹ ڈالنے کی ہمت کی تو مسلمان اپنے خون کی کوئی قیمت نہیں سمجھتے۔ دوسرے حرمت حرمین اس کے لیے نہ تو ان کو کسی لالچ کی ضرورت ہے نہ کسی حکومت کے خزانہ سے توقع رہتی ہے، نہ قومی مصلحت نہ قومی مفاد ــــ ان تمام مفادات پر سب بالا مفاد یہی بن جاتا ہے کہ حرمین کی حرمت پر آنچ نہ آنے پائے۔

بدقسمتی سے ایران نے اپنی سیاسی مہم کا آغاز حرم پاک کے تقدس کو ملوث کرنے کی کوشش سے کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ کئی ماہ اس حادثہ کو گزر چکے مگر عالم اسلام میں ایک آگ سی لگی ہوئی ہے، مؤتمروں کا سلسلہ چل پڑا ہے۔ افریقہ، یورپ، امریکہ سے لے کر ہندوستان، پاکستان، انڈونیشیا، ملیزیا اور فلپائن تک ہر جگہ کے مسلمان غم و غصہ میں بھرے ہوئے ہیں۔ سعودی عرب کی حکومت چونکہ خود بھی چوکنا اور سازشوں سے باخبر ہے، اور ہر طرح کے فتنوں کو دبانے کی صلاحیت رکھتی ہے، اس لیے لوگ کسی درجہ خاموش ہیں۔ اگر خدانخواستہ خود اس کی طرف سے کسی تساہل یا اغماض کا اظہار ہوتا تو قیامت آجاتی، مسلمان نہ اپنی حکومتوں کی پرواہ کرتے اور نہ کسی عرب حکومت کی۔

ربیع الاول کے دوسرے ہفتہ میں رابطہ ادب اسلامی کی دعوت پر ایک مذاکرۂ علمی (جس کو عرف عام میں سیمینار کہا جاتا ہے) لکھنؤ میں منعقد ہوا، اس رابطہ کی عالمی برادری کے سربراہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی مدظلہ ہیں، اور ریاض، دمشق، قاہرہ اور مدینہ منورہ کی یونیورسٹیوں کے اساتذۂ ادب اس کے ارکان ہیں، اس کی ایک شاخ ترکی میں بھی ہے جس نے 'اسلامی ادب' پر مقالات کا ایک مجموعہ شائع کیا ہے۔ ہندوستانی شاخ کی طرف سے جو مذاکرہ ہوا اس کا عنوان تھا: "حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد کے اردو ادب پر اثرات" اس مذاکرہ میں اسلام پسند ادبا کی خاصی تعداد جمع ہوگئی تھی۔ نام اس لیے نہیں ذکر کیے جا رہے کہ اگر کسی کا نام چھوٹ گیا تو بعد میں خواہ اس کو یہ خیال نہ گزرے مگر خود راقم الحروف کو افسوس رہے گا۔

مقالات تحقیقی تھے اور محنت سے لکھے گئے تھے، خاص بات یہ تھی کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی الحسنی مدظلہ، بہ نفس نفیس پورے اجلاس کی ہر نشست میں شروع سے آخر تک شریک رہے، ایک تو سید احمد شہیدؒ کا ذکر ــــ اور اس ذکر خیر کی مجلس میں مولانا کی عملی شرکت ایسی تھی جس نے اجلاس کو بڑی معنویت بخشی اور تمام جلسوں پر روحانی کیف طاری رہی۔ جلسوں کی صدارت مولانا کے علاوہ پروفیسر خواجہ احمد

فاروقی، پروفیسر مشیر الحق (وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی)، سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ناظم دارالمصنفین واڈیٹر معارف، اور مولانا ابوالعرفان خانصاحب صدر شعبہ علوم شرعیہ نے کی۔ مولانا سید محمد رابع ندوی اس اجلاس کے روح رواں تھے، اور ان کے معاون مولانا عبدالنور ندوی نے بڑی نفاست اور حسن ترتیب کے ساتھ آداب محفل کو قائم رکھا اور ضیافت کی سعادت ندوۃ العلماء کو حاصل ہوئی۔

"حضرت سید صاحبؒ کی تحریک جہاد کا اردو پر کیا اثر پڑا" یہ ایک بہت جاندار موضوع تھا مجھے مسرت ہے کہ جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے حسب ذیل سطروں سے اس 'مذاکرات' میں وقیع اضافہ فرمایا:

"حضرت سید احمد شہیدؒ کی زندگی سے مجاہدۂ زندگی، مجادلۂ زندگی اور معرکۂ زندگی کا درس ملتا ہے، اور یہ زندگی اسد اللّٰہی اور عشق رسولؐ کی سرشاری کی زندگی تھی جس سے اردو شاعروں، ادیبوں اور مصنفوں کو ایک بہت ہی اہم موضوع ملا، اور خدا جانے کتنے شاعروں نے اس کے ذریعہ سے اپنی نواسنجیوں کو پُرکیف بنایا اور کتنے نثر نگاروں نے اپنی نثر کو وہ اثر دیا کہ زبان و ادب میں یم زندگی، دمادم زندگی، سطوت زندگی اور حشمت زندگی کی پوری مرقع آرائی ہو تو اس سے زندگی میں تموج، تلاطم اور ہلچل پیدا ہوتی رہتی ہے، اور اس سے زبان و ادب متمول بلکہ گداز اور جاں سوز بھی ہوتا ہے، محض بلبل کی نغمہ سرائی گلاب کی رعنائی، سبزہ کی لہلہاہٹ کی تفریحی اور ذہنی تصوّر کشی سے زندگی کو انعام زندگی اور خرام زندگی کا سبق نہیں حاصل ہوتا حضرت سیّد احمد شہیدؒ بریلوی اور ان کے سرفروش اور جاں باز شہیدوں کی زندگی کے کارناموں سے متاثر ہو کر اہل قلم نے جتنا لٹریچر اردو زبان میں پیدا کر دیا ہے اور جس طرح آج بھی یہ انداز میں گرمی اور طرز ادا میں حرارت پیدا کر رہا ہے اور کرتا رہےگا وہ یقیناً اردو زبان کا رأس المال ہے۔ ان مجاہدوں کی زندگی خود ایک کتاب ہے اور ان سے نہ معلوم اردو میں کتنی کتابیں تیار ہوتی رہیں گی، اور یہی اردو زبان و ادب میں ان کی بہت بڑی دَین ہے۔"

✱✱

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی
دہلی یونی ورسٹی، دہلی

مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن

قومی آواز سے یہ خبر معلوم کر کے کہ مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن نے ۱۸ر نومبر کو ایک سڑک کے حادثہ میں ناگہانی انتقال فرمایا، دل و دماغ کی جو کیفیت ہے وہ احاطۂ بیان سے باہر ہے:

مرگِ مجنوں سے عقل گم ہے میر
کیا دِوانے نے موت پائی ہے

وہ علامہ سید سلیمان ندوی کے شاگردِ رشید اور شبلی اسکول کے آخری ممتاز فرزند تھے زندگی بھر کسی نے اُن کے اِس استحقاق سے سرتابی نہیں کی۔ انھوں نے 'معارف' کو جس خوبی سے مرتب کیا اور جو بلیغ شذرات لکھے وہ اردو نثر کی تاریخ میں نظرانداز نہیں کیے جا سکتے۔ انھوں نے مذہبی رواداری کے نام سے تصانیف کا جو سلسلہ شروع کیا تھا، اس سے ذہن کے بہت سے جالے دور ہو گئے اور تاریخ کے بعض اہم گوشے منور ہو گئے۔ مواد کی گرد آوری، قوتِ آخذہ کی توانائی اور نقد و تبصرہ کی بصیرت میں، موجودہ دور کے کم مصنفین اُن کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ دینی، ملّی، قومی اور اجتماعی کاموں میں بھی وہ آگے آگے رہے اور زورِ قلم دکھلایا۔ مسلم پرسنل لا سے لے کر یورپ کے مستشرقین تک وہ ہر اسلامی مسئلہ پر بڑے اعتماد کے ساتھ لکھ سکتے تھے اور یہ بھی ایک دلیل اُن کی جامعیت کی ہے۔ چند مہینے ہوئے انھوں نے امریکہ میں جو مقالہ حضرتِ امیر خسرو کی موسیقی پر پڑھا تھا، وہ ان کے وسیع مطالعہ کا شاہد ہے۔ کلکتہ میں انھوں نے جو بصیرت افروز تقریر مولانا محمد علی پر کی تھی یا لکھنؤ میں ابھی جو دل پذیر تقریر سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے اثرات پر کی تھی، اس کے الفاظ اب بھی میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ میری تصنیف 'عمرِ رائیگاں' پر

جوان کا ریویو اکتوبر ۱۹۸۵ء کے معارف میں شائع ہوا، وہ اسلوبی دل کشی اور محبت ازلی کا آئینہ دار ہے۔

شبلی اسکول کے اسلوب کی خصوصیت اعتدال و توازن، فکری تہ داری، حسن کاری، نزاکت احساس اور ایک خاص قسم کی ندرت ادا ہے جو مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن کو بھی وراثت میں ملی تھی۔ ان کی عروس نثر میں یہ طرح داری، درد کی شدت اور روح کی پاکیزگی سے پیدا ہوتی تھی اور جو آج ہماری سب سے بڑی دولت ہے۔

مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن کے اُٹھ جانے سے علم و ادب سوگوار ہیں۔ اردو زبان نوحہ کناں ہے۔ شبلی اکادمی بے رونق ہے۔ وہ ذرہ جو قدیم اخلاق کے نمونوں کو پیش کرتا تھا اور جو قدیم و جدید کے درمیان ایک کڑی تھا ختم ہو گیا۔

شبلی اکادمی کے اس بین الاقوامی سمینار نے، جو اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر منعقد ہوا تھا اور جس میں شرکت کی سعادت مجھے بھی حاصل ہوئی تھی، مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن کی شہرت کو ہندوستان کی فضا سے نکال کر یورپ۔ امریکہ اور تمام عالم اسلامی میں پہنچا دیا تھا۔ ہمارے پڑوسی ملک پاکستان نے ہمیشہ اُن کے راستہ میں آنکھیں بچھائیں اور دارالمصنفین کی مطبوعات کی رائلٹی کا ایک ایک پیسہ ادا کیا۔

کچھ لوگوں سے مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن کی کامیابی کی یہ درخشندگی کسی طرح نہ دیکھی گئی اور انھوں نے دارالمصنفین کے خلاف جھوٹے مقدمے دائر کر دیے تاکہ وہ جمعیت خاطر اور سکون ذہنی سے کام نہ کر سکیں۔ لیکن ندوہ کے سمینار میں جو ۱۱/۱۲/ نومبر ۱۹۸۶ء منعقد ہوا وہ مجھ سے کہتے تھے: "مجھے کامل یقین ہے یہ مقدمے انشاءاللہ ہمارے حق میں فیصل ہوں گے اور دشمن کو مات ہوگی"۔

مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن میرے عزیز دوست تھے۔ مجھے دہلی اور علی گڑھ دونوں جگہ ان کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا تھا۔ بڑے سادہ مزاج، شیریں گفتار، خوش خلق، پُرمحبت، صاحب ذوق اور اہل دل بزرگ تھے۔ اتباع سنت کا بڑا اہتمام کرتے تھے لیکن خاموشی سے۔ انھوں نے کبھی اپنے زہد، عبادت گزاری اور دعائے نیم شبی

کا اعلان نہیں کیا۔

مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن کی رحلت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہماری محفلِ ادب سونی ہوگئی اور علم و عرفان کا ایک فانوس تھا جو بجھ گیا۔ اللہ تعالیٰ دارالمصنفین کو قائم رکھے اور اس کی سرگرمیاں اسی طرح جاری رہیں۔ اگرچہ مجھے یہ ڈر ہے کہ آج مئے مردافگنِ عشق کا حریف ہونا آسان نہیں ہے۔ اسے عاشق تو مل جائیں گے لیکن دیوانہ مشکل سے ملے گا۔

ع تراعاشق شود پیدا، ولے مجنوں نہ خواہد شد

مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن بالکل ناگہانی اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ لیکن یہ بات لائقِ ذکر ہے کہ انھوں نے برسرکوئے مغاں یعنی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے آستانۂ گرامی پر جان دی:

شاد بادا روحِ آں رندے کہ او
برسرکوئے مغاں یابد وفات

مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن کی علمی و ادبی سرگرمیوں پر بہت طویل تبصرہ ہوسکتا ہے لیکن اقبال کے الفاظ میں سب سے مختصر لیکن سب سے اہم بات یہی ہے کہ:

نہ پیوستم دریں بستاں سرا دل
زبندِ ایں و آں آزادہ رفتم
دریں گلشن مثالِ صبح گاہی
گلاں را آب و رنگے دادہ، رفتم

بزم رفتگاں میں

"بزم رفتگاں" مرحوم سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کے تعزیتی مقالات کا مجموعہ ہے، اس کے چند اقتباسات نقل کیے جا رہے ہیں جو ان کی انشا کے اچھے نمونے ہیں۔

پہلا اقتباس مرحوم کی اس تحریر کا ہے جو انھوں نے مولانا شاہ معین الدین ندویؒ کی وفات پر قلمبند کیا تھا، شاہ صاحب سید صاحب مرحوم کے استاد نہیں تھے، معاصر تھے، اور دارالمصنفین کے کاموں میں ان کے رفیق تھے، البتہ عمر و عہدہ کے لحاظ سے بڑے تھے، ایسے موقع پر بعض لوگوں کو اپنی "شخصیت" کو منوانے اور اجاگر کرنے کا موقع مل جاتا ہے، مرحوم سے زیادہ اپنا 'ذکر خیر' اس وسعت کے ساتھ کرتے ہیں کہ ان کو واقعات کو مسخ کرنے میں بھی تکلف نہیں محسوس ہوتا، یہی نہیں بلکہ صداقت کے حدود میں اپنے کو پابند رکھنا بھی غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ سید صباح عبدالرحمٰن صاحب مرحوم کی تحریر میں اور بین السطور میں کہیں بھی اس کی جھلک نہیں ملتی۔ شاہ صاحب کا ذکر سید مرحوم اس طرح کرتے ہیں:

"اقبالؔ کا خیال تھا کہ سوگواری کی ظلمات میں مرنے والوں کی یادوں کی جبین اسی طرح چمکتی رہتی ہے جس طرح اندھیری رات میں تارے چمکتے رہتے ہیں، معلوم نہیں کب تک میری آنکھیں دیکھتی رہیں گی کہ وہ آرہے ہیں، جا رہے ہیں، خدا جانے کب تک میرے کان سنتے رہیں گے کہ وہ پکار رہے ہیں، اُلجھ رہے ہیں، الجھ کر میری باتوں کو مان رہے ہیں، ان کی وجہ سے میرے لیے دارالمصنفین کی ہر صبح حسین اور ہر شام رنگین تھی، مگر اب ان کے بعد اس کی خاموش فضا بڑی غمگین اور اس کی سونی رات کی تاریکی انتہائی اندوہ گیں ہو گئی ہے، اس کے احاطہ میں شام آتی ہے تو میرا دل مفلس کا چراغ بن کر بجھا بجھا سا رہتا ہے، استاذ محترم حضرت سید صاحب جنھوں نے لکھنا پڑھنا تو سکھایا تھا، ماتم کرنا نہ سکھا سکے تھے، کیسے لکھوں کہ آہ! بزم شبلی کی قندیل کی آخری

شمع بجھ گئی، سلیمان کی امانت کا بار اٹھانے والا آسمان پر اٹھا لیا گیا، دارالمصنفین کی شاندار روایات کو سینے سے لگائے رکھنے والا سپردخاک کردیا گیا اور اپنے ایک ہمراز، ہم مشرب اور ہم پیالہ کی تنہائی اور بے چارگی پر دارالمصنفین کے پھول پتے، شجر اور حجر کو رونے کے لیے چھوڑ گئے، حالی نے اپنے استاد غالب کی وفات کے بعد بزم سلطانی، تخت خاقانی، راح ریحانی، عقل ربانی اور حسن کنعانی کو فانی پاکر ہستی کو محض سراب اور طلسم خیال پایا تھا، اب سے پہلے حالی کے ان جذبات کو محض شاعرانہ تخیل سمجھتا تھا، مگر اب محسوس ہوتا ہے کہ یہ کیفیات حقیقت بھی بن جاتی ہیں۔ کاش میں تھوڑی دیر کے لیے متمم بن نویرہ بن جاتا تو جس طرح وہ اپنے بھائی کی موت پر مرثیہ لکھ کر خود رویا اور گلی گلی گھوم کر دوسروں کو رلایا، اسی طرح میں بھی پُردرد نوحہ لکھ کر روتا اور لوگوں کو رُلاتا؛

خوں شد دل خسرو ز نگہداشتن راز
چوں ہیچ کسے محرم اسرار ندارد

مولانا سید نجیب اشرف ندوی کا ذکر اس طرح شروع کرتے ہیں :

"مصائب اور تھے پر ان کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

اس مقالہ میں ہم کو ایک ایسی ممتاز اور ہر دل عزیز شخصیت کا ماتم کرنا ہے جس میں علمی رعنائیوں، ادبی دل آویزیوں اور انسانی خوبیوں کی بڑی رنگا رنگی تھی، جناب سید نجیب اشرف ندوی (جن کو مرحوم لکھتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے) ایک اچھے مورخ تھے، ایک اچھے ادیب تھے، ایک اچھے نقاد بھی، ایک اچھے ایڈیٹر بھی اور بہت ہی محبوب استاد بھی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک بہت شریف انسان بھی تھے جن کا دل محبت، شفقت، موانست اور اخلاص کی خوشبوؤں سے عطر بیز تھا۔

مجھ کو شروع سے ان کی زندگی کے مختلف جلوؤں کو دیکھنے کی سعادت حاصل رہی، وہ میرے شفیق بزرگ اور ہم وطن تھے، میرا بچپن کا زمانہ تھا تو ان کا عنفوان شباب تھا، جب میرا عنفوان شباب تھا تو وہ جوان رعنا تھے، میں جب جوان ہوا تو وہ سن کہولت کو پہنچے،

اور جب میں سن کہولت کو پہنچا تو وہ بوڑھے تھے، اور جب میں بوڑھا ہونے کو آیا تو ان کو تسنیم وکوثر کے کنارے کھڑا پاتا ہوں، جہاں وہ اس وقت کہہ رہے ہوں گے،

ہماری یاد جب آئے تو دو آنسو بہا دینا

ان کے عنفوانِ شباب ہی سے مجھ کو ان کی یہ خوبی دیکھنے میں آئی کہ وہ اپنے ہم وطن چھوٹے عزیزوں میں اپنی رس بھری باتوں سے علمی وادبی ذوق پیدا کرنے کی کوشش کرتے، کبھی ان کو چھیڑ کر بیت بازی میں مشغول کر دیتے، کبھی اصلاحی قصے کہانیوں کی کتابیں پڑھنے پر آمادہ کرتے، کبھی سنجیدہ ادب کی طرف رغبت دلاتے، کبھی تحریری اور تقریری مقابلہ کرا کے انعام واکرام سے خوش کرتے، میں جب اسکول میں پڑھتا تھا تو میرے ایک مضمون پر انھوں نے مجھ کو پانچ روپیے کا انعام دیا تھا، اس نے میری زندگی کا رُخ ہی بدل دیا، اس وقت ایسا معلوم ہوا کہ مضمون نگار یا مصنف ہونا دنیا کی سب سے بڑی عزّت اور دولت ہے، میرے ایک عزیز ہم وطن دوست سعید الحق مرحوم کو انھوں نے ان کی ایک تقریر پر ایک قیمتی فاؤنٹین پین عطا کیا تھا، جس سے ان کا اتنا حوصلہ بڑھا کہ وہ رفتہ رفتہ اپنی طالب علمی کے زمانہ میں پٹنہ یونیورسٹی کے بہترین مقرروں میں شمار ہونے لگے۔"

آخر میں تحریر فرماتے ہیں:

"ہندوستان و پاکستان میں اردو زبان وادب کے کسی بھی ادیب، شاعر، صاحبِ فن اور خدمت گذار اردو کی وفات کی خبر مرحوم سُن لیتے تو بے چین ہو جاتے، پھر شذرات میں ان کی تحریریں آنسو کی بوندیں ہو جاتیں، انھوں نے ایسے جن اصحابِ فن کا ماتم کیا ہے، ان کی فہرست بڑی طویل ہے، وہ کسی کو ایک مستقل انجمن، کسی کو روایت و تمدن کی شمع، کسی کو ایوانِ ادب کا چراغ، کسی کو علم و فن کا حسین امتزاج، کسی کو ممتاز مفکر، کسی کو ماہر فن، کسی کو خاص دبستانِ انشاء کا بانی، کسی کو ژرف نگاہ محقق، کسی کو بلند پایہ نثر نگار، کسی کو سراپا عمل، کسی کو مجسم ایثار اور کسی کو نڈر علمی مجاہد کہہ کر اس پر آنسو بہاتے۔

اے علم کی شمع کے پروانے، اے اردو زبان وادب کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر، اس دنیا میں تو اپنے علم وادب کے خامہ رنگیں کا ایک حسین نقش چھوڑ کر اس وقت وہاں

ہے، جہاں وہ لوگ بھی ہیں، جن کا تو نے ماتم کیا تھا۔ اب ہم تیرے سوگ میں آنسو بہا رہے ہیں، کیا تیری زندگی علم وادب کا ایک پیامِ رنگیں ہے؟ اقبال نے کہا ہے :

عشق کچھ محبوب کے مرنے سے مرجاتا نہیں
روح میں غم بن کے رہتاہے مگر جاتا نہیں

اس شعر کی صداقت اس وقت سمجھ میں آئے گی جب تیری یاد ہمارے دلوں میں آئے گی اور برابر آئے گی، اکثر آئے گی، جانے والے تجھ پر سلام، ہزاروں سلام، کاش تیری رنگا رنگ خوبیوں کی وجہ سے تیری روح کسی حور کے گیسو میں خوشبو کی طرح سماگئی ہو، تیری تربت پر اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کی بارش ہو، تیری شرافت، تیری محبت اور اور تیرا اخلاص خود تیرے رفیقِ آخرت ہوں گے، بارِ الٰہا! تو اس کو اپنے اسی فیض وکرم سے نواز جس کا وہ محتاج ہو کر تیرے حضور میں آگیا ہے، آمین ثم آمین۔"

لکھنؤ کے مشہور معالج اور مسلمانوں کے سیاسی رہنما ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی پر لکھتے ہیں :

"جب نام ترا لیجے تب اشک بھر آوے

ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی اس جہانِ رنگ وبو میں نہیں رہے، ہاں نہیں رہے لیکن ان کی یادوں کا رنگ اور ان کی خوشبویاں کی فضا میں اب بھی باقی ہے، کون ہے جس نے ان کی وفات کی خبر پا کر اپنے کلیجے کو نہ پکڑ لیا ہو، ان کے غم میں لکھنؤ والے ہی اشکبار نہیں ہوئے، بلکہ پورے ہندوستان کے مسلمانوں کا دل رویا، مسلمان کیا، ہندوؤں کی آنکھیں بھی غمناک ہوئیں، چرن سنگھ، راج نراین اور ان کے ہمنوا ہی نہیں، بلکہ یوپی میں کانگریس حکومت کے وزیر اعلیٰ ہیم وتی نندن بہوگنا بھی تڑپ اٹھے اور بے اختیار ان کے جنازے کو کاندھا دیا۔

لکھنؤ میں اس عاشق کا جنازہ بڑی دھوم سے نکلا، مسلمان رو رہے تھے تو ہندو بھی غمناک تھے کہ شرافت کا یہ پیکر، لکھنؤ کی تہذیب کا یہ مجسمہ، مسلمانوں کے جذبات کا یہ ترجمان، ہندوؤں کا یہ دوست، ہریجنوں کا یہ ہمدرد، غریبوں کا یہ سہارا، بیواؤں کا یہ والی، یتیموں کا یہ غمگسار، مریضوں کا یہ مسیحا، اور فنِ طب کا یہ ماہر آج سپردِ خاک کیا جا رہا ہے۔

آہ! یہ کیسے یقین کیا جائے کہ ان کا روئے روشن اب آنکھوں کو نور نہ بخشیگا، ان کے موتی سے دانت اب چمکتے نہ دکھائی دیں گے، ان کی آنکھوں میں لطف وکرم اب جھلکتے نظر نہ آئیں گے، ان کے دلآویز قہقہے اب سنائی نہ دیں گے، ان کی باتوں میں لینت ومروت کے جو چشمے اُبلتے دکھائی دیتے تھے، وہ فردوس گوش اور جنت نگاہ نہ بن سکیں گے ان کے مطب کے پچھلے کمرے میں ان کی جو سیاسی پکار، قومی للکار اور وطنی جھنکار سنائی دیتی تھی، اب وہ سننے میں نہ آسکے گی۔"

آخر میں تحریر فرماتے ہیں:

"تو مسیحا بن کر مسلمانوں کی سیاست کے افق پر نمودار ہوا، تیری مسیحائی کی فکر یاد آئے گی اور اکثر یاد آئے گی، مسلمانوں کو اب ایک نئے قائد کی تلاش ہوگی، لیکن ان کو تیری جیسی خوبیوں والا رہنما شاید بہت دنوں ہی کے بعد مل سکے گا، مسلمانوں کی سیاست میں جب کبھی ظلمت کے بادل چھا جائیں گے تو ان میں تیری روح ضرور جھانکتی نظر آئے گی، تیری آواز ان کے کانوں میں گونج رہی ہوگی، تیرا پیام اور تیرا طرز عمل ان کی تاریک راہوں میں مشعل راہ بنا ہوگا، تیری قدر تیری زندگی میں اتنی نہیں ہوئی جتنی ہونی چاہیے، مگر تیری شرافت کا بانکپن، تیری وضعداری کا البیلا پن اور تیرے اخلاص کا انوکھا پن اور ہاں معلوم نہیں تیری کیا کیا چیزیں یاد آئیں گی اور لوگوں کا دل کہہ رہا ہوگا:

اٹھ گیا ناوک فگن، مارے گا دل پر تیر کون؟

جانے والے تجھ پر سلام، لاکھوں سلام، تیرے اخلاص، تیری شرافت اور تیری انسان دوستی کے سبب جنت کی حوروں نے تیری پیشوائی کی ہوگی، تیری نیکیوں اور خوبیوں کا اجر عظیم وہاں مل رہا ہوگا، اللہ کی بارگاہ میں تیری قدر اس لیے ہو رہی ہوگی کہ اللہ کے بندے اس دنیا میں تیری دائمی جدائی پر تیری مخلصانہ خدمت اور تیری بے لوث خدمت کو یاد کر کے آنسو بہا رہے ہیں، بار الٰہا! تو نے اپنی مصلحت سے اس محبوب انسان اور مسلمان دوست کو اس وقت اپنے پاس بلا لیا ہے جب ہندوستان کی سرزمین میں اس کی سخت ضرورت تھی، تیری مشیت میں کیا چارہ ہے، مگر تیری رحیمی اور کریمی سے یہی امید ہے کہ وہ مسلمانوں کا سفیر اور ضمیر بن کر اپنے دل میں بہت سے راز لے کر تیرے پاس گیا ہے، اسی راز کی خاطر تو اس کو اپنی آغوشِ رحمت میں جگہ دے، آمین ثم آمین۔"

ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی

قصیدہ بُردہ

(۳)

راقم نے اپنی کتاب 'عربی میں نعتیہ شاعری' میں بطور نمونہ کے قصیدہ بُردہ کے ۵۴ شعر درج کیے تھے، انہی کو 'ذکر و فکر' کے صفحات پر اسلامی ادب کے ضمن میں نقل کیا گیا تھا۔ مگر جن لوگوں نے وہ کتاب نہیں دیکھی تھی۔ یا دیکھی ہوگی مگر ان کو یاد نہ رہا، انھوں نے دفتر سے مطالبہ کیا کہ شمارہ (اگست۔ستمبر) کی مزید کاپیاں بھیجی جائیں، اس کے ساتھ ہی متعدد احباب کا تقاضا ہوا کہ پورے قصیدہ کا ترجمہ اسی طرح کر دیا جائے، اس لیے ان کی فرمائش کی تکمیل کی جارہی ہے۔ (ع ع ن)

۳۶۔ دَعَا إلَى اللّٰهِ فَالْمُسْتَمْسِكُوْنَ بِهٖ   مُسْتَمْسِكُوْنَ بِحَبْلٍ غَيْرُ مُنْفَصِمِ

(آپ نے اللہ کے دین برحق کی طرف لوگوں کو دعوت دی، جن لوگوں نے اس دعوت کو قبول کرکے دین کی رسی مضبوطی سے پکڑلی اور اس سے وابستہ رہے۔ وہ درحقیقت حق تعالیٰ کی اس مضبوط رسّی کو پکڑنے والے ہیں جو کبھی ڈھیلی نہیں ہوسکتی اور نہ ٹوٹ سکتی ہے)۔

اس شعر میں اس آیت کریمہ کی طرف اشارہ ہے: "فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى" (تو جو شخص بتوں سے اعتقاد نہ رکھے اور خدا پر ایمان لائے اس نے ایسی مضبوط رسی ہاتھ میں پکڑلی ہے جو کبھی ٹوٹنے والی نہیں)۔

۳۷۔ فَاقَ النَّبِيِّيْنَ فِيْ خَلْقٍ وَّفِيْ خُلُقٍ   وَلَمْ يُدَانُوْهُ فِيْ عِلْمٍ وَّلَا كَرَمِ

(ہمارے رسول برحق صلی اللہ علیہ وسلم) تمام انبیائے کرام پر ظاہری شکل وصورت کے لحاظ سے
بھی فوقیت رکھتے تھے اور اپنے اخلاق حمیدہ وصفات عالیہ کے لحاظ سے بھی یہ تمام انبیائے کرام
(باوجود اپنی جلالت شان اور شخصی واخلاقی عظمتوں کے) آپ کے مساوی ہونا تو کیا معنی قریب
بھی نہیں ہوسکے نہ علم میں اور نہ سخاوت وبخشش میں ۔

خَلق (خ کو زبر) مراد ظاہری شکل وصورت ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے حسن ظاہر
کی وہ رعنائی عطا کی تھی جس کا اندازہ ___ ایک معمولی سا اندازہ ___ اس روایت سے ہوتا ہے کہ ایک صحابی
حضرت سمرہ بن جندب فرماتے ہیں کہ ایک رات جب پونم (چودھویں کا چاند) پورے جمال وکمال سے تاباں
تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک یمنی چادر (جس میں سرخ دھاریاں ہوتی تھیں) پہنے ہوئے تھے، میں بار
بار چاند کو دیکھتا پھر آپ کو دیکھتا، خدائے پاک جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اس کی قسم کھا کر کہتا
ہوں کہ مجھے آپؐ کا جمال اس چاند سے کہیں زیادہ تابناک نظر آرہا تھا۔ مولانا تمنا عماری پھلواروی ؒ نے اس
پر یہ شعر کہا ہے ؎

رات بھر کیوں نہ تجھے چاند میں دیکھا ہی کروں ان کی صورت سے بہت ملتی ہے صورت تیری

شمائل ترمذی میں حضرت انس بن مالکؓ کی روایت ہے کہ آپؓ نے فرمایا: لم ار مثلہ قبلہ و
لا بعدہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم (آپ کے جیسا نہ میں نے پہلے کسی کو دیکھا اور نہ آپؐ کے بعد
کوئی ایسا نظر آیا ؎

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تم سا کہیں جسے

دوسرا لفظ خُلُق (خ اور ل دونوں کو پیش) عادات وخصائل، رحم ورافت، محبت وشجاعت،
بخشش وکرم، شفقت اور بندہ پروری کی صفات کے لیے یہ جامع لفظ ہے، اس کے بیان کے لیے تو
دفتر کے دفتر ناکافی ہیں ؎

سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے

دوسرے مصرعہ سے شیخ بوصیری ؒ کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام کو المصطفین الأخیار
فرمایا ہے یعنی چنے ہوئے انتخاب کیے ہوئے افراد جن کی نظیر اخلاق وشمائل میں نہیں مل سکتی، ان نبیوں
اور رسولوں (علیہم السلام) میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس درجہ ممتاز اور اس درجہ فائق تھے کہ وہ لوگ

باوجود اپنی عظمتوں کے ہم پلہ کیا ہوتے اس بلندی کو چھو بھی نہ سکے، اس کے قریب بھی نہ جاسکے، اس شعر میں دو باتیں قابل لحاظ اور لائق تشریح ہیں، ایک یہ کہ آنحضرتؐ کی ایسی مدح نہیں کرنا چاہیے جس سے دوسرے انبیائے کرام کا نقص یا کمی معلوم ہو، اور اس شعر میں لم یدانوا (آپ کے قریب بھی آنے نہ پائے) کے لفظ سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ انبیائے کرام کی خدانخواستہ تنقیص ہوگئی۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو اس سے ان کی مطلقاً تنقیص نہیں ہوتی، اس لیے کہ بڑائی اور باعظمت چیز کے بڑاپے کو بیان کرنے کے لیے اسی کے ہم پلہ چیزوں سے نسبت دے کر بیان کیا جائے گا، اگر آپ چاند کی روشنی کو بیان کرنا چاہیں تو یہ نہیں کہیں گے کہ وہ مٹی کے دیوں یا موم بتی یا برقی قمقموں سے فائق ہے، کیونکہ یہ تو ہر شخص دیکھ رہا ہے، اور جانتا ہے، آپ کہیں گے کہ زہرہ و مشتری جیسے روشن ستارے جو تاریک راتوں کو روشن رکھتے ہیں وہ بھی مقابلہ نہیں کرسکتے یا اس کے قریب نہیں جاسکتے، یا آپ کسی بڑے دولت مند کی دولت کو واضح کرنا چاہیں تو یہ نہیں کہیں گے کہ وہ کنگالوں، بھیک منگوں سے زیادہ دولت رکھتا ہے، اگر ایسا کہیں گے تو توہین ہوجائے گی۔ آپ کہیں گے کہ فلاں راجہ مہاراجہ سے اس کی دولت بڑھی ہوئی ہے۔ اس جملہ میں کسی راجہ مہاراجہ کی توہین نہیں ہوتی۔ یہ انداز بیان ہے جس کے ذریعہ بات ذہن نشین کرائی جاتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس مصرعہ میں علم اور کرم کے الفاظ آئے ہیں اور کہا گیا ہے کہ انبیائے کرام علم و کرم میں آپ کے مرتبہ تک نہیں پہنچ سکے، کوئی نادان یہ کہہ سکتا ہے کہ حضور انورؐ تو اُمّی تھے پھر یہ علم کی بات کیونکر کہی گئی، اور ایک حضور انورؐ پر کیا موقوف ہے تمام انبیائے کرام ظاہری مکتب و مدرسہ کے محتاج نہیں تھے، اس کا جواب یہ ہے کہ علم تو وہ ہے جس کا سرچشمہ وحی ہے، اور جو کسی اور ذریعہ سے نہیں حاصل ہوسکتا، دنیاوی علوم تو قیاس و تجربہ سے حاصل ہوتے ہیں، مگر اصلی علم وہ ہے جو وحی کے ذریعہ ملتا ہے وہ تمام انبیائے کرام کو ملا، اور ان سب سے زیادہ رسول کریم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوا۔ فارسی کا یہ مشہور شعر حقیقت کا ترجمان ہے:

حُسنِ یوسف، دمِ عیسیٰ، یدِ بیضا داری　　آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

ایک بزرگ کے متعلق سُنا ہے کہ، فرماتے تھے کہ یہ شعر ناقص ہے، اس شعر کا تو مفہوم یہ ہے کہ تمام انبیائے کرام میں جو خوبیاں علٰحدہ علٰحدہ تھیں وہ سب آپؐ میں جمع تھیں۔ مگر میں یہ کہتا ہوں کہ تمام انبیائے کرام علیہم السلام سب مل کر بھی جن کمالات کو نہ پہنچ سکے وہ کمالات اللہ تعالیٰ نے ہمارے

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو بخش دیے تھے، لہٰذا اس شعر کے دوسرے مصرعہ کو یوں ہونا چاہیئے: 'آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری'

۳۸۔ وَكُلُّهُمْ مِنْ رَسُولِ اللّٰهِ مُلْتَمِسٌ   غَرْفًا مِنَ الْبَحْرِ أَوْ رَشْفًا مِنَ الدِّيَمِ

(یہ سب کے سب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے طلب گار ہیں کہ آپؐ کے دریائے سخاوت سے ایک چلّو، یا آپؐ کے ابر رحمت سے ایک گھونٹ پالیں)۔

(مُلتمِس طلب گار، غَرف ایک چلّو پانی، رَشف ایک گھونٹ، دیم جمع دیمۃ مسلسل بارش)

یہ شعر گزشتہ دونوں شعر سے مربوط ہے۔ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علم وکرم کا یہ حال ہے کہ تمام (طالبانِ ہدایت) سب کے سب درِ اقدس پر کاسۂ گدائی لیے کھڑے ہیں، جیسے آپ کی ذات پاک ایک اتھاہ سمندر ہے جس سے یہ لوگ ایک چلّو پانی کے طلب گار ہیں یا آپ کی ذات گرامی کو یوں سمجھو کہ جیسے مسلسل ابر رحمت برس رہا ہو اور سارا عالم اس سے ایک گھونٹ پانی کا خواہشمند ہے۔

۳۹۔ وَوَاقِفُونَ لَدَيْهِ عِنْدَ حَدِّهِمِ   مِنْ نُقْطَةِ الْعِلْمِ أَوْ مِنْ شَكْلَةِ الْحِكَمِ

(اور یہ تمام انبیاے کرامؑ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور اپنی حدوں پر کھڑے ہیں ان کی حد، علم کا ایک نقطہ ہے یا حکمت کا ایک دائرہ ہے)۔

(شَکْلَۃٌ۔ نقطہ کے ہم معنی)۔

وہ علم وکرم جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام انبیائے کرام پر فوقیت بخشی گئی ہے ان کی وسعت کا یہ حال ہے کہ یہ انبیائے کرام ایک حد پر آکر رُک جاتے ہیں جس سے آگے قدم نہیں بڑھا سکتے، اور آنحضرتؐ کے مقابلہ میں ان کی جو حد ہے اس کو یوں سمجھئے کہ دفترِ علم ومعرفت کا ایک نقطہ ہے۔ یا حکمت و دانائی کا ایک دائرہ ہے۔ شیخ ابراہیم الباجوری اپنی شرح میں لکھتے ہیں کہ جہاں پر تمام انبیائے کرام کے علوم وحکمت کی انتہا ہوتی ہے وہاں سے حضور انورؐ کے علم و دانائی کی ابتدا ہوتی، اس شعر میں "لدیہ" کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں" اس کے نزدیک" ظاہر یہی ہے کہ اس سے مراد حضور اکرمؐ ہیں کیونکہ انہی کا ذکر چلا آرہا ہے اور ان کے علم وکرم کا یہاں تین شعر پہلے سے ذکر کیا جارہا ہے، لہٰذا یہی معنی ہوئے کہ تمام انبیائے کرام آنحضرتؐ کے حضور اپنی حد پر کھڑے ہیں۔ لیکن الباجوری فرماتے

ہیں کہ اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ لَدَیْہِ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہو کہ ان تمام انبیائے کرام کو علم و ادراک کا محض ایک نقطہ حق تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوا ہے اور رب کے سبب راہِ حق پر ثابت قدم اور فرائضِ رسالت کی ادائیگی میں مستعد ہیں۔ اور علم سے مراد اللہ تعالیٰ کا علم ہے جو تمام عالم پر محیط ہے اور تمام انبیاء کو جو علم عطا ہوا وہ علم الٰہی کے مقابلہ میں ایسا ہے جیسے ایک نقطہ ہو۔ علمی لحاظ سے یہ شرح زیادہ بہتر ہے مگر قصیدہ نعت نبویؐ میں ہے اس لیے جو معنی پہلے سمجھے گئے وہی مناسب حال معلوم ہوتے ہیں۔

۴۰۔ فَهُوَ الَّذِیْ تَمَّ مَعْنَاهُ وَصُوْرَتُهٗ ثُمَّ اصْطَفَاهُ حَبِيْبًا بَارِئُ النَّسَمِ

(کیونکہ آپ وہ ہیں جن کے فضائل معنوی (اخلاق و عادات) اور جن کی ظاہری شکل و شباہت درجۂ کمال پر ہیں، ان ظاہری اور باطنی اوصاف کو بخشنے کے بعد آپؐ کو تمام ذی روح کو حیات بخشنے والی ذات (اللہ تعالیٰ) نے اپنا حبیب منتخب کر لیا)۔

اس شعر کا وہی مفہوم ہے جو اوپر ۳۰ ویں شعر کا مطلب تھا، صرف فرق یہ ہے کہ اس شعر میں خَلق ظاہری شکل کا ذکر پہلے تھا، باطنی کمالات کی طرف اشارہ (خُلق) بعد میں تھا، اس میں ترتیب بدلی ہوئی ہے۔ اس کو بلاغت کی اصطلاح میں لَفّ و نشرِ مشوّش کہتے ہیں)، ایک بات زیادہ اس شعر میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ظاہری و باطنی اوصاف مرحمت فرمانے کے بعد اپنا پسندیدہ حبیب بھی بنایا ہے۔

۴۱۔ مُنَزَّهٌ عَنْ شَرِيْكٍ فِیْ مَحَاسِنِهٖ فَجَوْهَرُ الْحُسْنِ فِيْهِ غَيْرُ مُنْقَسِمِ

(آپ اپنے محاسن میں کوئی ہمسر نہیں رکھتے، آپ کی خوبیوں کا جوہر قابلِ تقسیم نہیں ہے)۔

مُنَزَّہٌ کا ترجمہ اردو میں عام طور پر "پاک" کے لفظ سے کیا جاتا ہے، اللہ شرک سے منزّہ ہے یعنی پاک ہے۔ لیکن اس لفظ کا حقیقی مفہوم آجکل کی زبان و تعبیر میں یہ ہے کہ آپ اس سے بلند ہیں کہ آپ کا کوئی مدمقابل یا ہمسر ہو، آپ جیسے محاسن کسی میں نہیں پائے جاتے، اللہ نے آپ کو جو خوبیاں عطا فرمائی ہیں ان میں آپ کا کوئی شریک و ہمدم نہیں ہے، کیونکہ حُسن کی وہ حقیقت جس کو 'جوہر' کہتے ہیں آپ کو ایسا عطا ہوا ہے جو تقسیم ہو ہی نہیں سکتا۔

شارح علامہ الباجوری فرماتے ہیں کہ اس شعر پر ایک اعتراض ہو سکتا ہے کہ حضور اکرمؐ بے شک تمام انبیائے کرامؑ کے سردار اور سب سے اشرف و اعلیٰ ہیں، مگر یہ کہنا کہ آپ کا کوئی ہمسر پیدا نہیں ہوا، درست نہیں کیونکہ رسالت، نبوت، معجزہ، اخلاص، عبادات، حسن اخلاق، یہ تمام باتیں دوسرے انبیائے کرام

میں بھی پائی جاتی تھیں، لہذا آپ تنہا ان اوصاف کے وارث نہیں ہیں، اس اعتراض کا جواب بھی خود ہی دیتے ہیں کہ ان انبیائے کرام کو جو کچھ ملا سب برحق ہے، سچ ہے مگر آنحضرتؐ کے مقابلہ میں ان کی حیثیت ایسی تھی جیسے کسی ضخیم کتاب کا ایک نقطہ ہو، یا دریائے معرفت کا ایک قطرہ۔

۴۲۔ دَعْ مَا ادَّعَتْهُ النَّصَارٰی فِی نَبِیِّهِمْ　　وَاحْکُمْ بِمَا شِئْتَ مَدْحًا فِیْهِ وَاحْتَکِمِ

"نصرانیوں (عیسائیوں) نے اپنے پیغمبر کے بارے میں جو دعوے کیے ہیں ان سے پرہیز کرو، اس کے علاوہ آپؐ کی مدح میں سب کچھ کہہ سکتے ہو۔"

گزشتہ شعر میں لفظ 'شریک' آیا تھا، کہ آپ کی ذات رسالت مآب اپنے محاسن میں شرک سے بری یا پاک ہے، اس سے وہم ہو سکتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نعوذ باللہ خدا کا ہمسر شرک سے برأت میں کہا جا رہا ہے، لہذا اس شعر میں اس کی وضاحت کر دی گئی کہ عیسائیوں کی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا یا خدا کا بیٹا نہ کہنا، اللہ تعالیٰ کی ذات والا صفات کا ہمسر نہ گردانا، نفع و نقصان کا مالک عطا کرنے والا اور سلب کرنے والا نہ سمجھنا، رزق دینے والا، اولاد دینے والا، مینہ برسانے والا، قسمت بدلنے والا نہ سمجھنا۔ یہ چھوڑ کر جو مدح کے پیرائے میں کہنا چاہو کہو اور ہر حال میں اعتدال پیش نظر رہے، کیونکہ یہ سرحد بہت نازک سرحد ہے، فرط عقیدت و محبت میں سرحد الوہیت توڑنے کی ہمت نہ کرنا، بعض لوگوں نے لفظ "احتکم" کو ضرورت شعری کی بنا پر ایک لفظ زائد (حشو) سمجھا ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اعتدال کی راہ پر قائم رہنا،

۴۳۔ وَانْسُبْ اِلٰی ذَاتِهٖ مَا شِئْتَ مِنْ شَرَفٍ　　وَانْسُبْ اِلٰی قَدْرِهٖ مَا شِئْتَ مِنْ عِظَمِ

"آپؐ کی ذات گرامی کی طرف جس شرف کو چاہو منسوب کرو، اور آپؐ کی قدر و منزلت کی جن عظمتوں کو چاہو بیان کرو (سب روا اور مستحسن ہے)۔"

مفہوم واضح ہے کہ سوائے الوہیت یا تشابہ الوہیت کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام خوبیوں کے جامع اور تمام عظمتوں کے حامل ہیں، محبت و احترام اور تکریم و عظمت کی تمام باتیں ان سے منسوب کی جا سکتی ہیں۔

۴۴۔ فَاِنَّ فَضْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ لَیْسَ لَهٗ　　حَدٌّ فَیُعْرِبَ عَنْهُ نَاطِقٌ بِفَمِ

"اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمتوں کی کوئی حد نہیں ہے کہ کوئی بولنے والا

اپنی زبان سے بیان کر سکے ۔"

دفتر تمام گشت و بہ پایاں رسید عمر ماہمچناں در اول وصفِ تو ماندہ ایم

(دفتر کے دفتر مکمل ہو گئے اور عمر بھی خاتمہ کے قریب آئی مگر ہم اب تک آپؐ کے پہلے ہی وصف (خوبی) کو بیان کر رہے ہیں)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات کی کوئی انتہا نہیں ہے، یہ بات صرف جوشِ عقیدت کی بنا پر نہیں بلکہ آیات و احادیث کی روشنی سے ثابت بھی ہے، کہ جس طرح آپ کے کمالات دنیا میں بڑھے ہوئے ہیں اس سے زیادہ آخرت میں ترقی پذیر رہیں گے، قرآن کریم میں ارشاد ہے:

"وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى"

(دنیا سے کہیں زیادہ اُخروی زندگی آپؐ کی بہتر ہے)۔

اسی لیے علماء و مفسرین کا اتفاق ہے کہ اس دنیا سے حیاتِ ناسوتی کے منقطع ہو جانے کے بعد بھی آپ کی ترقیات روحانی جاری ہیں اور تا قیامت جاری رہیں گی، لہٰذا حد اور انتہا اس شئے کی ہوتی ہے جو ایک جگہ پر رُک جائے، اور تکمیل پا جائے، مگر یہاں تو ترقی کا سفر مسلسل جاری ہے اس لیے آپ کی عظمتوں کی کوئی حد نہیں ہے، اور جب ایسا ہے تو آپ کی مدح میں جو کہا جائے سب روا ہے، البتہ کوئی شرک کا مضمون نہ آنے پائے الوہیت اور عبدیت کا فرق ملحوظ رہے خالق اور مخلوق کی پہچان قائم رہے۔

۴۵۔ وَلَوْ نَاسَبَتْ قَدْرَهُ آيَاتُهُ عِظَمًا أَحْيَا اِسْمُهُ حِيْنَ يُدْعٰى دَارِسَ الرِّمَمِ

"اور اگر عظمتوں کے اعتبار سے آپؐ کے معجزات آپ کی شان کے مطابق ہوتے تو جب آپؐ کا نام پکارا جاتا، تو وہ (یعنی آپ کا نام) مُردہ کو زندہ کر دیتا۔"

کہنا یہ چاہتے ہیں کہ آپ کی عظمتیں اس قدر ہیں جن کا اندازہ آپؐ کے معجزات سے نہیں کیا جا سکتا، اگر آپؐ کی عظمتوں کے بقدر آپؐ کے معجزات ہوتے تو جیسے ہی آپ کا نام لیا جاتا مُردے زندہ ہو جاتے، مگر ایسا نہیں ہے۔

[اس شعر میں عربی جاننے والے حضرات محسوس کریں گے کہ "ناسبت" کا فاعل مؤخر آیاتہ ہے اور مفعول مقدم 'قدرہ' ہے۔ دارس الرمم کے معنیٰ وفات پائے ہوئے لوگ کے ہیں۔ دارس: جانے والے، مٹانے والا۔ رِمَمٌ جمع رِمّۃ پرانی ہڈی

ہڈی، یعنی وہ لوگ مٹی میں مل گئے اور ان کی ہڈیاں بھی پرانی ہوگئیں]۔

واضح رہے کہ پیدا کرنا اور مارنا، زندگی بخشنا اور حیات سلب کر لینا محض اللہ کا کام ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بطور حجت کے معجزہ کے طور پر یہ اجازت دی گئی تھی کہ جس کو اللہ چاہے اس کو وہ "قُمْ بِاِذْنِ اللّٰہِ" اللہ کے حکم سے اُٹھ جا، کہہ سکتے تھے، مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی مخلوق اور اللہ کے بندے تھے، ان کو محض معجزہ کے طور پر ایک وقت کے لیے یہ صلاحیت دی گئی تھی۔

ہمارے حضور اکرمؐ کو یہ معجزہ نہیں عطا ہوا، اس کا سبب یہ تھا کہ اس سے کم درجہ کے معجزات پر لوگ قائل ہو گئے۔ دوسرے یہ کہ معجزات عظمت کا پیمانہ نہیں ہیں کہ کسی نبی کا درجہ اس کے معجزات سے ناپا جائے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ اگر اس کے مطابق معجزے دیے جاتے تو کم سے کم مُردوں کو زندہ کرنے کا معجزہ ضرور ہوتا۔ ایک خاص بات یاد رکھنے کے لائق یہ ہے کہ معجزات پیغمبر کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ امتِ دعوت کی ضرورت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے لیے قرآن کا معجزہ قیامت تک کے لیے کافی ہو گیا، اور حضرت عیسیٰؑ کی امت کے لیے مُردہ کو زندہ کرنے کا بھی معجزہ کافی نہیں ہوا، اور ان کی قوم نے اپنی دانست میں ان کو سولی ہی پر چڑھا دیا اور ان کے دین کو اتنا مسخ کر دیا کہ 'خلعتِ الوہیت' پہنا کر فرزندِ خداوندگار کا لقب دیا۔

۲۴۔ لَمْ یَمْتَحِنَّا بِمَا تَعْیَا الْعُقُوْلُ بِہٖ   حِرْصًا عَلَیْنَا، فَلَمْ نَرْتَبْ وَلَمْ نَہِمِ

"(رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے) ہمیں آزمائش یا امتحان میں نہیں ڈالا جس کے فہم و ادراک سے انسانی عقول عاجز رہ جاتیں، اس امتحان نہ لینے کا سبب یہ تھا کہ آپ کو ہماری ہدایت کی بڑی فکر تھی، چنانچہ ہم نہ شکوک میں مبتلا ہوئے اور نہ راہ سے بھٹکے۔"

شعر کا مفہوم یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو ہدایت لے کر آئے وہ خالص انسانی مذاقِ سلیم اور فطرتِ انسانی کے مطابق ہے، اس میں نہ محیّر العقول قسم کے معمّے اور ناقابلِ عمل قسم کے مجاہدات کا حکم ہے کہ انسان کی فہم اور قوت سے بالا امتحان ہوتا جس پر دو چار ہی پورے اترتے یا بالکل کوئی انسان بھی کامیاب نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف آپؐ جو دین لے کر آئے وہ عملی ہے، سمجھ میں آنے والا ہے اور ہر شخص کے لیے قابلِ عمل ہے، کوئی فکر یا کوئی عقل خواہ کسی پیمانے کی ہو، سب اس کو سمجھ سکتے ہیں، کوئی پیچیدہ فلسفہ نہیں ہے جس کو چند بہت اعلیٰ درجے کے ذہین انسان

تاریکیوں کے ذریعہ سمجھ سکیں اور پوری انسانی آبادی اس کے فہم سے عاری ہو۔ بلکہ ایک سیدھا سادا طریقہ ہے جس کو عرف میں مذہب یا راستہ کہتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اور بالکل صحیح ارشاد ہے کہ :

ترکتکم علی المحجۃ البیضاء لیلھا کنھارھا۔ (ہم نے تم کو ایسے راستہ پر لگایا ہے جو اتنا روشن اور صاف ہے کہ اس کی راتیں بھی اس درجہ درخشندہ ہیں جیسے اس کے دن)۔

اسی لیے اس دین کو 'دینِ حنیف' بھی کہتے ہیں کہ سیدھا، قابلِ فہم، قابلِ عمل دین۔ لہٰذا شاعر حضرت بوصیریؒ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ احسان ظاہر کر رہے کہ آپ نے ہمیں دین پر لگایا جس کے قبول کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے لیے ہمیں کسی امتحان سے نہیں گزرنا پڑا اور نہ ہم شک میں مبتلا ہوئے اور نہ راہ سے بھٹکے۔

۴۷۔ أَعْیَا الْوَرٰی فَھْمُ مَعْنَاہُ فَلَیْسَ یُرٰی لِلْقُرْبِ وَالْبُعْدِ فِیْہِ غَیْرُ مُنْفَحِمِ

۴۸۔ کَالشَّمْسِ تَظْھَرُ لِلْعَیْنَیْنِ مِنْ بُعُدٍ صَغِیْرَۃً وَّتُکِلُّ الطَّرْفَ مِنْ اَمَمِ

(جہاں تک دین کا معاملہ ہے وہ تو قابلِ فہم اور قابلِ عمل ہے اس میں کوئی بات گنجلک یا معمہ کی قسم کی نہیں ہے۔ لیکن جہاں تک آپ کی ظاہری و باطنی بلندیوں کا تعلق ہے اس کی تہ تک پہنچنا ناممکن ہے ۔۔ اسی مفہوم کو بوصیریؒ اس طرح فرماتے ہیں: "آپ کی حقیقت کو سمجھنے سے سارا عالم قاصر ہے، آپ نزدیک یا دور سے جس طرح بھی دیکھے گئے لوگ آپؐ کی علو مرتبت کو سمجھنے سے عاجز ہی رہے ، جیسے آفتاب دور سے دیکھا جائے تو چھوٹا سا نظر آتا ہے مگر قریب سے دیکھا جائے تو آنکھ عاجز و درماندہ رہے)۔

(لفظی تشریحات: أَعْیَا: درماندہ کر دیا۔ وَرٰی: دنیا۔ مُنْفَحِم: جواب سے عاجز ہو جانا۔ افحم بند کر دیا، یعنی کسی کو لاجواب کر دیا۔ تُکِلّ۔ کلّ یکِلّ سے: تھکا دینا۔ أَمَم: قریب)۔

چند اشعار میں اوپر یہ کہا گیا تھا کہ آپؐ کی مدح سے زبان عاجز ہے، اسی مضمون کو دوسرے الفاظ میں کہتے ہیں کہ دنیا نے آپؐ کی عظمت کا اندازہ نہیں لگایا، کیونکہ وہ نگاہ ہی دنیا میں نہیں ہے جو آپؐ کی باطنی عظمت کا احاطہ کر سکے۔ قریب سے دیکھنے والے اور دور سے دیکھنے والے کوئی بھی صحیح عظمت کے معیار کو نہ پا سکے، جیسے آفتاب ہے، دور سے دیکھو تو ایک آئینہ یا ڈھال کی طرح نظر آتا ہے مگر وہ حقیقت میں جس قدر بڑا ہے دور سے دیکھنے والا نہیں سمجھ سکتا اور قریب سے کوئی دیکھنے کی کوشش کرے تو آنکھ نہیں ٹھہر سکتی۔

(جاری) ———

مرتبہ: شیخ حمد الجاسر

ترجمہ و تلخیص: ضیاء عبد اللہ (جدہ)

علّامہ عبد السّلام الدّرعی النّاصری کا سفرنامہ حج

(۸)

البزواء:

جمعرات کے روز صبح سویرے بدر سے نکلے، آج ذی الحجہ کی پہلی تاریخ ہے اور اونٹ تیز رفتار نہیں ہیں، خچر اور گھوڑے کمزور تو تھے ہی، اس طویل مسافت کو طے کرنے کے بعد کچھ مریل سے ہو گئے ہیں اور راستوں کی ناہمواری، اونچے ٹیلوں اور نیچی وادیوں میں چلنے کی وجہ سے کچھ اڑیل بھی ہو گئے ہیں، قافلہ کے ساتھیوں کا مزاج یہ ہے کہ غلط سلط روایات اور بے سروپا کی حکایات ان کے اندر اس درجہ مشہور ہیں کہ ہر جگہ رکنا چاہتے ہیں، ابھی بدر سے دو میل آگے نکلے تھے کہ ایک پہاڑی موڑ آگیا، جانے کے راستہ کے دائیں جانب ایک غار ہے، اب مصریوں نے شور مچانا شروع کیا کہ ٹھہرو ٹھہرو یہی وہ غار ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے چھپ کر پناہ لی تھی۔ اب ان میں سے ایک ایک کو پکڑ پکڑ کر سمجھانا پڑا کہ وہ غار جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبرؓ نے ہجرت کے سفر میں قیام کیا تھا اس کا نام جبلِ ثور ہے اور وہ مکہ مکرمہ میں جنوب کی طرف واقع ہے، اور وہ بہت مشہور جگہ ہے، مگر میری کسی نے نہیں مانی۔ ایک نے کہا سفرِ ہجرت میں نہ ہی غزوۂ بدر کے موقع پر تشریف لے گئے ہوں گے، حجۃ الوداع سے واپسی میں اِدھر سے گزرے ہوں گے، مگر بزرگوں کی بتائی ہوئی علامت جھوٹی نہیں ہو سکتی قدرتاً مجھے بھی خاموش رہنا پڑا اور اپنی سواری پر بیٹھے بیٹھے میں نے نیت سے زیارت کر لی۔ دل میں کہا ہو سکتا ہے ان کی بات صحیح ہو، کیونکہ

یہاں کے چپہ چپہ پر یادگاریں ہیں، اور کچھ نہیں تو اتنا ضرور ہے کہ ان پہاڑوں اور راستوں پر میرے آقا و مولیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ پڑی ہوگی، میرے جذبات میں شورش پیدا کرنے کے لیے یہ بھی کوئی کم بات نہیں ہے۔

وہاں سے آگے بڑھے تو پانی کی ایک سبیل دکھائی دی، آپ بدر سے مکہ کو جا رہے ہیں تو بِزْوا سے پہلے دائیں جانب ایک بڑا سا صہریج پتھروں کے سہارے رکھا ہوا ملے گا اس میں پانی بھی بھرا رہتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امیر المومنین محمد بن اسماعیل کی بیٹی خناثہ جب حج کے لیے گئی ہیں تو انھوں نے یہ سبیل لگائی اور اہلِ بدر کو سالانہ ایک رقم ملتی ہے کہ جب یہ صہریج خالی ہو تو پانی سے بھردیں، چنانچہ آج تک یہ سبیل قائم ہے، ہمارے قافلے والوں نے بھی اس سبیل سے فائدہ اٹھایا، آگے کی منزل ایک ریگستانی میدان تھا، اور ایسا میدان جس کے حدِ نظر تک کوئی انسانی آبادی یا درخت یا پہاڑ نہیں تھا، بس چلتے جائیے، سمت صرف آفتاب کے رُخ سے متعین کیا جاسکتا تھا، اگر ذرا رُخ غلط ہو تو آدمی بجائے حجاز کے یمن کی طرف نکل جائے۔ اس ریت زار بھول بھلیاں (بطحاء مُجْمَلة) میں پورے شب و روز چلتے رہے، خیال ہوتا ہے کہ یہ سمندر کے ساحل کا ریگستانی علاقہ ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے موقع پر مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کا سفر کیا تھا[1] اور سراقہ بن مالک بن جعشم نے آپ کا پیچھا جس سرزمین پر کیا تھا وہ رتیلی ریگستانی زمین تھی جس میں اس کے گھوڑے کے پاؤں دھنس گئے تھے، اور وہ اسی وقت ایمان لے آئے تھے، جمعرات کا پورا دن۔ جمعہ کی رات اور جمعہ کے روز عصر تک مسلسل چلتے رہے جب جاکر بِزْوَاء کی وادی ملی، اس کو وادی کہنا بھی غلط ہے، یہ بھی ایک ریگستانی علاقہ ہے، نہ آدم نہ آدم زاد، پانی ناپید، کوئی آثارِ زندگی نہیں، صرف چند علامتیں ایسی بنی ہوئی ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ قافلے یہاں آکر رُکتے ہیں، چند پتھر قبلہ کا رُخ بتاتے ہیں، اور چند پتھروں پر وہ سیاہیاں ہیں جو آگ جلانے اور چولہے بنانے سے باقی رہ جاتی ہیں، مصنف نے اس میدان کا ذکر چند اشعار اور مقفع نثر میں کیا ہے۔

---

[1] مصنف کا یہ اندازہ غلط ہے، کیونکہ سیرت کی کتابوں میں غارِ ثور اور قدید کے درمیان کا راستہ شمال سے جنوب کی طرف جاتا تھا، اور الدرعی جس راستے سے جا رہے ہیں وہ شمال کی طرف مائل ہے۔

ہم لوگوں کے آنے کے پانچ گھنٹوں بعد شامی قافلہ مدینہ سے بدر اور بدر سے بزواء پہنچا، اس نے بتایا کہ مغاربہ کا ایک قافلہ ینبع کے علاقہ میں بدوؤں کے ہاتھوں لوٹا گیا اور انھوں نے حجاج کو پانی نہیں لینے دیا، اس پر لڑائی ہوئی، اور ایک حاجی شہید ہو گئے۔

یہ رات بزواء کے میدان میں گزاری، جو پانی ساتھ تھا اس سے وضو کیا گیا، پانی کی قلت کی وجہ سے افسوس رہ گیا کہ وضو کی سنتیں پوری نہ ہو سکیں یعنی ہر عضو کو تین بار دھونے کا اہتمام نہ کیا جا سکا، مگر اس رات بھی مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے افق پر دیکھنے والوں کو روشنی نظر آئی جس کو انوار و تجلیات باور کیا گیا، اگر یہ انوار نہ ہوں گے تو بجلی کی چمک ہوگی، مجھے تو اس میں حیرت کی بات نہیں معلوم ہوتی کہ اہلِ بصیرت نے انوار و تجلیات کا مشاہدہ کیا ہو، شیخ ابو سالم اور ان کے شیخ ابو بکر سجستانی کا دعویٰ کے ساتھ کہنا کہ یہ صرف بجلی ہی کی چمک ہو سکتی ہے، بے وزن اور بے دلیل بات ہے۔

دوسرے دن ظہر سے پہلے ہم لوگ بزواء سے نکلے اور اسی ریگستانی بھول بھلیاں میں راستہ طے کرنے لگے، کہیں کہیں پر ریت کے تودے پہاڑوں کی طرح اونچے معلوم ہوتے تھے، اس میدان میں سانپ، بچھو بھی کثرت سے ہیں، خود میں نے بڑے بڑے سانپ پھنکارتے ہوئے دیکھے، اگر کسی کو ڈس لیں تو کوئی علاج بھی یہاں ممکن نہیں، اور موت یقینی ہے، مگر اللہ کا فضل ہوا ہمارا قافلہ بچ کر نکلتا رہا، میں نے اس پر چند شعر بھی کہے تھے کہ کس طرح ریگستانی سانپوں سے سابقہ پڑا، اور اللہ نے محفوظ رکھا، اسی ریگستان کو "رمال عالج"[1] کہا جاتا ہے۔ شام ہوتے ہوتے ہم لوگ ایک آبادی میں پہنچے اس کا نام 'مستورہ' ہے، کسی نے اس کا نام 'ی' کے ساتھ 'مستیرہ' بتایا، عوام کا خیال ہے کہ مستورہ عنتر کی بیٹی کا نام تھا، جس کی طرف اصطبل کی نسبت کی جاتی ہے[2]، یہاں ایک بڑا

---

[1] یہ کہنا کہ بزوا اور مستورہ کے درمیان ریگستانی علاقہ کو 'رمال عالج' کہتے ہیں غلط ہے، مگر یہ غلطی بہت سے متقدمین سے ہوئی ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ 'رمال حسنا' ہے جس کے بارے میں کثیر (عزہ) کا شعر ہے: عفت غیقة من اهلها فجنوبها فروضة حسنا، فاعما فكثبيها۔ رہا عالج اس صحراء کا نام ہے النفود الکبیر کے نام سے آج کل مشہور ہے اور حائل کے شمال میں واقع ہے، حجاز اور بلاد الجوف کے درمیان دومۃ الجندل پڑتا ہے۔ (حمد الجاسر)

[2] یہ بھی غلط ہے کہ مستورہ کا نام عنتر کی بیٹی کے نام پر رکھا گیا ہے، کیونکہ بلادِ عنتر نجد کے بالائی علاقہ میں ہے۔ (حمد الجاسر)

کنواں ہے جو پتھروں سے گھرا ہوا ہے، اس کا پانی شیریں ہے، اور بہت گہرا بھی نہیں ہے، اس کے گرد چند گھر آباد ہیں، یہاں ایک قبر ہے جس کی لوگ زیارت کرتے ہیں اس پر گنبد بھی بنا ہوا ہے، یہ قبر حضرت یحیٰی شریف یمنی کی ہے، قبر کی دیکھ بھال کرنے کے لیے ایک مجاور بھی ہے جو زائرین سے صدقات طلب کرتا ہے، بدوؤں نے قبیلۂ حرب کے اعراب کے ساتھ مل کر یہاں ایک بازار بھی بنایا ہے اور اسی جگہ سے قریب وَدّان کی آبادی ہے، الروض المعطار کے مصنف کہتے ہیں کہ وَدّان کا ذکر سیرت کی کتابوں میں آیا ہے، ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ غزوہ "الابواء" جس مقام پر پیش آیا وہ یہی وَدّان کا مقام تھا جو مستورہ سے چند فرسخ دور ہے۔

رابغ۔ جُحفہ:

مستورہ سے ایک رات اور دن کے تین گھنٹوں کی مسافت طے کرنے کے بعد وادی رابغ میں ہمارے قافلے نے پڑاؤ ڈالا، یہ وادی حجاز مقدس کی سرسبز و شاداب وادی ہے، جہاں کثرت سے بارش ہوتی ہے اور متعدد تالاب ہیں جن میں بارش کا پانی محفوظ رہتا ہے اور زمین زرخیز ہے، مکئی (ذرة) اور دُخن کی پیداوار ہوتی ہے، اس کو رابغ اسی لیے کہتے ہیں کہ ربغ کے معنی ہیں آرام و آسائش کے، اور یہاں کے رہنے والے پانی کے محتاج نہیں ہیں اور سبزیاں اگائی جاتی ہیں، جانور تندرست ہوتے ہیں، العبدری نے لکھا ہے کہ رابغ "رغ" سے ہے، بعض لوگ محض غلط فہمی کی بنیاد پر اس کو غین کے بجائے عین سے تلفظ کرتے ہیں، حالانکہ رابع (عین سے) نجد میں ہے، یہاں کا بازار بہت بڑا ہے، یہاں جب ہم لوگ پہنچے تو ملک شام کے حجاج احرام باندھے ہوئے ملے، یہ لوگ چونکہ مدینہ منورہ سے آئے تھے اس لیے احرام ذوالحلیفہ سے باندھ لیا تھا، یہ لوگ ہمارے قافلے کے آنے کے بعد ہی مکہ مکرمہ کی طرف چل پڑے اور ہم لوگ یہاں ٹھہر گئے، یہاں سے تھوڑے ہی فاصلہ پر جحفہ پڑتا ہے جو مصریوں کا میقات ہے، مگر وہاں پانی ناپید ہے، اور وبائی امراض بھی پائے جاتے ہیں، اس لیے مصری حجاج احرام کی سنت غسل یہیں ادا کر کے احرام کی چادریں باندھ لیتے ہیں اور جب جحفہ کے محاذات میں پہنچتے ہیں تو احرام کی نیت کر لیتے ہیں۔ مگر بعض علماء نے اس کو جائز قرار دیا ہے کہ اگر میقات پر پہونچنا ناممکن ہو یا وہاں کوئی خوف ہو، تاریکی ہو، تو اس سے پہلے بھی نیت کی جاسکتی ہے، اور

چونکہ غسل احرام بغیر نیت احرام کے کوئی معنی نہیں رکھتا اس لیے ہم لوگوں نے احرام کا غسل کر کے احرام باندھ لیا، اور دوگانہ ادا کر کے تلبیہ شروع کر دیا، جن لوگوں کے پاس احرام کی چادریں یا چپل نہیں تھیں انھوں نے یہاں سے خرید لیں، ہم سب نے حج افراد کی نیت کی، اور جب ہمارے بائیں جانب جحفہ کا محاذات آیا تو سواریوں پر مزید دو رکعتیں نفل پڑھ لیں، کیونکہ احرام میقات سے کچھ پہلے باندھا جا سکتا ہے مگر نیت میقات کے گزرنے کے بعد نہیں کی جا سکتی۔ شاعر نے اس موقع پر کہا:

تجرّدتُ لمّا وصلتُ لـرابغٍ و لبّیتُ للمولیٰ کما حصل النـدا

وقلتُ إلٰهی! عندك العفو بالغنا وانی فقیرٌ قد اتیت مجـرّدا

(جب ہم رابغ پہنچے تو (عرفی) لباس اُتار پھینکے، اپنے مولیٰ کے حضور "حاضر ہوں" کی صدا لگائی جیسے اس کے حکم کی آواز سنی، اور کہا میرے مالک! تیرے پاس عفو و رحمت کا خزانہ ہے، اور میں محتاج برہنہ پا حاضر ہوا ہوں)۔

رابغ میں احرام باندھنے والے ایک مصری شاعر نے کہا ہے:

وفی رابغ رَکبُ الحجیج تجرّدا لِیسأَل مَولاہ الأمانَ مِنَ الرَّدی

خضوعًا أذِلاًّ، سائلین إلٰهَهُمْ یُفِیضُ علیهم أبحُرَ الجُودِ والنَّدی

(رابغ میں حجاج کے قافلے (عرفی) لباس سے عاری ہو گئے تاکہ ہلاکت میں پڑنے کی اپنے مولیٰ سے امان مانگیں، ان کے سر جھکے تھے، تذلّل کی کیفیت طاری تھی، اپنے اللہ سے طلب گار تھے کہ ان پر جود و سخا کے دریا بہا دے)۔

العبدری نے لکھا ہے کہ رابغ میقاتِ جحفہ سے کچھ پہلے پڑتا ہے، مگر وہاں لوگ اس لیے نہیں جاتے کہ وہ عام شاہراہ سے ذرا دور واقع ہے اور وہاں نہ پانی ہے نہ آبادی۔ بخاری میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جب یہ دونوں شہر (کوفہ اور بصرہ جن کو 'مصران' کہا جاتا ہے) فتح ہوئے تو لوگ حضرت عمر رضی اللہ کے پاس آئے اور کہا کہ امیرالمومنین! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل نجد کے لیے 'قرن' کو میقات بنایا ہے، مگر وہ ہمارے راستے سے بہت دور ہے، اگر ہم احرام باندھنے کی نیت سے 'قرن' جائیں تو یہ ایک مستقل سفر ہوگا، اور وہاں سے آکر پھر دوبارہ شاہراہ پکڑنا ہوگا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس کی مقابل رُخ (محاذات) پر جب پہنچو تو احرام باندھ لیا کرو۔ چنانچہ اس وقت

سے' ذات عرق' میقات قرار پایا، اور چونکہ جحفہ یا اس کے محاذات میں پانی نہیں ہے اور احرام کی سنت یہ ہے کہ اس سے پہلے غسل کیا جائے، اور اس لیے کہ جحفہ اور رابغ کے درمیان زیادہ مسافت نہیں ہے اس لیے اہل مصر یہیں سے احرام باندھ لیتے ہیں، اور میقات سے قربت کا احساس بھی تاثیر رکھتا ہے، اگرچہ ابن المعؤار اس کے برعکس روایت کرتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ میقات سے پہلے احرام باندھا جاسکتا ہے، اور کافی مسافت پہلے باندھنا بہتر ہے، نزدیک آکر باندھنے میں کراہت ہے کیونکہ جب نزدیک آگئے تو اس خاص مقام میقات پر کیوں نہیں آجاتے، واضح رہے کہ اس میں علمائے مغاربہ اور علمائے مصر کا اختلاف ہے کہ کتابوں میں کہیں جحفہ کا نام آتا ہے اور کہیں مھیعہ کا نام ذکر ہے، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ دونوں ایک ہی مقام کے نام ہیں، لیکن مغاربہ کہتے ہیں کہ یہ دونوں دو مختلف مقامات ہیں، اور ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں، جس طرح اہل مدینہ منورہ کی میقات ذوالحلیفہ ہے، مگر اہل سیرت کہیں' البیدا' لکھتے ہیں اور زیادہ تر ذوالحلیفہ۔ لیکن یہ دونوں جگہیں ایک دوسرے سے فاصلہ پر ہیں، العبدری نے مزید لکھا ہے کہ پرانی داستانوں میں یہ بات کہی گئی ہے کہ جحفہ کا قدیم نام مھیعہ تھا، مگر قوم عاد کا ایک قبیلہ بنو عبیل یہاں آکر آباد ہوا، اور ان کے آباد ہونے کا سبب یہ تھا کہ یثرب کے عمالقہ نے ان کا بائیکاٹ کر کے شہر سے باہر نکال دیا تھا تو رابغ سے قریب مھیعہ میں آکر آباد ہوئے، مشارقہ (علمائے مصر و شام) کہتے ہیں کہ جحفہ اس لیے نام پڑا کہ ایک بڑا سیلاب یہاں آیا تھا جس کو' سیل جحاف' کہتے ہیں، جس نے حجاج کو ۸۰ھ میں روک دیا تھا اور وہ حج نہیں کر سکے تھے، اور جحف کے معنی ہیں روکنے کے، مگر یہ روایت بے سروپا ہے، اس مقام کا نام جحفہ اسلام سے پہلے سے ثابت ہے، اور سیلاب آیا ہے ۸۰ھ میں، تو کس طرح حادثہ سے پہلے اس کا نام اس حادثہ کی بنیاد پر رکھ لیا گیا تھا؟ یہ سیلاب عبد الملک بن مروان کے زمانہ میں آیا ہے جس کا سلسلہ مکہ اور طائف تک پھیل گیا تھا اور حرم شریف میں پانی بھر گیا تھا، اور عین یوم الترویہ کے روز سحر کے وقت سے کعبہ کے چاروں طرف پانی بھر گیا تھا، علمائے مکہ نے اس کو عبد الملک بن مروان کے ظالمانہ اور فاسقانہ اعمال کی شامت سمجھا تھا، سیدی عبد المجید الزبادی فرماتے ہیں کہ اہل مصر و شام کی میقات اس وقت تک جحفہ تھا جب تک وہاں پہنچنا آسان تھا اور وہ راستہ میں پڑتا تھا، مگر جب یہ دشوار ہوگیا اور اس وقت سے بالعموم مصری قافلے رابغ سے احرام باندھ لیتے ہیں، مگر کچھ لوگ یہ اہتمام کرتے ہیں کہ

لباسِ احرام تو رابغ میں غسل کر کے پہن لیتے ہیں، مگر نیّت اسوقت کرتے ہیں جب جحفہ کے محاذات سے گزرتے ہیں اور وہاں سے تلبیہ شروع کرتے ہیں۔ جحفہ نہ جانے کا سبب العبدری نے یہ بتایا ہے کہ وہاں بخار کی وبا ہے، جو شخص جاتا ہے، اس کو سخت بخار آجاتا ہے اور بخار کا باعث یہ بتایا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی تھی کہ " اَللّٰھُمَّ حَبِّبْ الینا المدینۃ کحبنا مکۃ اَوْ اشدّ وصححھا وانقُلْ حمّاھا الی المھیعۃ "۔ " اے اللہ! مدینہ کو بھی اسی طرح پسندیدہ بنا دے جس طرح مکہ محبوب ہے بلکہ اس سے زیادہ ہی اس شہر کو محبوب بنا دے، اور اس کو صحت کے لیے سازگار بنا دے اور یہاں جو بخار کی وبا ہے اس کو یہاں سے دور ریگستان میں پھینک دے۔" (مھیعہ دراصل ایسی جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوئی انسانی آبادی نہ ہو، اور جحفہ کے قریب جگہ کا نام بھی ہے)۔

جحفہ اور عسفان کے درمیان غدیرِ خم واقع ہے، جہاں حجۃ الوداع سے واپسی کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا تھا کہ " من کنتُ مولاہ فعلیٌّ مولاہ، اللھم والِ من والاہ وعادِ من عاداہ "۔ (میں جس کا مولیٰ ہوں علی اس کے مولیٰ ہیں، اے اللہ! جو ان کا دوست ہو تو اس کو دوست بنا لے اور جو ان کا دشمن ہو، اس کا تو دشمن ہو جا)۔ یہ مقام جحفہ سے تین میل بائیں جانب ہے، اور غدیر (تالاب) کو ایک چشمہ کا پانی بھرا رکھتا ہے، اور اس کے نواح میں بڑی بڑی جھاڑیاں ہیں جن کو عربی میں خُمّ کہتے ہیں، جب حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدنا ابوبکر صدیقؓ یہاں تشریف لائے تو حضرت ابوبکرؓ کو بخار آگیا، ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے والد ماجد حضرت ابوبکرؓ سے پوچھا، یَا اَبَتِ کَیْفَ تَجِدُكَ، اباجان آپ کیسے ہیں؟ حضرت سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

کل امرئٍ مُصَبِّحٌ فی أَھلہٖ   وَالموتُ أَدْنیٰ من شِراكِ نَعْلِہٖ

(ہر شخص جو اپنے بال بچوں میں صبح کرتا ہے موت اس سے اس درجہ قریب ہوتی ہے جس قدر اس کے جوتے کا تسمہ ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ قریب)۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو مکہ مکرمہ سے بہت محبت تھی، اس مقام پر طبیعت ناساز ہوئی اور مکہ مکرمہ سے ہمیشگی کے لیے چھوٹنے کا خوف ہوا تو حسرت کے ساتھ یہ شعر پڑھنے لگے:

أَلا لیتَ شعری ھَلْ اَبِیْتَنَّ لَیْلَۃً   بوادٍ وحَولی اِذْخَرٌ و جَلیلُ

وھل أَرِدَن یوماً میاہَ مِجَنَّۃٍ   وَھَلْ یَبْدُوَن لی شامۃ وطفیل

(کاش زندگی میں ایک رات ایسی مل جائے جو اس وادی میں گزاروں جس کے ارد گرد اذخر اور جلیل کے درخت ہیں۔ کیا اب میں ایک دن مجنہ کے پانی پر اتر سکوں گا۔ اور کیا شامہ اور اور طفیل (پہاڑیاں) مجھ کو دکھائی دیں گی؟)۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اپنے والد اور حضرت بلالؓ کا حال عرض کیا تو اس پر حضرتؐ نے دعا فرمائی کہ اے اللہ! جس طرح تو نے ہمارے دلوں میں مکہ مکرمہ کی محبت ودیعت فرمائی ہے اس سے زیادہ مدینہ کو محبوب کر دے اور یہاں کی وبا کو 'مهیعه' ریگستانی غیر انسانی آبادی میں پھینک دے۔ اس وقت سے یہ عالم ہے کہ کوئی پرند بھی اس مقام پر زندہ نہیں رہتا۔

قُدَیْد:

قُدَیْد (شُعَیْب کے وزن پر) ایک وادی ہے، جو سمندر سے پانچ میل کے فاصلے پر ہے، یہاں گھاس پھونس مل جاتے ہیں، جو جانوروں کے چارہ کے لیے کام آئیں، بدّوؤں کی تجارت دَلّاع (تربوز) تک محدود ہے، پانی خراب ہے اور صرف کنواں ہے جس سے پانی مل سکتا ہے یہاں ایک چھوٹا سا مکان ہے، پتھروں سے بنا ہوا جس میں مختلف قبائل کے عرب بدّو پناہ گزین کی طرح پر رہتے ہیں، اور کچھ کھجور کے پیڑ ہیں جس پر گزارہ کرتے ہیں، یہاں پہلے زمانہ میں اوس و خزرج کے قبائل کا بُت 'مَناۃ' نصب تھا۔ روایت میں ہے کہ اس بُت کو منہدم کرنے کے لیے ابو سفیان بن حرب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا تھا، اور اسی جگہ یزید کا گورنر مسلم ابن عقبہ المرّی ہلاک ہوا جو مدینہ منورہ کی غارت گری (واقعہ حرّہ) کے بعد لوٹ کر آرہا تھا اخزاہ اللہ۔ وہ مدینہ منورہ سے تباہ کاریوں کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے جنگ کرنے اور مسجد حرم کی حرمت پر حملہ کرنے کی غرض سے جا رہا تھا کہ اللہ نے اس کو ہلاک کیا اور جس کے بعد حصین بن نمیر اس مہم پر گیا۔ یہاں سے متعلق بہت سی روایتیں مشہور ہیں، حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ مدینہ منورہ سے قُدَیْد تک کا راستہ آنحضرتؐ نے روزہ رکھ کر گزارا، اور یہاں سے مکہ مکرمہ تک بغیر روزہ کے رہے۔ یہاں کی وادی وسیع ہے اور زمین پتھریلی یا ریتلی نہیں ہے، زراعت ہو سکتی ہے بشرطیکہ بارش کافی ہو، اور اس کے پانی کو محفوظ رکھنے کا انتظام ہو۔

الروض المعطار میں جحفہ کے ذکر میں لکھا ہے کہ شہدیہی کے پاس ام معبد الخزاعیہ کے خیمے تھے، جہاں وہ مشہور معجزہ پیش آیا کہ آپ نے ایک مریل قسم کی بکری کے تھن کو ہاتھ لگایا اور دودھ کی دھاریں نکلنے لگیں......
میں نے بعض بوڑھوں سے پوچھا کہ وہ جگہ کہاں ہے جہاں یثرب والوں کا بُت 'مناۃ' نصب تھا، مگر کوئی بتا نہ سکا، دل میں کہا یہ اچھا ہی ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا نام و نشان تک مٹا دیا۔

عَقَبَۃُ السَّکَّر:

اس راستے میں چند گھنٹوں کے بعد عقبۃ السکّر سے گزر ہوا، چھوٹے اور کوتاہ قامت پہاڑیوں کا سلسلہ نظر آیا، زمین پتھریلی اور ریتیلی ہے، یہاں بھی مصری حجاج ٹھہرنے اور ایک 'سنّت' ادا کرنے پر مُصر ہوئے یہاں یہ لوگ سَتّو شکر میں گھول کر پیتے ہیں اور ان کی وہمی روایت یہ ہے کہ جب صحابۂ کرام حجۃ الوداع سے واپس گئے تو ان کو سخت بھوک لگی اور کھانے کو کچھ نہ تھا، قدرتِ الٰہی سے یہ بالو ان کے لیے سَتّو بن گئے، اور پہاڑ کے پتھر شکر کے ڈھیلے بن گئے، اور انھوں نے آسودہ ہو کر سَتّو شکر میں ملا کر پیا، اس غرض سے مصری حاجیوں کی تھیلیوں میں سَتّو اور شکر بھی موجود تھی، جس طرح بدر میں ان لوگوں نے لیلۃ القدر منائی تھی اور ہر شخص موم بتّی جلا رہا تھا، یہاں جس کو دیکھئے کوئی بیٹھا سَتّو گھول رہا ہے، کوئی پی رہا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں مَیں نے اس واقعہ کا کہیں سراغ نہیں پایا، اب میں ان کو سمجھاتا ہوں کہ یہ غلط ہے تو الٹے مجھی ہی کو بدعقیدہ اور ناواقف کہتے ہیں اور اہلِ مغرب (مغاربہ) کو کہتے ہیں کہ یہ اولادِ عائشہ لٹیرے بدوؤں کے بھائی بند ہیں، بہرحال کسی طرح یہ رسم ختم ہوئی اور قافلہ آگے بڑھا۔

خُلیص:

عشاء کی نماز کا آخری وقت تھا کہ ہم لوگ خلیص کی وادی میں اترے، یہ وادی سرسبز و شاداب ہے، کھجوروں کے گھنے باغات ہیں، پانی وافر اور شیریں ہے، یہاں پانی کی بہت بڑی نہر تک نصب ہے اور اتنی بڑی ہے کہ جو پیرنا نہ جانے اس میں ڈوب سکتا ہے، مگر اعراب (بدوؤں) کی بھیڑ تھی، سب اپنے اونٹ اور خچر پیش کر رہے تھے کہ اس کو کرایہ پر لے لو، تمھارے جانور تھک گئے ہیں ان کو واپسی میں لے لینا، مگر ہم لوگ ان سے خوف زدہ رہے، معلوم نہیں کیا چالبازی کریں، یا لوٹ لیں، خلیص کا والی سید اہلِ بیت میں سے ہے، بہت ہی نرم خو، نرم مزاج، شیریں زبان، حجاج کا دل سے اکرام کرنے والا، اور صاحب مروت شخص ہے اس نے ہماری بہت دیکھ بھال

کی اور ایک جبۃ ہم سے قبول نہیں کیا۔ پورے سفر میں ایک ہی انسان ایسا ملا جس سے مل کر دل خوش ہوا یہاں اور بھی کنویں ہیں جو پتھروں سے بند کردیے گئے ہیں۔ الامام الصفدی نے اس مقام کی تعریف میں چند شعر بھی کہے ہیں جن کو طوالت کے خوف سے حذف کرتا ہوں۔

عسفان:

خلیص سے آگے بڑھے تو ایک گھاٹی ملی یعنی ایک پہاڑی راستہ کا بلند حصہ جس کو طے کر کے ہم لوگ ہموار زمین میں آگئے، رات بھر چلتے رہے اور کہیں بھی گھنٹے دو گھنٹے سے زیادہ قیام نہیں کیا، جب قافلہ چلتا تو زور زور سے تلبیہ پڑھتے، کچھ لوگ کلمۂ طیبہ کا وِرد کرتے رہے اور درمیان درمیان میں لَبَّیْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّیْكَ کی صدا لگاتے رہے، وقت کم رہ گیا ہے اس لیے سفر میں زیادہ قیام نہیں کر سکتے ورنہ خلیص میں ایک شب و روز گزار لیتے، پھر بھی تھکن کا احساس کم تھا کیونکہ منزلِ شوق قریب آرہی تھی، صبح کی ایک گھڑی گزری تھی کہ عسفان پہنچ گئے، یہاں بھی پانی شیریں ہے، خلیص کے جیسا وافر تو نہیں ہے مگر شکایت کے قابل نہیں ہے۔ روایت ہے کہ یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا لعاب دہن چھوڑا ہے، لوگ بتا نہ سکے کہ متعین طور پر کون سی جگہ ہے جہاں آپ کا لعاب دہن گرا تھا، کسی نے کہا کہ وہ زمین میں جذب ہو کر ختم ہو گیا، مجھے غیرت آئی اور فی البدیہہ دو شعر کہے:

عَسفانُ رُدُّ وَ تَضَلَّعُ مِنْهُ فَفِیْهِ شِفَاءُ
لَا تَقُلُ قَالُوْا غَارَتْ رِیق النبی رَوَاءُ

(اے عسفان کی وادی لوٹا دے (وہ نعمت) اور اس سے پُر رہ، کیونکہ اس میں شفا ہے، یہ نہ کہہ کہ لوگ کہتے ہیں کہ زمین میں جذب ہو گیا۔ نبی کریمؐ کے لعابِ دہن میں سیرابی ہے)۔

مَرّ۔ سَرِف:

عسفان سے چند میل آگے بڑھے تو مَرّ کی وادی نظر آئی مگر ہم لوگ بدستور چلتے رہے، اور سواریوں کو تیز بھگاتے ہوئے وادی سَرِف پہنچے، یہاں شاہراہ پر ایک چھوٹا سا مقبرہ ہے جو حضرت ام المومنین میمونہ الہلالیہ کی آرام گاہ ہے، یہاں اعراب ضرورت کی چیزیں فروخت کرنے آجاتے ہیں کیونکہ

ان کو معلوم ہے کہ حجاج اس قبر کی زیارت کو اُتریں گے۔ روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عمرۃ القضا سے واپس آرہے تھے مکہ مکرمہ میں ان سے نکاح کیا تھا، اور اس وقت دونوں احرام کی حالت میں نہیں تھے کیونکہ عمرہ کے مناسک ادا کر چکے تھے، یہ نکاح آپ کے چچا العباس بن المطلب نے کرایا تھا اور مہر چار سو درہم عطا فرمایا گیا تھا، اور یہیں یہ آیت اُتری تھی: "وامرأۃ مؤمنۃ ان وھبت نفسھا الخ" یعنی اگر کوئی مسلمان خاتون اپنے آپ کو خدمتِ اقدس کے لیے ہبہ کر دے تو اس کا قبول کرنا آپ کے لیے جائز ہے، اور ان کا انتقال اسی جگہ ہوا۔ الروض المعطار میں ہے کہ وہ مکہ مکرمہ ہی سے بیاہی تھیں مگر ان کی تمنا تھی کہ آنحضرتؐ کی زوجیت میں شمار ہونے کا شرف حاصل ہو، اس لیے ان کی تمنا اور حضرت عباس کی سفارش پر آپؐ نے ان کو ازواج مطہرات میں قبول فرمایا تھا، ان کا انتقال ۵۱ھ یا ۶۱ھ میں ہوا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ان کے جنازہ کی نماز پڑھی اور متعدد صحابۂ کرام نے مل کر دفن کیا۔ رضی اللہ عنہا

التنعیم:

سَرِف سے چلے تو پہاڑی راستوں کا سلسلہ شروع ہو گیا ہمارے بائیں جانب طائف کی سمت میں جعرانہ پڑتا ہے جو یہاں کی بہ نسبت مکہ مکرمہ سے زیادہ قریب ہے، اور جہاں آپؐ نے احرام باندھا تھا اور حنین سے واپسی کے بعد مال غنیمت تقسیم کیا تھا۔ حدیث میں ہے کہ "پھر آپؐ جعرانہ آئے اور دو رکعت نماز احرام پڑھی اور احرام باندھ لیا، اس کے بعد سواری پر آگئے" الخ۔ ہم لوگ مسلسل چلتے رہے یہاں تک کہ دوسرے روز چاشت کے وقت تنعیم پہنچ گئے" یہ مقام مکہ مکرمہ سے دو فرسخ پر ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے تین میل پر ہے، کچھ لوگ چار میل بھی بتاتے ہیں۔ اس کا نام تنعیم اس لیے پڑا ہے کہ اس کے دائیں جانب جو پہاڑ ہے اس کا نام نعیم ہے، اور اس کے بائیں جانب وادی کا نام نُعمان ہے، جہاں اراک کے درخت ہوتے ہیں اور جن کی مسواکیں بہت نرم اور خوشبودار ہوتی ہیں، مگر اسی نام نُعمان کے نام کی ایک وادی عرفات سے لگے بھی ہے۔ جغرافیہ دانوں کا بیان ہے کہ مسواک اسی نُعمان کی مشہور ہے تیسری جگہ اسی نام کی کوفہ کے قریب ہے، اور فرات سے قریب شام میں بھی ایک وادی اسی نام کی ہے۔ الروض المعطار میں ہے کہ نُعمان (ن کو فتحہ) عرفات کی وادی کا نام ہے۔ تنعیم کے بائیں جانب جو وادی ہے اس میں اراک نہیں پایا جاتا نہ وہاں کی مسواک مشہور ہے۔ (جاری)

مولانا محمد خالد ندوی غازی پوری
جامعہ ہدایت جے پور

اُردو زبان و اَدب پر
سیّد احمد شہیدؒ کی تحریک کے اَثرات

اسلام ایک مکمل اور اجتماعی دین اور ایک مستقل معاشرہ ہے، اس کا مزاج کسی سیاسی معاشی آمیزش یا غیر اسلامی قدروں اور معیاروں کو قبول نہیں کرتا، اور نہ خلط ملط کا متحمل ہے، لیکن اگر خود اس کے ماننے والوں کے اندر کوئی بگاڑ آجائے اور فرد و جماعت کا تعلق صراط مستقیم سے منحرف ہوگیا ہو تو اس وقت بھی اگر کوئی گروہ سامنے آکر اس کی ہیئت ترکیبی کو درست کرنے کی کوشش نہ کرے، اس کی حالت زار کو بنانے سنوارنے کی فکر نہ کرے، اس کی پراگندہ حالت کی تنظیم و تزئین کے سلسلہ میں تگ و دو نہ کرے اور قوم کو ان خطرات سے آگاہ نہ کرے جو اس کے وجود کو گھن کی طرح کھا رہے ہیں اور دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں ممکن نہیں، سوسائٹی میں ایسے پاکباز اور باشعور انسانوں کا وجود ضروری ہے جن کو اس کی فکر ہو اور وہ اس کے لیے غم زدہ ہوں۔ اس لیے قرآن پاک کہتا ہے کہ تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے ہوئے خیر کی طرف دعوت دے، اور ایسے ہی لوگ کامیاب ہیں۔

مسلمانانِ ہند کی عام حالت:

تیرھویں صدی ہجری ہندوستانی مسلمانوں کے لیے اہم کش مکش کی حامل تھی۔ نادر شاہ کے حملے کے بعد جو پسپا ہوئے تو سر اُٹھانے کی مہلت نہیں ملی، ابھی یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا کہ انگریزوں نے ریشہ دوانیاں شروع کردیں، سیاسی طور پر وہ کمزور و ناتواں تنزل و انحطاط کا شکار تھے بلکہ اس کی تکمیل اسی صدی میں ہوئی، سیاسی انحطاط کے نتیجہ میں بہت سی معاشرتی اور مذہبی خامیاں جن پر غلبہ و اقتدار کے زمانہ میں پردہ

پڑا ہوا تھا، بے نقاب ہو کر سامنے آ گئیں۔ مسلم معاشرہ پر گمراہی چھائی جارہی تھی اور حق کا نور باطل کے بھنور میں سمٹا جا رہا تھا، اس صورت حال کو موج کوثر کے مصنف نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"اگرچہ شاہ ولی اللہ اور دوسرے بزرگوں کی کوششوں سے ذی علم طبقہ اسلام کے متعلق زیادہ صحیح معلومات حاصل کر رہے تھے، لیکن عوام کی مذہبی حالت نہایت گری ہوئی تھی۔ انھوں[1] نے ہندو مذہب چھوڑ کر اسلام تو اختیار کر لیا تھا، لیکن اس سے اُن کی روحانی حالت میں کوئی اہم تبدیلی نہ ہوئی تھی۔ اگر پہلے وہ مندروں میں مورتیوں کے سامنے ماتھا ٹیکتے تھے تو اب مسلمان پیروں اور قبروں کے سامنے سجدے کرتے اور ان سے مرادیں مانگتے۔ پجاریوں اور برہمنوں کی جگہ مسلمان پیروں نے لے لی تھی جن کے نزدیک انسان کی روحانی تربیت کے لیے احکام اسلام کی پابندی اور سنت نبوی کی پیروی ضروری نہ تھی۔"

مسلمانوں کی معاشرتی زبوں حالی:

"معاشرتی رسموں کے اعتبار سے بھی مسلمانوں اور ہندوؤں میں کوئی بڑا فرق نہ تھا۔ اسلام کی تعلیم یہ تھی کہ خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرو، لیکن اب بھوت پریت کے ڈر اور دوسرے وہموں سے زندگی کا سکون تلف ہو رہا تھا۔ ہندوؤں میں نکاح بیوگان پاپ سمجھا جاتا تھا۔ مسلمانوں میں بھی نکاح ثانی بُرا سمجھا جانے لگا۔ بیاہ شادی اور تجہیز و تکفین کے متعلق اسلامی احکام نہایت سادہ، معقول اور دینی و دنیاوی بھلائی پر مبنی تھے، لیکن مقامی اثرات سے ان کی جگہ ایسی خلاف شرع رسموں نے لے لی تھی، جن میں فضول خرچی، تضییع اوقات اور دوسری بیسیوں قباحتیں تھیں۔"

شراب نوشی عام تھی، نشہ آور چیزوں (افیون، بھنگ، تاڑی وغیرہ) کا استعمال گھر گھر تھا، جس سے اخلاق کے ساتھ قوائے عقلیہ اور صحت بھی خراب ہو رہی تھی۔ ارباب نشاط کا ہر طرف دور دورہ تھا، دہلی اور لکھنؤ کی معاشرت اور مجلسی اور خانگی زندگی کا جو نقشہ اس دور کی تحریروں میں نظر آتا ہے اس سے تہذیب

---

[1] ایک بڑی تعداد نے

کی آنکھیں نیچی اور حیا کی پیشانی عرق آلود ہے۔

تجدید و اصلاح کا کام:

اس سب کے باوجود تجدید و اصلاح کا کام بھی جاری تھا، حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے امت کی اصلاح و تجدید کا جو کام شروع کیا تھا اور جہاد و اجتہاد کا جو سامان مہیا کیا تھا، ملک میں قرآن فہمی، درس حدیث اور دعوت الی اللہ کے جو چشمے جاری کیے تھے اس کے سوتے خشک نہیں ہوئے، ماحول کی برہمی اور حالات کی ناسازگاری کے باوجود تجدید و اصلاح کی تحریک پروان چڑھ رہی تھی، جس کے نتیجہ میں غیر اسلامی عناصر آنکھوں میں کھٹکنے لگے اور ایک ایسی جماعت جوان کی اصلاحی تجاویز کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتی تھی سامنے آئی جس کی قیادت حضرت امام الہند کے جانشین شاہ عبد العزیزؒ نے کی اور تادمِ حیات اس کام کو جاری رکھا۔ لیکن اس تحریک کا سب سے مؤثر اظہار حضرت سید احمد شہید بریلوی کی زیر قیادت ہوا۔

سیّد احمد شہیدؒ:

حضرت سید احمد شہیدؒ ۶ صفر ۱۲۰۱ھ یعنی ۲۹ نومبر ۱۷۸۶ء کو رائے بریلی میں پیدا ہوئے، ایام طفلی میں تحصیل علم سے آپ کو کچھ زیادہ رغبت نہ تھی۔ مکتب میں تین چار سال گزارنے کے بعد بھی قرآن مجید کی چند سورتوں کے سوا آپ کو کچھ یاد نہ ہوا، بچپن ہی سے مردانہ اور سپاہیانہ کھیلوں کا شوق تھا، ضعیفوں اور اپاہجوں اور بیواؤں کی خدمت کرنے کا جذبہ سن بلوغ تک پہنچتے پہنچتے ایسا ہو گیا تھا کہ اس کی نظیر نہیں ملتی، اس کے ساتھ عبادت، ذکر الٰہی کا ذوق ورزش اور مردانہ کھیلوں کا شوق تھا، جب آپ سترہ اٹھارہ سال کے ہوئے تو تلاشِ معاش میں چند رفقاء کے ساتھ لکھنؤ تشریف لائے، لکھنؤ میں قیام کے دوران خود بخود تحصیل علم کا ایسا شوق پیدا ہوا جو کشاں کشاں لکھنؤ سے دہلی لے گیا اور حضرت شاہ عبد العزیزؒ کی خدمت میں حاضری دی، اور شاہ صاحب کے دریافت کرنے پر جب آپ نے اپنا تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ سید ابو سعید صاحب میرے نانا اور سید نعمان صاحب میرے حقیقی چچا ہیں تو شاہ صاحب نے بے حد خوشی کا اظہار کیا، عزت افزائی کی غرض سے دوبارہ مصافحہ اور معانقہ کیا اور فرمایا کہ اللہ کا فضل شامل حال ہے تو اپنے ددیال اور ننھیال کی میراث تم کو

مل جائے گی، حضرت شاہ عبدالقادر اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی صحبت فیض وخدمت میں رہ کر آپ نے اس قدر باطنی ترقی کی اور وہ بلند مقامات حاصل کیے جو بڑے بڑے مشائخ کو بڑی بڑی ریاضتوں اور مجاہدوں کے بعد حاصل ہوئے ہیں۔ ان مبارک ہستیوں سے کوئی چار سال اخذِ فیض کرکے، اجازت وخلافت لے کر اپنے وطن رائے بریلی واپس ہوئے، تقریباً دو سال قیام کے بعد نواب امیر خاں والی ٹونک کے لشکر میں بھرتی ہوگئے، قریباً چھ سال فنِ سپہ گری کی تکمیل میں بسر کیے اور اچھا رسوخ پیدا کیا۔ اس اثنا میں آپ اپنی عبادات وریاضات اور سپاہیانہ زندگی کے ساتھ اصلاح وارشاد میں بھی مشغول رہے آپ کی توجہ، محنت اور کوشش سے پورا لشکر دعوت وتبلیغ کا وسیع میدان بن گیا۔

دوبارہ دہلی میں ورود:

جب آپ دوبارہ ۱۸۱۶ء میں دہلی تشریف لائے تو آپ کی طرف غیر معمولی رجوع ہوا، اور خاندانِ ولی اللٰہی کے چشم وچراغ شاہ ولی اللہؒ کے پوتے شاہ محمد اسمٰعیل شہیدؒ نے آپ کے ہاتھوں پر بیعت کی، اور اسی خانوادہ کے ایک اور ممتاز فرد جناب مولانا عبدالحی نے جو شاہ عبدالعزیز صاحب کے داماد تھے آپ سے بیعت کی۔ ان دو حضرات کی بیعت کے بعد لوگوں میں طلب وشوق کی بیتابی بڑھتی چلی گئی۔ دہلی اور اس کے نواح کے عوام وخواص، علماء ومشائخ کا ایسا رجوع ہوا کہ جس کی مثال مشکل ہے۔

حضرت سید صاحب کا سلسلۂ ارشاد وہدایت برابر جاری رہا۔ آپ کی گفتگو میں بڑی تاثیر تھی، کلام میں سیدھی سادھی مثالیں ہوتی تھیں جنھیں سامعین آسانی سے سمجھ لیتے تھے طبیعت میں خلوص تھا، ایثار وخیر خواہی خلق رگ وپے میں سمائی ہوئی تھی، نتیجہ یہ تھا کہ جو لفظ زبان سے نکلتا سامعین کے دلوں میں تیر کی طرح پیوست ہوجاتا۔ آپ نے اپنی دعوت وارشاد میں طریقت وشریعت کے باہمی تطابق پر زور دیا۔ طریق سلوک کے شرعی اسلوب کو بیان کرتے بیعت کا طریقہ بھی اپنے پیش رووں سے مختلف تھا، آپ کا دستور تھا کہ پہلے طریقۂ چشتیہ، قادریہ، نقشبندیہ سہروردیہ میں بآوازِ بلند بیعت لے کر پھر طریقۂ محمدیہ میں بیعت لیتے تھے، اور اسے لوگ طریقۂ محمدیہ کہتے۔ آپ نے خود اس کی وضاحت نائب والی رام پور کے بھائی سے اس طرح کی ہے کہ:

"تصوف کے چار طریقوں کا تعلق رسول کریمؐ سے بطور باطن کے ہے، اور طریقۂ محمدیہ کا بطور ظاہر کے، اس لیے ظاہری اعمال طریقۂ محمدیہ یعنی شریعت کے مطابق ہونے چاہئیں۔"

سید صاحبؒ کی جماعت کی خصوصیات:

آپ کے فیضِ صحبت سے ایسی جماعت تیار ہوئی جس کا نمونہ ان آخری صدیوں میں ملنا مشکل ہے۔ مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اس جماعت کی خصوصیات و جامعیت پر یوں روشنی ڈالی ہے:

"سید صاحب نے جو مبارک جماعت تیار کی اس کی خصوصیات میں سب سے نمایاں اور لائق ذکر بات اس کی جامعیت ہے اس میں جہادِ اصغر (تزکیۂ نفس) اور جہادِ اکبر (جہاد و قتال) بھی، خدا سے محبت بھی، خدا کا خوف بھی، خدا کے لیے محبت بھی، خدا کے لیے نفرت بھی، زہد و عبادت بھی اور دینی حمیت اور اسلامی غیرت بھی، تلوار بھی اور قرآن بھی، عقل بھی اور جذبات بھی، گوشۂ مسجد میں تسبیح و مناجات بھی اور گھوڑے کی پیٹھ پر تکبیر مسلسل بھی..... یہ ایک صاحب یقین اور مجاہد نسل کی بہترین تصویر ہے اور اخلاص للّٰہیت کا وہ صحیح معیار اور دلکش نمونہ ہے، جو ہر زمانہ میں مطلوب اور شریعت کا مقصود ہے۔"[1]

تحریک کے اثرات:

حضرت سید صاحبؒ کے خلفاء، جانشین اور مسترشدین و منتسبینؒ نے ارشاد و ہدایت کی راہ میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے اور ہندوستان کے طول و عرض میں جو خلق و وفا، حمیت و غیرتِ اسلامی کی جو نسیم جاں فزا اور ایمان و یقین کی بادِ بہاری چلی، اتحاد و یگانگت کی جو فضا قائم ہوئی تھی توبہ انابت الی اللہ، خشوع و خضوع، اور خشیتِ ربانی کے جھونکے جو دلوں کو گدگدا رہے تھے، اور اثر پذیری کے جو انمٹ نقوش قائم ہو رہے تھے، اور جو روح اُبھر رہی تھی، حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ کی تحریر کے آئینہ میں اس کے جمال و جلال کی

---

[1] "جب ایمان کی بہار آئی"

تصویریں ملاحظہ فرمائیں۔ فرماتے ہیں:

"۔ ۔ ۔ اس تحریک نے اپنے پیروؤں میں للّٰہیت و خلوص، اتحاد، نظم سیاست اور تنظیم کا جوہر پیدا کر دیا تھا، اس کے سمجھنے کے لیے کتاب سیرت سید احمد شہید کا چوتھا باب پڑھیے: "بنگال کی سرحد سے لے کر پنجاب تک اور نیپال کی ترائی سے لے کر دریائے شور کے ساحل تک اسلامی جوش و عمل کا دریا موجیں مار رہا تھا اور حیرت انگیز وحدت کا سماں آنکھوں کو نظر آ رہا تھا۔"

سید صاحبؒ کے خلفاء ہر صوبے اور ولایت میں پہنچ چکے تھے، اور اپنے اپنے دائرے میں تجدید اصلاح و تنظیم کا کام انجام دے رہے تھے، مشرکانہ رسوم مٹائے جا رہے تھے، بدعتیں چھوڑی جا رہی تھیں، نام کے مسلمان کام کے مسلمان بن رہے تھے، جو مسلمان نہ تھے وہ اسلام کا کلمہ پڑھ رہے تھے، شراب کی بوتلیں توڑی جا رہی تھیں، تاڑی اور سیندھی کے خم پھوٹے جا رہے تھے، بازاری فواحش کے بازار سرد ہو رہے تھے، اور حق و صداقت کی بلندی کے لیے علما حجروں اور امراء ایوانوں سے نکل نکل کر میدان میں آ رہے تھے، اور ہر قسم کی ناچاری، مفلسی اور غربت کے باوجود تمام ملک میں اس تحریک کے سپاہی پھیلے تھے اور مجاہد دعوت و تبلیغ میں لگے تھے۔

مولانا اسمٰعیل شہیدؒ اور حضرت سید احمد شہیدؒ کی مجاہدانہ سرگرمیوں اور ان کی اصلاحی کوششوں نیز بلند ہمتی سے اسلام کا علم اٹھا، اور مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دی گئی، جس کی آواز ہمالیہ کی چوٹیوں اور نیپال کی ترائیوں سے لے کر خلیج بنگال کے ساحل تک یکساں پھیل گئی لوگ جوق در جوق اس علم کے نیچے جمع ہونے لگے، اور پھر سرحد پار سکھوں سے مقابلہ ہوا۔ انگریزوں سے محاذ آرائی ہوئی، رزم و بزم کے دھنی مقابلوں میں غالب ہوئے۔ مسلمانوں کی عزت و ناموس کی حفاظت ہوئی، اُمّت کی شیرازہ بندی ہوئی، امیر المومنین کا انتخاب ہوا، قضاۃ کا تقرر ہوا، اسلام کی شمع جو عرصہ سے خموش تھی، لپک کر جل اٹھی اور ویرانوں میں زندگی و بندگی کے آثار ہر طرف پھیلے ہوئے نظر آنے لگے لاہور کی سلطنت لرز اٹھی، اور انگریزوں کی سازشیں ناکام ہوتی نظر آئیں، لیکن ہمیشہ کی طرح باطل متحد ہوتا گیا اور حق کی صفوں میں نفاق و انتشار کے جراثیم در کرنے لگے، اور بالآخر انہیں دراندازیوں کے نتیجہ میں بالاکوٹ کے معرکہ میں وہ پاک نفوس شہید ہوئے جو عالم انسانیت کے لیے رونق و زینت اور مسلمانوں کے لیے شرف و عزت اور خیر و برکت

کا باعث تھے، ان کا وہ خونِ شہادت جو ہماری مادی نگاہوں کے سامنے بالاکوٹ کی مٹی میں جذب ہوگیا اور اس کے جو چھینٹے باقی تھے گردشِ روزگار کی بدلیوں نے اسے بھی دھل دیا لیکن اکوڑے اور شیدو کے میدان، نورو اور مایار کی رزم گاہ سے لے کر بالاکوٹ کی شہادت گاہ تک ان کے خونِ شہادت کی لکیریں اور شہیدوں کی قبریں ان کی جدوجہد، اور جہاد و اجتہاد کی وہ کھلی کتابیں ہیں جو دعوت عمل، اور خدا کی راہ میں سرفروشی کی آج بھی دعوت دے رہی ہیں۔

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ:

اس عظیم الشان تحریک نے جہاں تیر و سنان کے جوہر دکھائے، وہیں اس کے اشہب خامہ نے مزعومات فاسدہ اور معتقدات باطلہ، بدعت و شرک اور اوہام پرستی کے استھانوں کو اپنی ٹاپوں سے روند دیا، اور نوکِ قلم سے توحید وللّٰہیت، اخلاص و توکّل اور ایثار کی عمدہ تصویریں دلوں میں، ذہنوں میں، بلکہ رگ و پے میں اُتار دیں، اس فریضہ کو انجام دینے والوں میں سب سے ممتاز حیثیت اور مقام سید اسمٰعیل شہید کو حاصل ہے۔

آپ زبردست مقرر اور با اثر واعظ تھے، آپ جہاد میں شریک ہونے سے پہلے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ہر جمعہ کو وعظ کہا کرتے تھے۔ آپ کے وعظ و ارشاد نے مسلمانوں کی مذہبی اور ذہنی زندگی میں جو انقلاب پیدا کر دیا اس کے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد کا بیان پڑھنے کے قابل ہے، اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس تحریک کے سپوتوں نے اردو کے دامن کو زبان و بیان کے کیسے جواہر ریزے اور ادب پارے دیے۔ فرماتے ہیں:

مولانا ابوالکلام آزاد کا بیان:

"شاہ صاحب (شاہ ولی اللہ دہلویؒ) نے مزاج وقت کے عدم تحمل و استعداد سے مجبور ہو کر بحکم ؎

بر رمز نکتہ ادا می کنم کہ خلوتیاں سر سبو بکشادند و در فرو بستند

دعوت و اصلاح امت کے جو بھید پُرانی دہلی کے کھنڈروں اور کوٹلہ کے حجروں میں دفن

کر دیے گئے تھے اب اس سلطانِ وقت اور سکندرِ اعظم کی بدولت شاہجہاں باد کے بازاروں اور جامع مسجد کی سیڑھیوں پران کا ہنگامہ مچ گیا، اور ہندوستان کے کناروں سے بھی گزر کر نہیں معلوم کہاں کہاں تک چرچے اور افسانے پھیل گئے، جن باتوں کے کہنے کی بڑوں بڑوں کو بند حجروں کے اندر بھی تاب نہ تھی وہ اب سرِ بازار کہی جارہی تھی۔"

سامعین بلکہ مخالفین پر بھی مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ کے وعظ کا جو اثر ہوتا تھا اس کا اندازہ معاصرانہ تحریروں مثلاً آثار الصنادید میں ہو سکتا ہے۔ آپ کو اللہ نے جہاں یہ ملکہ دیا تھا کہ اپنی بات استدلالی انداز اور بھاری بھرکم الفاظ میں پیش کریں جو خطابت کی جان ہے اسی طرح سامعین و مخاطبین کو سامنے رکھتے ہوئے ایسے سلیس و شستہ انداز میں بھی وعظ و نصیحت فرماتے کہ انقلاب احوال ہو جاتا، دلوں کی سلوٹیں نرم پڑ جاتیں اور اندر کی دنیا بدل جاتی۔ ایسے ہی ایک موقع پر جب کہ موضع مردان کے باشندوں کو امان دینے کے باوجود بعض مجاہدین نے ان کے مال و متاع کو لوٹ لیا تو وہ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے پاس آئے اور اپنا دکھڑا سنایا۔ اس موقع پر آپ نے شستہ اور سلیس اور سادے الفاظ اور عام فہم انداز میں طاعت امیر پر جو وعظ فرمایا، وہ اردو ادب میں فن پارہ سے کم نہیں۔

ادب کی تاثیر:

فن پارے ہمارے احساسات، جذبات، خیالات اور اس سے بڑھ کر ہمارے ذوقِ جمال کی آبیاری کرتے ہیں اور اس طرح ہمارے دل کی گہرائیوں میں پہنچ کر گوش و ہوش کے تاروں کو جھنجھنا دیتے ہیں اور ہم بے خود و مست ہو کر جھوم جھوم اٹھتے ہیں یا غم و اندوہ اور غلطی کا احساس ہونے پر آنکھوں سے مئے عشرت شبانہ بہانے لگتے ہیں اثر انگیزی اور لذت افروزی کا یہی وہ بلند مقام ہے جہاں ادب صرف جادو ہی نہیں بلکہ خود زندگی بن جاتا ہے۔

(جاری)

ع۔ع۔ن

زبان و ادب پر تحریک کے اثرات

[یہ مضمون اس سمینار کے لیے لکھا گیا تھا جو رابطۂ ادب اسلامی کی ہندوستانی شاخ کے ماتحت ندوہ میں منعقد ہوا تھا، مگر مقالات کی کثرت کی وجہ سے اس کو پڑھ کر سنایا نہیں گیا۔]

کسی تحریک یا شخصیت کا اثر پہلے معاشرہ پر پڑتا ہے، افراد کے کردار میں تغیر رونما ہوتا ہے، ان کے فکر کی اساس بدلتی ہے اور پھر اس عمومی تغیر کا اثر زبان و ادب پر پڑتا ہے، کیونکہ ادب فکر انسانی کا ترجمان یا مظہر ہے، فکر کو جیسا ایندھن ملے گا اسی کے مطابق اس کی بھاپ ظاہر ہوگی، ادبی عوامل کی اثر اندازی ایک دن میں نہیں ظاہر ہوتی، رفتہ رفتہ اور دھیمی رفتار میں یہ تبدیلی ظاہر ہوتی ہے، اس کے لیے کوئی حدِ فاصل Dead line نہیں متعین کر کے بتایا جاسکتا، مگر جب یہ تبدیلی قبول عام حاصل کر لیتی ہے تو پھر وہ چند افراد تک محدود نہیں رہتی، بلکہ وہ مذاق عام بن جاتی ہے، اگر کوئی فرد یا متعین گروہ اس اثر کو قبول نہیں کرتا تو اس کی نشان دہی کی جاتی ہے، اس کے اسباب تلاش کیے جاتے ہیں، تاویلیں کی جاتی ہیں کہ فلاں شاعر یا ادیب کے لیے کیا موانع اور حجابات تھے جس کی وجہ سے اس کے کلام یا انتاج میں ماحول کا اثر نہیں ہے۔

حضرت سید احمد شہیدؒ کے ارادت مندوں میں حکیم مومن خاں مومنؔ بھی شامل تھے، ان کا ایک قصیدہ جو سید صاحبؒ کی منقبت میں ہے نیز ان کا یہ شعر:

لے نام آرزو[1] کا تو دل سے نکال دیں　　　مومن نہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

---

[1] مولانا فضل حق خیرآبادی آرزو تخلص کرتے تھے اور ان سے مولانا اسماعیل شہیدؒ کا ایک علمی اختلاف تھا، انہی کی طرف اشارہ ہے۔ (روایت مولانا ابوالعرفان خاں ندوی)

یا مولانا خرم علی بلہوری کا قصیدۂ جہادیہ، ان ادبی تغیرات کا علامتی سنگ میل نہیں ہیں جو حضرت سید صاحبؒ کی تحریک سے مسلمانوں کے فکر عام پر چھا گیا تھا، ہم جن اثرات کے جویا ہیں وہ معاشرہ کے عمومی رجحان کو بتاتے ہیں، لیکن اس تجزیہ کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس وقت کے مذاق عام کو سمجھیں جو اس تحریک سے پہلے معاشرہ میں متعارف تھا۔

حضرت سید احمد شہیدؒ کا زمانہ محمد شاہی عصر کا آخری اور انگریزوں کی حکومت کا ابتدائی دور ہے، محمد شاہی دور کا آخری حصہ ہزیمت اور پسپائی کا زمانہ تھا، نادر شاہ کے حملہ نے دہلی کو تاراج کر دیا تھا، ان الملوک اذا دخلوا قریۃ افسدوھا وجعلوا اعزۃ اھلھا اذلۃ (بادشاہ جب کسی ملک میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو تباہ کر دیتے ہیں اور وہاں کے عزت والوں کو ذلیل کر دیا کرتے ہیں) کی زندہ تصویر سامنے تھی، اور انگریز حکمران خونِ مسلم کے پیاسے جذبۂ انتقام سے پُر تھے، اسلامی وجود کی جڑیں اس سرزمین پر کھوکھلی ہو چکی تھیں، سوداؔ اور نظیرؔ اکبرآبادی جیسے سنجیدہ اور صاحب درد و بصیرت شعراء تک طنز و مزاح کی آڑ میں اپنے دل کا غبار نکالنے پر مجبور تھے، دوسرے شعراء ایک زوال پذیر معاشرہ کی ترجمانی، معاملہ بندی اور غزل گوئی کی مبتذل سطح سے کر رہے تھے، مصحفیؔ، انشاؔ، سوداؔ، میرؔ اور شاہ حاتمؔ ہی کے معاصر جرأتؔ بھی تھے، جن کے بارے میں اگر مولوی محمد حسین آزادؔ کا محاکمہ تسلیم کیا جائے تو میر تقی میرؔ کے بعد سب پر فائق تھے، ان کے بارے میں حکیم قدرت اللہ قاسمؔ اپنے تذکرہ مجموعۂ نغز میں یہ حکایت لکھتے ہیں:

"کہا جاتا ہے کہ مرزا محمد تقی خاں ترقیؔ کے یہاں ایک مشاعرہ ہوا، اپنے بہت سے شاگردوں کو انھوں نے بلا لیا، اور کلام سناتے رہے لوگ داد دیتے رہے، یہاں تک کہ اشعار کا سمجھنا الگ رہا سننا بھی مشکل ہو گیا، اتفاقاً سخن سنج میر محمد تقی میرؔ بھی تشریف فرما تھے، قلندر بخش جرأتؔ نے جرأت کی اور کھسک کر ان کے قریب جا پہنچے اور اپنے اشعار سنا کر تحسین و داد کے طالب ہوئے، میرؔ نے پہلے تو کئی بار ٹال دیا، مگر جب ان کا اصرار بڑھا تو اردو میں ان سے کہا، میاں تم مبتذل قسم کے مضامین باندھ لیا کرو، شعر کہنا تم کیا جانو۔" (فارسی سے ترجمہ)

دینی رنگ کی شاعری کا جہاں تک تعلق ہے وہ تصوف کے دائرہ میں محدود تھی، اور تصوف بھی وہ جس پر عقیدۂ وحدت الوجود یا 'ہمہ اوست' سایہ فگن رہا۔ اصلاح معاشرہ، اصلاح عقائد، جذبۂ جہاد، اور قربانی و فدائیت کے جذبات کو اُبھارنے والی شاعری کا اس پورے دور میں سراغ نہیں ملتا۔

حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے دو محاذ تھے، ایک اصلاح عقائد و مشرکانہ رسوم و رواج کا انسداد، دوسرا جہاد ۔ ان کے بارے میں مولانا سید ابو الحسن علی الحسنی مدظلہٗ کا جامع تبصرہ مختصر ترین الفاظ میں یہ ہے:

"حضرت سید احمد شہیدؒ (۱۲۰۱ - ۱۲۴۶ھ) نے اس تحتی براعظم میں جس عظیم اسلامی تحریک کی رہنمائی کی اس کی نظیر جامعیت، قوت تاثیر اور اسلام کی اولین دعوت حق اور طریق نبوت سے مناسبت میں صرف تیرہویں صدی میں ہمیں نظر نہیں آتی ہے جو اس کا عہد ہے بلکہ گزشتہ کئی صدیوں میں بھی اس جیسی ایمان آفرین تحریک اور صادقین و مخلصین کی ایسی مربوط و منظم جماعت کا سراغ نہیں ملتا، وہ عقائد و اعمال کی تصحیح، افراد کی تربیت، وعظ و تبلیغ اور جہاد و سرفروشی کے وسیع و طویل محاذ پر جس طرح سرگرم عمل رہے اس کا اثر صرف میدان کارزار اور ان کے معاصر نسل تک محدود نہ رہا بلکہ اس نے آئندہ نسل، اپنے بعد میں آنے والے اہلِ حق، اصحاب دعوت اور دین کے علمبرداروں اور خادموں پر گہرے اور دیرپا نقوش چھوڑے۔"

جن دیرپا نقوش کی طرف مولانا نے اشارہ فرمایا ہے وہ ایک وسیع تحقیق کا کام ہے، ان میں وہ اثرات جو ادبار کے نتائج فکر پر پڑے ان کا جائزہ بھی ایک مقالہ سے زیادہ وسعت کا طالب ہے، البتہ جو باتیں بہت نمایاں ہیں ان میں حسب ذیل نشانات ہماری رہنمائی کرتے ہیں:

تیرھویں صدی میں محمد شاہی دور کے اختتام اور انگریزی تسلّط کی ابتدا میں سیاسی تداخل کا زمانہ تھا۔ اس کی طرف میں نے ابتدائی سطروں میں اشارہ کیا ہے، تحریک جہاد کے بعد جو شعراء صف اول میں آتے ہیں ان میں ایک ٹھہراؤ اور وقار محسوس ہوتا ہے، یہی نہیں بلکہ ان کے کلام میں طنز و مزاح کے نام پر تضحیک کا جو عنصر تھا وہ ختم ہو گیا۔ اس دور کے سرخیل شعراء میں استاذ ذوقؔ، مومنؔ اور غالبؔ ہیں، مومنؔ تو خیر سید صاحبؒ کے دست گرفتہ اور پابند شاعر تھے، استاذ ذوقؔ کے یہاں بھی وہ ابتذال نہیں ہے جو ان کے متقدمین کے کلام کا ناقابلِ انکار عنصر تھا، ایک زمین ہے "زباں کے لیے"، "آسماں کے لیے"۔ اس میں استاذ ذوقؔ کے یہ اشعار اس بات کے غماز ہیں کہ وہ اپنے پیش رو شعراء سے مختلف نظر آتے ہیں، اور ان کے کلام میں بالواسطہ ایک اسلامی دعوت کا اثر نمایاں ہے، کہتے ہیں:

فروغ عشق سے ہے روشنی جہاں کے لیے ۔۔۔ یہی چراغ ہے اس تیرہ خاکداں کے لیے
نہیں ثبات بلندی و عزّ و شاں کے لیے ۔۔۔ کہ ساتھ اوج کے پستی ہے آسماں کے لیے

بیان درد و محبت جو ہو تو کیوں کر ہو — زباں نہ دل کے لیے ہے نہ دل زباں کے لیے
مرے مزار پہ کس وجہ سے نہ برسے نور — کہ جان دی ترے روئے عرق فشاں کے لیے

یہ وہی زمین ہے جس میں مومن کی مشہور غزل ہے :

نہ پائے یار کے بوسے نہ آستاں کے لیے — عبث میں خاک ہوا میل آسماں کے لیے
نوید امن ہے بیدادِ دوست جاں کے لیے — رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لیے

استاذ ذوق کے کلام میں دینی احساسات کا پایا جانا اور تصوّف کی طرف میلان اس دینی فکر کے غمّاز ہیں جو اس دَور میں شروع ہو چکا تھا، ان کی ایک غزل ہے "مچل جائے تو اچھا"، "سنبھل جائے تو اچھا" اس میں ان کا یہ شعر ایسا ہے کہ اگر خواجہ میر درؔد کے کلام میں ملا دیا جائے تو مشکل سے تمیز کی جا سکے گی :

جو آنکھ کہ بے نم ہو رہے کور تو بہتر
جو دل کہ ہو بے داغ وہ جل جائے تو اچھا

لیکن ایسے دو چار شعروں کا پایا جانا اس بات کی دلیل نہیں بن سکتا کہ وہ تحریک سے براہ راست متاثر تھے، یہی نہیں بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ ان کو فکری لحاظ سے بُعد اور عدم مناسبت ہو، اور اگر مخالف گروپ میں رہے ہوں تو اس میں بھی کوئی حیرت کی بات نہ ہوگی، لیکن کسی جاندار تحریک کے اثرات عام فضا اور ماحول پر ظاہر ہونے لگتے ہیں، وہ ذوق ایسا عام ہو جاتا ہے کہ اس ڈگر سے باہر قدم نکالنا مشکل ہو جاتا ہے، اس کی ایک مثال اسی زمانہ کی ہے، چالیسویں دہے میں مشرق وسطیٰ میں الاخوان المسلمون کی تحریک نوجوانوں میں مقبول ہونے لگی، کالجوں اور مدرسوں کے نوجوان جرأت کے ساتھ ہر میدان میں بڑھنے لگے، جنسی ادب اور فحش رسائل جو اس وقت سکۂ رائج الوقت تھے کھوٹے ثابت ہونے لگے، بازاروں میں مانگ دینی کتابوں کی بڑھنے لگی، اس وقت وہ حضرات جو کل تک پیٹ اور جنس سے آگے نہیں پہنچ سکتے تھے وہ اسلامی تاریخ کے ابطال (ہیروز) پر لکھنے لگے، اور متعدد آبرو باختہ قسم کے اخبار نویسوں کو اپنی ڈگر بدلنا پڑی، یہاں تک کہ مخالف بھی اپنے قلم کو سنبھال کر اسلام کے علاوہ دوسرے عنوانات کا سہارا لے کر اخلاقیات پر ایک دو مضمون شائع کرنے لگے۔ یہی صورت حال سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے زمانہ میں اس ملک کی ہو گئی تھی، یہ تحریک بالاکوٹ میں ختم نہیں ہو گئی بلکہ اس کے بعد ایک عمومی مزاج ایسا بن گیا جس نے اس وقت کے اور بعد میں آنے والے شعراء وادبا

کی فنکر پر اثر کیا۔

اردو کے اصحاب طرز مصنفین، سرسید، حالی، شبلی، محمد حسین آزاد اور راشد الخیری یا ڈپٹی نذیر احمد سب کے سب اخلاق وعلم کے داعی تھے، ان کا دعوت دینا اگرچہ براہ راست اس تحریک کے اثرات میں داخل نہ ہو مگر ان کی تحریروں کا قبول عام حاصل کرنا یقیناً اس تحریک کا اثر تھا، ورنہ بھلا حالی کا دعیا توحید اور رسم ورواج کے جسم پر نشتر چلانا پہلے کوئی برداشت کر سکتا تھا، وہ بھی ایسے معاشرہ میں جس کا ایک عکس ڈپٹی نذیر احمد کی 'توبۃ النصوح' میں ملتا ہے، اور جس کے متعلق ان پر تحقیقی کام کرنے والوں نے لکھا ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد نے بالکل صحیح عکاسی کی ہے۔

ان کے افسانہ کا ایک کردار کلیم ہے، جس کے باپ ایک خوش حال اور نیک نام تھے، انھوں نے مذہب واخلاق کا راستہ اختیار کر لیا تھا اور چاہتے تھے کہ ان کی اولاد بھی اسی راہ پر گامزن ہو، چھوٹے لڑکے کو اتفاق سے مدرسہ ہی میں ایک ساتھی ایسا مل گیا جس کی تربیت اچھی تھی، چھوٹی لڑکی بھی فطرتاً صالح تھی، مگر بڑے صاحبزادے عیش وتنعم کے پروردہ تھے، انھوں نے باپ سے اس مذہبی رجحان کی بنا پر بغاوت کر لی، باپ سمجھاتا ہے مگر یہ مانتے نہیں، باپ بیٹے کے درمیان 'ماں' واسطہ بنی ہیں، ماں جب سمجھاتی ہے کہ باپ کی بات مانو تو صاحبزادے جو فرماتے ہیں وہ اس زمانہ کے معیار تعلیم، معیار اخلاق اور سوسائٹی میں 'معیاری بڑائی' کی تصویر ہے، وہ ماں سے کہتے ہیں :

> "دنیا میں جیسے اور شریف اور معزز خاندانوں کے بیٹے ہیں، اگر میں سب میں اچھا نہیں تو کسی سے بُرا بھی نہیں، مشاعرے میں میری غزل، ساتھ کے مشق کرنے والوں میں سب سے بڑھی چڑھی ہوتی ہے، شطرنج میں، مرزا شاہ رخ تو خیر پرانے کھیلنے والوں میں ہیں اور حق یہ ہے کہ اچھی شطرنج کھیل کھیلتے ہیں، دوسرا کوئی مجھ کو مات کر دے تو البتہ میں اس کی ٹانگ تلے سے نکل جاؤں، ہمارے محلے میں میاں وزیر پادشاہی پیادوں کے جمعدار بڑے شاطروں میں مشہور ہیں میں فرزیں اٹھا کر ان کے ساتھ کھیلتا ہوں، گنجفہ اگرچہ میں کم کھیلتا ہوں لیکن بیٹھ جاؤں تو ایسا بھی نہیں کہ کوئی صفو پر نادری چڑھائے اور قریب قریب یہی حال تاش اور چوسر کا ہے، کبوتر جیسے آج ہماری چھتری کے ودادیں، شہر میں شاید دو چار جگہ اور ہوں گے، پتنگ میں ایسا اڑاتا ہوں کہ ایک ڈھیلچ سے دو

ٹھڈے کی نقل ایک نہیں تو سیکڑوں کاٹ ہوں گی، لکھنے سے میں عاری نہیں پڑھنے سے میں عاجز نہیں، میں نہیں جانتا کہ امیروں اور امیرزادوں کا وہ کون سا ہنر ہے جو مجھ کو نہیں آتا؛

قسمت سے تو لاچار ہوں اے ذوق وگرنہ
سب فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا

کل کی بات ہے کہ میری مدح ہوتی تھی اور مجھ کو ہر بات پر شاباش ملتی تھی، اب دفعۃً میں ایسا بے ہنر ہو گیا کہ مجھ کو سیکھنے اور تعلیم پانے کی ضرورت ہے؛

ہائے ہم کیا کہیں کیا ہو گئے کیا کیا ہو کر

میرا کون سا فعل ہے جو تم کو یا ابّا جان کو معلوم نہیں، کیا ابّا جان نے میری غزلیں نہیں سنیں؟ میں ان کے ہاتھ کے صاد کیے ہوئے دکھا سکتا ہوں، ابھی پورا ایک مہینہ بھی نہیں گزرا شطرنج کا ایک بڑا مشکل نقشہ ابّا جان نے کسی اخبار میں دیکھا تھا اس کو میں نے حل کیا، کبوتر اڑاتے تم نے نہیں دیکھے یا پتنگوں کی لڑائی انھوں نے نہیں سنی، کبھی تم نے روکا یا انھوں نے ٹوکا، اب نئی بات البتہ سننے میں آتی ہے کہ نماز پڑھو، مسجد میں معتکف بن کر بیٹھو، کھیلو مت، کسی یار آشنا سے ملو مت، مت جاؤ میلے تماشے میں مت شریک ہو، بھلا کوئی مجھ سے یہ باتیں ہونے والی ہیں'؛

جو دل قمار خانے میں بُت سے لگا چکے
وہ کعبتین چھوڑ کے کعبے کو جا چکے"

یہ اس زمانہ کے معاشرے کی ہو بہو تصویر ہے جو خوش حال کھاتے پیتے گھرانوں میں رائج تھی، مذہبی تعلیم کہاں تک تھی اور ان کو کس نظر سے دیکھا جاتا تھا، اس کا بیان بھی ڈپٹی نذیر احمد ہی سے سنیے جو اپنے ناول کے کردار کلیم کی محاکات کرتے ہیں۔

کلیم اپنی ماں سے کہتا ہے؛

"اگر (والد صاحب کو) یہی منظور تھا کہ میں بڑا ہو کر مسجد کا مُلّانا یا قبرستان کا قرآن خواں یا لنگر خانہ کا "ٹکڑ گدا" بنوں تو شروع ہی سے مجھ کو ایسی ہی تعلیم کی ہوتی کہ

اب تک بھلا کچھ نہیں تو دو چار حج بھی کر آیا ہوتا، پنچائت میں میری قرأت کی دھوم ہوتی، تراویح میں میرے لہجہ، قرآن خوانی کی شہرت، کہیں مردہ مرتا جلائے نماز مجھ کو ملتی، قربانی ہوتی کھال میرے پاس آتی، صدقے کا میں اڑھتیا ہوتا، زکوٰۃ کا ٹھیکیدار، دعوتوں کا مستحق، خیرات کا حقدار۔"

غرض تعلیم و معاشرت کے دو ہی رُخ تھے، ایک تو وہ جو اوپر گذر چکا شطرنج، شاعری اور کبوتر بازی میں مہارت، دوسرے خیرات و زکوٰۃ اور چرم قربانی کا حقدار ہونا، ان دونوں کے درمیان کوئی راستہ نہیں تھا، کہ ایک تاجر ہو، زراعت پیشہ ہو، ملازم ہو اور دین کا پابند بھی ہو، اصلاح عقیدہ، اصلاح رسوم اور جذبۂ جہاد تو اس وقت سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا، ایسے ماحول میں ایک نئی تحریک اصلاح معاشرہ اور جہاد کی اٹھتی ہے اور وہ مزاج و ذوق پر اثر انداز ہوتی ہے، لوگ حالی کی مسدس پر سر دھننے لگتے ہیں، سرسید مسلمانوں کی رفاہ اور آئندہ نسل میں مسلمانوں کو سربلند کرنے کا ذریعہ عصری تعلیم کو سمجھتے ہیں، ان کے نقشۂ عمل سے علماء کو اختلاف ہوتا ہے، لیکن ہم یہ نہیں بھول سکتے کہ اس وقت ان کو مفسر قرآن اور تہذیب الاخلاق کا معلّم بن کر سامنے آنا پڑا، قوم کا مزاج ایسا بن گیا کہ علی گڑھ اور آکسفورڈ کے فاضل، انگریزی کے اعلیٰ انشاء پرداز مسٹر محمد علی کو مولانا محمد علی، اور ان کے بھائی مولانا شوکت علی کو خادم کعبہ کا لباس پہن کر آنا پڑا، جب کہیں وہ مسلمان قوم کی لیڈری کے مستحق ہوئے، راقم کو اپنے بچپن کا وہ زمانہ یاد ہے کہ ۱۹۲۳ء یا ۱۹۲۴ء میں بہار میں الکشن تھا، اس کے ایک امیدوار مسٹر یونس بیرسٹر تھے، ان کے نام کے بڑے بڑے پوسٹر بازاروں میں لگے تھے کہ حاجی محمد یونس کو ووٹ دیجئے، نہ بیرسٹر نہ مسٹر، حاجی محمد یونس، کیونکہ وہ اور ان کے کارندے جانتے تھے کہ مسلمانوں میں (اس وقت جداگانہ انتخاب ہوتا تھا) وہی مقبول ہوسکتا ہے جو یا تو عالم ہو یا حاجی ہو، حافظ ہو، بے شک یہ صورت حال مسلم لیگ اور مسٹر جناح کی قیادت نے ختم کردی، جس کے سیاسی پس منظر پر گفتگو مقصود نہیں ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ سید احمد شہیدؒ کی تحریک اصلاح و جہاد سے پہلے اور ان کے عصر تک جو دینی رجحان تھا اس کا عکس ڈپٹی نذیر احمد کی ناولوں میں نظر آتا ہے اور ان کی تحریک کے اثرات پھیل جانے کے بعد وہ نقشہ ہے کہ حالیؔ، سرسید، راشد الخیری، نذیر احمد معلّم اخلاق کی حیثیت سے قوم کے سامنے آئے تو ان کی بات سنی گئی، لہٰذا اس دور میں زبان و ادب پر جو مذہب کی چھاپ نظر آتی ہے وہ تحریک کے دوررس نتائج کا پرتو ہے۔

ترتیب: مولانا شفیق الرحمٰن ندوی

عالمِ اسلام کی علمی و ثقافتی سرگرمیاں

قرآن مجید کتابِ رشد و ہدایت ہے، سائنس اس کا موضوع نہیں ہے تاہم تخلیق کائنات یا تخلیق انسان کے ضمن میں اس میں ایسے اسرار و حقائق آئے ہیں جو سائنس کا موضوع ہیں، قرآن وسنت میں ایسے اسرار و حقائق کی نشان دہی، اور ان کو بحث و تحقیق کا موضوع بنانا علمی و تحقیقی خدمت ہے، اس سے جہاں ایک طرف مسلمانوں کے ایمان و یقین میں پختگی کا سامان فراہم ہوگا وہیں اس سے تلاشِ حق کے رہ نوردوں کو بھی رہنمائی ملے گی۔ اسلام کی صداقت و حقانیت کے بارے میں یقین پیدا ہوگا، اور کچھ بعید نہیں کہ کچھ لوگوں کو ایمان کی توفیق نصیب ہو جائے۔ ماریس بکائی، رجار جارودی اور دیگر متعدد دانشور اور فلسفی ان ہی حقائق و اسرار کو دیکھ کر دولتِ ایمان سے مالا مال ہوئے ہیں۔ اس لحاظ سے قرآن وسنت میں سائنسی اعجاز کی تلاش و جستجو تبلیغ دین کا بھی ایک اہم میدان ہے، رابطۂ عالم اسلامی مکہ مکرمہ لائق مبارکباد ہے کہ اس نے اس پہلو کی اہمیت کو محسوس کیا، اس کے لیے عملی قدم اٹھایا اور خاص اس موضوع پر کام کرنے کے لیے ایک مستقل شعبہ قائم کیا جو "هيئة الاعجاز العلمي في القرآن والسنة" یعنی "کونسل برائے سائنسی اعجاز در قرآن وسنت" کے نام سے موسوم ہے، مکہ مکرمہ کی اس کونسل اور انٹرنیشنل اسلامک یونی ورسٹی اسلام آباد پاکستان کے اشتراک و تعاون سے پہلی عالمی کانفرنس اسلام آباد میں ۲۵ تا ۲۸ صفر ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۸ تا ۲۱ اکتوبر ۱۹۸۷ء منعقد ہوئی، جس میں دنیا کے ۵۲ ملکوں کے ۲۲۸ دانشور، محقق، عالم اور سائنس داں نیز ۱۹۰ دیگر مشاہدین شریک ہوئے،

کانفرنس کمیٹی کے پاس تقریباً پانچ سو مقالے موصول ہوئے تھے ان میں سے کانفرنس میں پیش کرنے کے لیے ۸۰ تحقیقی اور وقیع مقالوں کا انتخاب کیا گیا، ان تحقیقی مقالوں پر عام نشستوں میں بحث و مناقشہ ہوا، توقع ہے کہ یہ تحقیقی مقالے زیورِ طبع سے آراستہ ہوکر منظرِ عام پر آئیں گے اس طرح اس کانفرنس کی افادیت کا دائرہ وسیع ہوگا، کانفرنس نے اپنی تجاویز میں زور دیا ہے کہ جو لوگ بھی اس میدان میں کام کرنے کا حوصلہ کریں وہ ظن وتخمین سے بلند ہوکر ان حقائق کا سہارا لیں جو قطعی دلائل سے ثابت ہوں اور جن کی صحت کی دوسرے ماہرین بھی تائید و توثیق کریں۔ ورنہ ان کی محنت وکاوش ثمرآور اور سود مند ہونے کے بجائے ضرر رساں اور بندگانِ خدا کی فکری بے راہ روی کا سبب بن جائے گی، اس لیے ایسے ہی لوگوں کو یہ خدمت سپرد کرنی چاہیئے جو ایک طرف سائنسی علوم سے گہری واقفیت رکھتے ہوں، اپنے فن میں اختصاص کا درجہ رکھتے ہوں تو دوسری طرف قرآن وسنت کے رمز شناس ہوں، عربی زبان وادب کے شناور ہوں، شرعی نصوص سے واقف اور ان سے استنباط کی صلاحیت رکھتے ہوں، نیز اپنی بحث وتحقیق کو آخری شکل دینے سے قبل علوم شرعیہ کے ماہرین سے رجوع کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں کہ نتائج کے اخذ واستنباط میں لغزش کا خطرہ نہ رہے۔

کانفرنس کے شرکاء نے ایک تجویز کے ذریعہ قرآن وسنت میں سائنسی اعجاز کونسل کو مشورہ دیا ہے کہ دنیا میں موجود اسلامی جامعات، ریسرچ سنٹرز، اور دیگر اسلامی تعلیمی اداروں سے ربط وتعاون بڑھائے اور ان کے تعاون سے قرآن پاک کی ایسی تفسیر تیار کرائے جس میں آفاق وانفس سے متعلق قرآن کی آیتوں کی خاص طور سے تشریح وتفہیم ہو، اسی طرح غیر عربی داں مسلمانوں کے لیے قرآن مجید کا صحیح ترجمہ کرایا جائے جس میں کائنات سے متعلق آیات پر تشریحی نوٹ ہوں اور ان میں سائنسی اعجاز کو بالخصوص اُجاگر کیا جائے۔

کانفرنس میں پاس شدہ تجاویز میں ایک اہم تجویز عربی اور انگریزی زبانوں میں ایک مجلّہ نکالنے کے بارے میں ہے، جو بلند معیار اور عالمی سطح کا ہو، جس میں قرآن وسنت میں سائنسی اعجاز کے موضوع پر تحقیقی مقالے شائع ہوں ـــــ البتہ اشاعت سے قبل علوم شرعیہ اور سائنس دونوں کے ماہرین سے ان کی منظوری حاصل کرلی جائے تاکہ فکری زیغ وضلال کا دروازہ نہ کھلے۔

ملائشیا میں اسلامی بیداری:

ملائشیا جنوب مشرق میں واقع مسلم اکثریت کا ملک ہے۔ پندرہ بیس سال قبل یہاں کے مسلم طلبہ نے دینی تحریک شروع کی تھی، مخالفتوں اور مزاحمتوں کے باوجود ان کا جذبۂ عمل سرد نہیں پڑا، جو لوگ کل طالب علم تھے آج سیاست، تعلیم اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں سرگرم عمل ہیں، حکمراں پارٹی میں بھی ایسے افراد کی ایک اچھی خاصی تعداد داخل ہو چکی ہے۔ چنانچہ اب وہاں اسلامی بیداری کے خوشگوار نتائج برآمد ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ اسلامی مدارس میں داخلہ، اور دینی تعلیم کا حصول پہلے رجعت پسندی کی علامت سمجھا جاتا تھا آج روشن خیالی اور ذہن و فکر کی سلامت روی کی دلیل ہے، چنانچہ اسلامی مدارس میں داخلہ کے طلبگاروں کی تعداد میں حیرت انگیز اضافہ ہو گیا ہے۔ گزشتہ دس پندرہ برسوں کے دوران کثرت سے نئی مسجدیں تعمیر ہوئی ہیں، اسلامی مراکز اور دینی کتب خانے قائم ہوئے ہیں، جہاں سے نئی نسل کو ذہنی و فکری غذا فراہم کی جا رہی ہے۔ عورتوں میں حجاب کا رجحان بڑھ گیا ہے، عریانیت اور بے پردگی پر روک لگ رہی ہے اور اس کے بارے میں ناپسندیدگی کا برملا اظہار کیا جانے لگا ہے۔

اقتصادی میدان میں بھی اسلامی نہج پر پیش رفت ہوئی ہے، کئی اسلامی بنک قائم ہو چکے ہیں، جہاں اسلامی اصولوں کے مطابق غیر سودی لین دین ہوتا ہے۔ ملائشیا کے وزیر اعظم جناب محاضر محمد دینی طبقہ کو احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں، دینی تحریکوں کے بارے میں نرم گوشہ رکھتے ہیں بلکہ حتی الامکان ان کے ساتھ تعاون کرتے ہیں، حالات میں کتنی حیرت انگیز لیکن خوشگوار تبدیلی آئی ہے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ جناب روسنا ماجد نے جو خود ایک بلند پایہ صحافی ہیں ایک موقع پر کہا کہ پہلے جب ہم اپنے طلبہ کو تعلیم کے لیے باہر بھیجتے تھے تو ہمیں اس بات کا خدشہ لگا رہتا تھا کہ یہ لوگ کہیں ہپّی بن کر نہ واپس آئیں لیکن آج صورت حال بالکل بدل گئی ہے۔ اب ہمارے طلبہ نہ صرف یہ کہ اسلامی ذہن و فکر کے سانچے میں ڈھل کر آ رہے بلکہ دین کے علمبردار اور داعی بن کر آ رہے ہیں جو ملک کے لیے انتہائی خوش کن بات ہے۔

ملائشیا کے اندر دینی بیداری سے ملک کے اندر اور باہر عام طور سے مسرت و انبساط کا تاثر

پایا جاتا ہے، لیکن ایک طبقہ اسلام کی صاف ستھری فضا میں گھٹن محسوس کر رہا ہے، پڑوس کے ممالک بھی اسلامی بیداری کے آثار دیکھ کر خائف ہیں، سنگاپور اور انڈونیشیا کا حکمراں طبقہ بالخصوص مضطر ہے، انڈونیشیا کے صدر سوہارتو نے اپنے یہاں کی دینی تحریکوں کو آہنی ہاتھوں سے دبا رکھا ہے، انھیں خوف ہو رہا ہے کہ اسلامی بیداری کا یہ سیلِ رواں کہیں سرحد پار نہ آ جائے اور ان کے لیے پریشانی کا سبب بن جائے، ان کے علاوہ دیگر مغربی ممالک کے اخبار نویس خاص طور سے اسلامی بیداری کو ہوّا بنا کر پیش کر رہے ہیں، آئے دن سیاسی کالموں، تجزیوں اور تبصروں میں دینی بیداری کا ذکر ضرور ہوتا ہے، اور طرح طرح کے سوالات اٹھائے جاتے ہیں۔

نائیجریا خدمتِ دین کا ایک میدان:

نائیجریا میں علماء و ائمہ کی تنظیم کے جنرل سکریٹری شیخ آدم عبداللہ الیوری نے ایک بیان میں کہا ہے کہ قادیانی فرقے نے نائیجریا کو اپنی دعوتی سرگرمیوں کا مرکز بنا لیا ہے۔ اس خطہ میں ان کے اثرات کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ لاگوس اور دوسرے بڑے شہروں میں سو سے زائد ان کی عبادت گاہیں تعمیر ہو چکی ہیں، خاصی بڑی تعداد ان کے مدارس کی بھی ہے۔ ان تعلیم گاہوں اور ان عبادت گاہوں کے منبروں سے کس قسم کے افکار و خیالات کی تبلیغ ہوتی ہو گی محتاج بیان نہیں، نائیجریا مسلم اکثریت کا ملک ہے، لیکن طویل عرصہ تک استعمار کے شکنجے میں رہا ہے، یہاں کے لوگ اقتصادی اور تعلیمی دونوں میدانوں میں پسماندہ ہیں، اسلام مخالف سرگرمیوں کے لیے ایسے علاقے زرخیز ثابت ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ عیسائی مشنریوں کے علاوہ اب قادیانیت نے بھی اسے اپنی محنت و توجہ کا مرکز بنایا ہے۔ اس فرقہ کے پاس دولت بھی اور جذبۂ عمل بھی، اور اسی میں اس کی کامیابی کا راز مضمر ہے، برصغیر ہند و پاک میں مسلمان اس فرقہ کی اصلیت سے آگاہ ہیں، اس لیے یہاں ان کی کامیابی کے امکانات صفر کے برابر ہیں، چنانچہ اس کے لوگوں نے افریقہ کے ناخواندہ و نیم خواندہ مسلمانوں کو گمراہ کرنے کا منصوبہ بنایا ہے، کہیں کہیں انھیں اس وجہ سے بھی کامیابی ہو جاتی ہے کہ یہ مسلمانوں کے بھیس میں آتے ہیں، بظاہر اسلام کی دعوت دیتے ہیں اور بڑی چالاکی سے اپنے افکار و خیالات کی تبلیغ کرتے ہیں۔

نائیجریا میں موجود علمائے حق قادیانیت کے دجل و فریب کا پردہ چاک کرنے میں مصروف ہیں اور وہاں کے مسلمانوں کو بتا رہے ہیں کہ قادیانی ترجمہ قرآن کے نام سے جو چیز ان کو پڑھنے کے لیے دے رہے ہیں اس میں تریاق نہیں زہر ہے۔ ایک اخباری اطلاع کے مطابق رابطہ عالم اسلامی نے موسا، یوریا، اور بامبا افریقہ اور بالخصوص نائیجریا کی مقامی زبانوں میں قرآن پاک کے صحیح ترجمے فراہم کیے ہیں تاکہ وہاں کے مسلمانوں کو قادیانیت کے جال میں گرنے سے بچایا جائے۔

قرآن مجید کے صحیح ترجموں کے علاوہ دیگر اسلامی موضوعات پر کتابوں کی فراہمی مختلف علاقوں میں اسکولوں اور شفاخانوں کا قیام وہاں کے مسلمانوں کی اہم خدمت اور تبلیغ اسلام کا بہترین ذریعہ ہے۔

موسوعۃ فقہیۃ

ہفت روزہ 'البلاغ' کویت کی ایک اطلاع کے مطابق موسوعۃ فقہیۃ (فقہ کی انسائیکلوپیڈیا) کی بارہویں جلد طبع ہو کر منظر عام پر آچکی ہے اور تیرہویں جلد زیر طبع ہے۔ کویت میں وزارت اوقاف اور دینی امور کے سکریٹری جناب محمد ناصر الحمضان نے موسوعہ فقہیہ کی تفصیلات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا ہے کہ بارہویں جلد میں عبادات، معاملات، اور خاندانی امور سے متعلق فقہی اصطلاحات کے بارے میں مواد اکٹھا کیا گیا ہے، قبل ازیں گیارہ جلدیں طبع ہو چکی ہیں۔ ان کے بیان کے مطابق یہ موسوعہ ۴۵ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہوگا اور فقہ کا ایک اہم مرجع ثابت ہوگا۔ اس کی تکمیل کے بعد بہت ساری کتابوں کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی، کسی بھی فقہی موضوع سے متعلق جملہ مواد اکٹھا دستیاب ہو جائے گا، جس میں مسائل کے ساتھ ان کے دلائل بھی مذکور ہوں گے، ان کے ماخذ کے صفحات اور ایڈیشن کی تحدید کے ساتھ حوالہ ہوگا، احادیث کی پوری تخریج ہوگی، ان کی حیثیت واضح کی جائے گی، نیز موسوعہ میں مذکور فقہاء اور دیگر اعلام پر تشریحی نوٹ ہوں گے۔

جناب محمد ناصر الحمضان کے بیان کے مطابق آئندہ تین برسوں میں موسوعہ فقہیہ کا منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گا، اس وقت ننو جید علماء، فقہاء اور تحقیقی کام کرنے والے افراد پر اس کا عملہ مشتمل ہے، اور شب و روز منصوبہ کی تکمیل میں مصروف ہے۔ موسوعہ فقہیہ کے دو قسم کے ایڈیشن ہیں ایک اعلیٰ

جو علمی اداروں، سرکاری معاہد اور اس منصوبہ میں شریک افراد کو پیش کیا جائے گا۔ دوسرا عام ایڈیشن ہے جو ارزاں قیمت پر فروخت کے لیے دستیاب ہوگا۔

غیر مسلموں میں دعوتی کام:

عرصہ سے دعوت و تبلیغ کا کام مسلمانوں ہی کے اندر محدود ہو کر رہ گیا ہے، دنیا کے مختلف خطّوں میں خود مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ مسلمان کہلانے کے باوجود اسلام کے صحیح عقائد و اعمال سے دور ہو گیا ہے اور اس کے یہاں اسلام کا ایک نیا ایڈیشن تیار ہو چکا ہے، ایک بڑے طبقہ کو کلمہ تک یاد نہیں، اس صورت حال نے دعوت و تبلیغ کا کام کرنے والوں کو مجبور کر دیا ہے کہ پہلے وہ اپنے گھر کی خبر لیں اس کے بعد دوسری طرف رُخ کریں۔ غیر مسلموں میں دعوت کا کام تقریباً رک گیا ہے، لیکن جب بھی اس طرف توجہ کی گئی اس کے مثبت نتائج برآمد ہوئے، اسلامی تعلیمات میں دلوں کو موہ لینے کی کشش ہنوز باقی ہے۔

ایک اخباری اطلاع کے بموجب بعض جماعتوں نے جنوبی سوڈان کے قبائل میں دعوت کا کام شروع کیا، تھوڑے عرصہ میں حوصلہ افزا نتائج سامنے آ رہے ہیں، اخباری اطلاع کے مطابق جنوبی سوڈان میں رہائش پذیر "دینکا اقیر" قبیلہ کے ہزاروں افراد مشرف بہ اسلام ہو چکے ہیں۔ قبیلہ کے پردھان، ان کے سکریٹری کے علاوہ دیگر پندرہ با اثر اور ممتاز افراد اسلام قبول کرنے والوں میں شامل ہیں۔ اسلام لانے کے بعد دوسرا اہم مرحلہ اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانے کا ہوتا ہے۔ اطمینان کی بات ہے کہ اس رخ پر بھی کام ہو رہا ہے، اور ان افراد اور ان کے بچوں کی دینی تعلیم کے لیے متعدد مدارس قائم کیے گئے ہیں۔

REGD. NO. ID (SE)/53 — ZIKR-O-FIKR — Vol. III-Part 3
Reg No. 45862/86 — Jan -1988
G 1/278, Okhla, P.O. Jamia Nagar, New Delhi-110025

Printed at Lahooti Print Aids, Jama Masjid, Delhi-110006
and published by Syed Taha Abdullah, G 1/278, Okhla,
P. O. Jamia Nagar, New Delhi-110025

ایک علمی، دینی اور ادبی ماہنامہ

ذکر و فکر (دہلی)

مرتبہ

خواجہ احمد فاروقی

Dr. Z... Jamia Nagar, J. M. I. New...

مجلس ادارت

خلیق احمد نظامی

عبداللہ عباس ندوی

خواجہ احمد فاروقی

خط وکتابت کا پتہ

جی ۱/۸ ۲۷ اوکھلا ۔ ڈاکخانہ جامعہ نگر ، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵

ایڈیٹر : خواجہ احمد فاروقی

منیجر : محمد شبیر ندوی

پرنٹر پبلیشر : طہٰ عبداللہ

مطبع : لاہوتی پرنٹ ایڈس ، جامع مسجد دہلی-۶

قیمت : ۵۰/ روپے (سالانہ) فی پرچہ ۵/

غیر ممالک سے ۲۰ ڈالر (یا اس کے بالمقابل سکہ ہندوستانی روپے میں)

تمام پرچے ہوائی ڈاک سے بھیجے جائیں گے اور وی پی نہیں بھیجی جائے گی

نوٹ

رقم ، ڈرافٹ یا منی آرڈر کے ذریعہ ہی ارسال فرمائیں ۔ اگر چک سے رقم بھیجنا چاہیں تو مزید آٹھ روپے مصارف بنک کا اضافہ کرکے بھیجیں ۔ نیز ڈرافٹ ، منی آڈر یا چک مندرجہ ذیل پتہ پر بھیجیں :

ZIKR-O-FIKR (Monthly)
G 1/? 8, OKHLA, JA... NAGAR
NEW DELH...

9 JAN 1988

جلد: ـــــــ (۳)　　　جمادی الثانیہ ـــــــ ۱۴۰۸ھ

شمارہ: ـــــــ (۴)　　　فروری ـــــــ ۱۹۸۸ء

ترتیب

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی

مُذاکرات

آزادی کے بعد ہندوستان میں جتنی اعلیٰ تعلیم کی توسیع ہوئی ہے، اتنی ابتدائی تعلیم کی نہیں ہوئی۔ ہم نے مثلث کو اُلٹا کر دیا ہے اور ہمارا حال بلا مبالغہ بانس کے اُس پیڑ کا سا ہے جس کے تنے پر گانٹھیں ہی گانٹھیں ہیں اور اوپر جا کر چند ہرے پتے نظر آتے ہیں۔

اعلیٰ تعلیم میں بھی، توسیع زیادہ ہوئی ہے۔ ترقی کم۔ صوبائی ذہنیت نے یونی ورسٹیوں کی تعداد میں بے طرح اضافہ کر دیا ہے۔ ان کے لیے استادوں کی مانگ ہوئی اور اُن کا تقرر "تھوک" میں ہونے لگا۔ نتیجہ یہ کہ ریسرچ کے معیار گر گئے، اور ہم ادنیٰ درجہ کے استادوں پر راضی ہو گئے اس لیے کہ ہمیں پنج سالہ منصوبہ کے مطابق مقررہ جگہیں بھرنی تھیں۔ یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن نے اس سیلاب بلا کا مقابلہ اِس طرح کیا کہ یونی ورسٹی کی جگہوں کے لیے ریسرچ کی شرط لازمی قرار دے دی۔

یاروں نے اِس شرط کو اس طرح پورا کیا کہ تحقیقی مقالہ بازار میں لکھوا لیا یا قینچی اور سیاہی کی مدد سے "تھی سس" تیار کر لیا یا بڑے پیمانہ پر نقل شروع کر دی۔ ذوقؔ و ظفرؔ یا امیرؔ و داغؔ کا زمانہ ایک ہے۔ ایک مقالہ کے مطالب ادنیٰ تبدیلی کے ساتھ دوسرے میں نقل ہونے لگے۔ اِس سے بھی آسان نسخہ یہ تھا کہ پاکستان یا انگلستان سے اسی موضوع پر کتاب منگوالی اور اسے بڑے اعتماد کے ساتھ اپنے لباس میں پیش کر دیا۔

اس وقت استثنائی مثالوں سے بحث نہیں لیکن عام صورتِ حال یہ ہے جس کا اوپر ذکر ہوا۔ ان سب باتوں کی وجہ سے اردو کا کارواں ایک جگہ ٹھہر گیا، ہماری صلاحیتیں ٹھٹھر کر رہ گئیں اور فکر سے تخلیقی عنصر ختم ہو گیا۔ بعض حضرات نے تحقیق اور تنقید کو ہنر پوشی اور عیب جوئی کے مترادف سمجھا۔ یہ میمنہ کو میسرہ سے اُلٹ کر قلبِ لشکر میں در آنا چاہتے ہیں اور سستی شہرت کے طلب گار ہیں۔

ہمیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ملک و قوم اور زبان و ادب کی ترقی کے لیے سچی تحقیق ازبس ضروری ہے۔ اسی کی بدولت آج علم طب، تعلیم، فن تعمیر، تاریخ قدیم، آثار قدیمہ، اسلحہ سازی، رسل و رسائل اور آمد و رفت کے میدان میں نئے اُفق اور نئے جہان سامنے آگئے ہیں جو اس سے پہلے نظروں سے اوجھل تھے۔ اب ریسرچ سائنسی تلاش و تحقیق کا نام ہے اور اس کا تعلق بخت و اتفاق سے نہیں۔ آزمائش و امتحان و تجربے سے ہے۔ اس کا مقصد نئے حقائق کی دریافت، نئے افکار و خیالات کی جستجو اور نئی توجیہ و تعبیر و تشریح ہے۔ یہ تحقیقی اور علمی کام بغیر پتہ مارے اور بغیر ریسرچ کی تکنیک اور آداب و اصول کے جانے ہوئے ممکن نہیں۔

اُردو کی مصیبت کئی طرح ہے۔ ایک تو وہ لوگ ہیں جو اردو کے وجود ہی کے منکر ہیں۔ ع

ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

ان کے نزدیک مولانا آزاد کی تقریریں ہندی میں ہیں اور مغل اعظم اردو کی فلم نہیں، ہندی کی فلم ہے۔ یہ سفید گلاب پر سُرخ رنگ لگا دیتے ہیں اور اسے سُرخ گلاب کا نام دیتے ہیں۔ جو ہندی رائج کی جا رہی ہے وہ آئین و دستور کی صراحتوں کے خلاف اتنی بوجھل ہے کہ عام آدمی کی سمجھ سے باہر ہے۔ اب اسٹیشن پر ٹھنڈا پانی لکھا ہوا نہیں ملے گا۔ اس کے بجائے شیتل جل ہے۔ حالانکہ ٹھنڈا پانی نہ عربی ہے، نہ فارسی ہے، نہ ترکی ہے، سرتاسر ہندی ہے۔ اس کا بھی اہتمام کیا گیا ہے کہ یوپی میں اردو میڈیم اسکول نہ ہونے کے برابر ہیں اور ہماری مائیں اور بہنیں اردو تہذیب سے بیگانہ ہوتی جا رہی ہیں۔

تقسیم سے اردو پر جو منفی اثرات مرتب ہوئے ہیں ان میں سب سے زیادہ دردناک بات یہ ہے کہ اردو اپنی لسانی بنیادوں، تہذیبی سرچشموں اور ادبی وراثتوں سے دور ہوتی جا رہی ہے اور اس کا اردو پن ختم ہوتا جا رہا ہے۔ مے رنڈا ہاؤس اور سینٹ اسٹیفنس کالج میں جو اردو بولی جا رہی ہے وہ کچھ اس قسم کی ہے: "کل کو ڈیڈی اسٹیٹس (States) سے آ رہے ہیں۔ دو بجے رات کے جہاز لینڈ (Land) کرتا ہے۔ بڑا اَن ارتھلی آور (un earthly hour) ہے لیکن ائرپورٹ جانا ہی پڑے گا۔ There is no avoiding" الفاظ کو چھوڑیے اس میں پورے پورے جملے انگریزی کے ہیں۔

توبۃ النصوح میں ڈپٹی نذیر احمد کے یہ جملے ملاحظہ ہوں۔ اب ایسی کوثر میں دھلی ہوئی اردو نہ

کوئی بولتا ہے، نہ کسی رسالے اور کتاب میں نظر آتی ہے :

"یار ہو بڑے خوش قسمت کہ اس وقت بھاڑ مل گیا۔ ذرا ہاتھ تو لگاؤ، دیکھو کیسے بھلس رہے ہیں اور سوندھی سوندھی خوشبو بھی عجیب ہی دل فریب ہے کہ بس بیان نہیں ہو سکتا۔ تعجب ہے کہ لوگوں نے خس اور مٹی کا عطر نکالا مگر بھنے ہوئے چنوں کی طرف کسی کا ذہن نہیں گیا۔ کوئی فن ہو، کمال بھی کیا چیز ہے۔ دیکھیے اتنی تو رات گئی ہے مگر چدامی کی دکان پر بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ بندے نے تحقیق سُنا ہے کہ حضور والا کے خلاصے میں بھی چدامی کی دکان کا چنا بلاناغہ لگ کر جاتا ہے۔ اور واقع میں ذرا آپ غور سے دیکھیے کیا کمال کرتا ہے کہ بھوننے میں چنوں کو سڈول بنا دیتا ہے۔ بھئی تمھیں میرے سر کی قسم، سچ کہنا، ایسے خوب صورت، خوش قطع، سڈول چنے تم نے پہلے بھی کبھی دیکھے ہیں؟ دال بنانے میں تو اس کو یہ کمال ہے کہ کسی دانے پر خراش تک نہیں۔ ٹوٹنے پھوٹنے کا کیا مذکور۔ اور دانوں کی رنگت دیکھیے کوئی بسنتی ہے، کوئی پستئی۔"

جب پنڈت جواہر لال نہرو کا انتقال ہوا ہے اور شاستری جی وزیر اعظم ہند ہوئے ہیں تو میری بیوی مرحومہ کہنے لگیں، "آپ نے صف شکن کو ہاتھی پر بٹھا دیا ہے۔" کس قدر بلیغ جملہ ہے لیکن اب کسی کو نہ فسانۂ آزاد کی خبر ہے اور نہ صف شکن کی۔

۱۹۴۷ء میں ہزاروں آدمی پاکستان کی طرف بھاگے چلے جا رہے تھے کچھ ڈر کی وجہ سے، کچھ لالچ کی وجہ سے۔ کچھ کو یہ تصور تھا کہ وہاں دودھ کی نہریں بہہ رہی ہوں گی اور حوریں جام کوثر لیے کھڑی ہوں گی۔ میری چچی صاحبہ گھر کی بیٹھنے والی، اللہ و رسولؐ کو یاد کرنے والی سیدھی سادی خاتون تھیں۔ ان کی تعلیم سوئزر لینڈ کے کسی Finishing school میں نہیں ہوئی۔ گھر کی چہار دیواری میں ہوئی تھی۔ وہ یہ سب واقعات سُن کے کہنے لگیں (ذرا ایک ایک لفظ اور ایک ایک تلمیح پر غور فرمائیے گا)، "بھیّا میں سیاست ویاست تو نہیں جانتی لیکن مجھے وہ قصّہ یاد آتا ہے۔ ایک بگلا تھا، سفید، بُراق۔ جوانی میں وہ مچھلیوں کا شکار کرتا تھا اور آرام و آسایش کی زندگی گزارتا تھا۔ لیکن جب بڑھاپے میں اس کے قوا جواب دے گئے اور وہ پہلے کی طرح شکار کرنے سے مجبور ہو گیا تو

اُس نے ایک چال چلی۔ ایک روز رونی صورت بنا کر اور منہ لٹکا کر بیٹھ گیا۔ ایک کچھوا آیا اور پوچھنے لگا "خیر تو ہے، آپ اِس قدر افسردہ کیوں ہیں ؟" "کیا بتاؤں اِس تالاب سے مجھے ایک انس ہے۔ ساری زندگی یہاں کاٹی ہے، ایک آدھ مچھلی پکڑ کے اپنا گزارہ کر لیتا تھا لیکن اب یہ تالاب مچھلیوں سے خالی ہو جائے گا اور میں اِس بڑھاپے میں فاقے سے مر جاؤں گا۔ آج دو مچھیرے اِدھر سے گزرے۔ کہہ رہے تھے اس میں خوب مچھلیاں بھری ہوئی ہیں۔ اگلے مہینے اس میں بڑے بڑے جال ڈالیں گے اور سب مچھلیوں کو ایک ساتھ پکڑ لیں گے۔" کچھوے نے جا کر یہ خبر مچھلیوں کو سُنائی۔ گھبرا کر بگلے کے قریب آئیں اور کہنے لگیں، "ہم نے یہ بُری خبر سنی ہے۔ بتائیے ہم کیا کریں۔ ایک خردمند کو مصیبت کے وقت دشمن کا بھی مشورہ لے لینا چاہیے۔ خاص طور پر جب کہ اس میں دشمن کا بھی فائدہ ہو، آپ کی زندگی بھی تو آخر ہمارے اوپر منحصر ہے۔" بگلے نے مسکین صورت بناتے ہوئے کہا، "ان مچھیروں کم بختوں کا مقابلہ ناممکن ہے۔ ہاں ایک صورت سمجھ آتی ہے۔ یہاں سے قریب ہی اس پہاڑی کے پیچھے ایک جھیل ہے جو کبھی خشک نہیں ہوتی اور جس کا پانی آئینے سے زیادہ شفاف ہے۔ اگر تم سب کسی طرح وہاں منتقل ہو جاؤ تو ساری زندگی امن چین سے گزارو گی۔" مچھلیاں کہنے لگیں، "اے ہے یہ تو بڑی اچھی صورت ہے لیکن بغیر آپ کی مدد کے وہاں ہم کیسے جا سکتے ہیں" بگلے نے جواب دیا، "مجھے مدد کرنے میں تامل نہیں مگر وقت لگے گا۔ اِتنا تو میں کر سکتا ہوں کہ دو دو تین تین مچھلیوں کو روز اپنی چونچ میں دبا کر لے جاؤں اور اس جھیل میں پہنچا دوں۔"

مچھلیاں راضی ہو گئیں اور اِس طرح بگلا روز مچھلیوں کو پہاڑی کے پیچھے کھاتا رہا۔

یہ کہانی کلیلہ و دمنہ میں ہے جس کا ترجمہ عربی اور فارسی دونوں میں ہو چکا ہے لیکن اب ہماری لڑکیوں کو جو ٹی۔وی اور سینما کی پیداوار ہیں، نہ کہانیاں یاد ہیں، نہ لوریاں، نہ گیت، نہ لطیفے، نہ ان کو گلستاں کی خبر ہے نہ کلیلہ و دمنہ کی۔ یہ صورت ہندوستان ہی میں نہیں پاکستان میں بھی ہے۔ لندن میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اپنے بچے کا قصہ سناتے تھے جو کراچی کے انگریزی اسکول میں پڑھتا ہے۔ ایک روز بدایوں کے ایک بزرگ ان کے یہاں پہنچے اور اس بچے سے پوچھا: "میاں! والد صاحب قبلہ تشریف رکھتے ہیں؟" بچہ اندر گیا اور ماں سے پوچھا، "ممی! ہمارے نیبرہڈ میں کوئی والد صاحب قبلہ رہتے ہیں، ایک آدمی پوچھتا ہے۔"

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

ڈاکٹر کلیم احمد عاجز
(استاد ادبیات اردو، پٹنہ یونیورسٹی)

ایک سپاہی اور گرا

شاعری اور فلسفے کی کتابیں موت کی تفسیر اور ترجمانی سے بھری پڑی ہیں۔ وہ داستان کیا دُہرائی جائے میں نے یہ ضرور سوچنے کی کوشش کی ہے کہ موت میں نقصان کس کا ہے؟ مرنے والے کا یا جینے والے کا اور ہر اعتبار سے میری سمجھ میں یہی بات آئی ہے کہ جانے والے کا منافع ہے۔ رہنے والوں کا گھاٹا۔ گرچہ بظاہر جان سی بے بہا اور بیش بہا شے جاتی ہے۔ اور رہنے والوں کے پاس موجود رہتی ہے۔ لیکن زیاں بہرحال جینے والوں ہی کا ہے۔ میرا تجربہ بھی یہی کہتا ہے اور میری فکر بھی یہی کہتی ہے۔ میں نے سمجھا بھی یہی سوچا بھی یہی لکھا بھی یہی۔ بحث اور دلیل کی ضرورت نہیں۔ میں نے تقریباً بیس سال پہلے کہا تھا:

جو قتل ہو گئے اپنی بلا تو ٹال گئے
بچے ہوؤں کو بڑی کشمکش میں ڈال گئے

میں ریسرچ گائڈ کی حیثیت لینے سے بھی بہت بھاگتا ہوں۔ بہت احتیاط کرتا ہوں اور بہت تامل کرتا ہوں۔ وجوہ فی الحال چند ہیں ان کے اظہار سے بھی اس وقت گریز ہے۔ اس وقت میرا ذہن منتشر ہے۔ خیالات کا طوفان ہے، جھونکے پر جھونکے آرہے ہیں۔ میں کیا لکھوں گا کہہ نہیں سکتا۔ اور اکثر و بیشتر میں انہیں خیالات میں قلم اٹھاتا ہوں۔ اس وقت بھی ذہن میں خیالات کا Rush ہے مگر کوئی خیال جمتا نہیں۔ مولوی محی الدین ام۔ اے اس وقت اسکول میں ٹیچر ہیں۔ دو سال سے پی۔ اچ ڈی کا مقالہ مرتب کرنے کو میرے تعاقب میں ہیں۔ بہت معقول آدمی ہیں۔ بے حد سنجیدہ۔ ذہین، کم سخن، کم گفتار اور بہت مودب۔ میں نے انھیں انگیز کر لیا۔ ایک سال قبل اپنے موضوع پر جو زندہ شخصیت تھی۔ کے نام سے مجھ سے خط لیا۔ میں نے مولانا کی خدمت میں خط تحریر کر دیا۔ وہ گئے ملے۔ مولانا نہایت شفقت سے پیش آئے حوصلہ افزائی

فرمائی۔ ضروری مشورے دیے۔ ہدایتیں دیں۔ کچھ مواد بھی عنایت کیا۔ محی الدین صاحب نے کام شروع کر دیا۔ اسی دوران ایک اور صاحب تشریف لائے۔ میرے عزیز دوست ہیں۔ ایک کالج میں پروفیسر ہیں۔ مولانا کے گاؤں کے ہیں اور شاید قرابت داروں میں ہیں۔ آکر مجھ پر کچھ خفا ہوئے کہ میں مولانا پر مقالہ لکھنے کی تیاری کر رہا ہوں مواد اکٹھا کر چکا ہوں کر رہا ہوں تم نے محی الدین کو درمیان میں ڈال دیا، میں نے کہا اب بھی کوئی مضائقہ نہیں ابھی تو کام کا آغاز ہی ہوا ہے۔ میں بھی مولانا کو لکھ دیتا ہوں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے آپ مولانا سے مل کر ان کی رضامندی لے لیجئے۔ محی الدین کوئی اور موضوع چن لیں گے۔ وہ گئے۔ مولانا سے ملے۔ مولانا نے انکار کر دیا اور فرمایا۔ کلیم عاجز کے ماتحت محی الدین کے مقالے کا کام جاری رہے گا

چند دن پہلے محی الدین صاحب آئے۔ اپنے مقالے کے اجزا دکھاتے رہے۔ کام تقریباً اختتام پر ہے میں نے کہا سوانح کا حصہ کمزور ہے۔ اسے پھر لکھئے اور لکھنے سے پہلے مولانا کے پاس جائیے دو چار دن قیام کیجئے۔ دیکھئے پوچھئے پڑھیے سوچئے اور پھر لکھئے۔ انھوں نے منظور کیا۔ مسودے اک جا کیے۔ فائل میں رکھا کہ میرے ایک شاگرد آئے ایک خط دیا۔ میں نے پڑھا۔ خط ہاتھ سے گرا یا میں نے رکھا یاد نہیں۔ خلا میں دیکھتا رہا۔ قدرت کے ڈرامائی نظام کو سوچا۔ اور نظام ترتیب کے انوکھے پن کے آگے سر جھکا دیا۔ آنکھیں کچھ نمناک ہوگئیں۔ ذہن زمین کی طرف منتقل ہوا۔ بکھرے ہوئے کاغذات کی طرف دیکھا۔ اور میر کا شعر پڑھا:

کیا سہل جی سے ہاتھ اُٹھا بیٹھتے ہیں۔ آہ
یہ عشق پیشگاں ہیں الٰہی کہاں کے لوگ

محی الدین صاحب کے مقالے کا سوانحی حصہ نامکمل رہا۔ لیکن سوانح مکمل ہوگئی۔ چراغ جل رہا تھا۔ کاغذات بکھرے پڑے تھے کام جاری تھا۔ جھونکا آیا۔ چراغ بجھ گیا دیکھئے بکھرے کاغذ کس طرح سمیٹے جاسکیں۔

خط صدر شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی کا تھا کہ مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن کا انتقال ہوگیا اِس وقت تعزیتی جلسہ ہے آجاؤ۔ محی الدین صاحب مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن پر اپنا نامکمل مقالہ لیے بیٹھے ہیں:

ہوا تھی کدھر کی کدھر چل پڑی

نو عمری سے ہی مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کا نام سُنا کیا تھا مولانا شاہ معین الدینؒ سے ۱۹۶۶ء میں مکۃ المکرمہ میں نیاز حاصل ہوا۔ مدرسہ صولتیہ میں مولانا شاہ معین الدین ندویؒ کا قیام تھا میرا قیام بھی وہیں طے ہوا۔ صبح شام دن رات شاہ صاحب سے صحبتیں رہیں۔ لیکن صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب سے پہلی تقریب ملاقات پانچ سال بعد ہوئی جب میں شبلی کالج کے مشاعرے میں گیا۔ میرا قیام مولانا ہی کی رہائش گاہ پر ہوا، اور مجھے یہ کہنے میں تامّل نہیں حجاب نہیں کہ "بہاری پن" بھی شخصیت کا ایک اہم جز ہے جو میں نے بہت تفصیل سے اپنے پی۔ ایچ ڈی کے مقالے "بہار میں اردو شاعری کا ارتقا" میں آج سے ۲۵ سال قبل پیش کیا ہے۔ بہرحال یہ شخصیت کا ایک خاص رنگ خاص آہنگ خاص خوشبو خاص جلوہ ہے، جو انداز ملاقات، انداز تعارف، طرز نشست و برخاست، آداب گفتگو، خاموشی اور سخن گوئی، آواز اور لہجہ، آہٹ اور مُسکراہٹ بلکہ بڑی حد تک وضع قطع تراش خراش میں دھوپ چھاؤں کی طرح رہتا ہے اور بڑی لطافت اور سبک رفتاری سے مہین اور نازک انداز میں مخاطب تک پہنچتا ہے۔ مولانا سے ان کی میزبانی کے دوران خوب کھل کر یہ حقیقت مجھ پر روشن ہوئی۔ احقر بہاری مرحوم برسہا برس لکھنؤ میں رہے۔ لیکن احقر بہاری ہی کہلائے اور اس حیثیت سے ایک مخصوص اکرام اور اعزاز بھی اہلِ لکھنو سے حاصل کیا جیسا، انھوں نے لکھنؤ کے ایک مشاعرے میں بڑے تیور سے پڑھا:

شوکت مجھے آتی ہے نہ شان آتی ہے　　پورب کا ہوں پوربی زبان آتی ہے
احباب کا حسن ظن ہے یہ فرمانا　　احقر سے مشاعروں میں جان آتی ہے

اور میں مولانا کے مکان پر ایک دن کی بجائے دو دن رہ گیا۔ میں تو ایک نگاہ ہی میں ان کا گرویدہ ہوگیا تھا اور وہ مجھ سے اتنے قریب ہو گئے کہ مجھے بالکل احساس نہ رہا کہ وہ مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن ندوی ناظم دارالمصنفین اور شبلی کالج کے ذمہ داروں میں ہیں۔ ایسا لگا کہ وہ تو میرے گاؤں کے گھر کے رشتے کے خاندان کے قبیلے کے ہیں میرے بزرگ ہیں استاد ہیں، مربی ہیں، سرپرست ہیں۔ مجھ سے بہت خوش ہیں مسرور ہیں۔ میرے قدرشناس، میری ترقی کے خواہاں، بلندی کے کوشاں۔ میرے محافظ معین و مددگار ہیں۔ اور اس کے بعد سے ہر ملاقات میں یہ کیفیت بڑھتی ہی رہی۔ پھر ان سے اعظم گڑھ میں، لکھنؤ میں، پٹنہ میں، دہلی میں، کراچی میں ملاقات ہوتی رہی اور ہر ملاقات میں وہ قریب تر ہوتے گئے۔ ان کے خطوط آنے لگے، مشورے آنے لگے، ہدایتیں آنے لگیں۔

میری یہی کمزوری بھی ہے اور یہی توانائی بھی کہ میں جس سے قریب ہوتا ہوں اس سے کبھی دور نہیں ہوتا۔ گرچہ قریب ہونا شکلوں سے یا اتفاق سے ہوتا ہے۔ لیکن ہوتا ہے تو یہ اتفاق حقیقت اور واقعہ میں تبدیل ہو جاتا ہے میری زندگی میں آسودگی اور سیری کا گذر نہیں، اکتاہٹ اور یک رنگی کا دخل نہیں میری زندگی ایک مستقل اور شدید تشنگی ہے۔ اس لیے میرے لیے ہر شب، شبِ برات ہے اور ہر روز، روزِ عید۔ میری ارادت عقیدت اور محبت میں کمی نہیں آتی۔ میری صرف یہی کمائی ہے اس لیے کمائی کوئی چھوڑ نہیں سکتا۔ میری یہی احتیاج یہی ضرورت ہے لہذا اسے حاصل کرنے سے کبھی نہیں تھکتا۔ مجھے جس سے محبت ہو جاتی ہے، جس سے یہ رشتہ ہو جاتا ہے وہ کبھی نہیں ٹوٹتا۔ مولانا سے جو تعلق پندرہ سال پہلے ہوا وہ بڑھتا ہی رہا۔ وہ تخم اُگتا ہی رہا۔ پھول پھول لاتا ہی رہا۔ اور آج ان کے انتقال کی خبر سُننے کے بعد میں یہ سطریں اسی ہم آہنگی محبت اور تعلق کے رشتے سے مست و سرشار ہو کر لکھ رہا ہوں۔ لوگ چاہے جو سمجھیں۔ میں اُن کے انتقال سے غمگین اس لیے زیادہ ہوں کہ ان کے ذریعہ یا ان کی شخصیت جیسی شخصیتوں سے مجھے بشرط حیات آئندہ جو ملنے والا تھا اس کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ یہ نقصان، یہ گھاٹا، یہ خسارہ سراسر میرا ہوا ہے۔

آخری ملاقات مولانا سے شاید دو سال پہلے کراچی میں ہوئی۔ ہوٹل جیبس میں حضرت علامہ سید سلیمان ندوی کی یادگار منائی جا رہی تھی۔ ناظم جلسہ پروفیسر فخرالحسن مجھے بھی کھینچ لے گئے۔ میں سامعین کے حلقہ میں کنارے بیٹھ گیا تو مولانا نے اسٹیج سے اشارا کیا اور فخرالحسن صاحب نے گویا بزور گھسیٹ کر مجھے اسٹیج پر لے جا کر ایک صوفے پر بٹھا دیا۔ میں بڑے صوفے کے ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ لیکن آگے غضب یہ ہوا کہ ناظم جلسہ نے کچھ دیر بعد میری بغل میں ہاتھ دے کر اٹھایا۔ آدمی قدآور اور قوی ہیں۔ میں نحیف الجثہ۔ انھوں نے مجھے مائک کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔ کلیم جو عملی اعتبار سے گونگا ہے کراچی کے ہزاروں اہلِ علم اور نکتہ چیں حضرات کے سامنے کیا بول سکتا نتیجہ یہ ہوا کہ اول اول نروس ہو گیا اور کہنے لگا:

> "دیسنہ جیسا بہار کا گاؤں جہاں آج بیسویں صدی کے آخری چوتھائی میں بھی جانے کے لیے پاجامہ کھوٹنا پڑتا ہے۔ نالے پرنالے پھلانگنے پڑتے ہیں، اپنا سامان ہاتھ میں لے کر پیدل چلنا پڑتا ہے، گوبر کی بو سونگھنی پڑتی ہے، جُگالی کرتے

ہوئے بیل بھینس۔ کوری کرتی ہوئی بکریاں اور کٹ کٹ کرتی ہوئی مرغیوں کے درمیان سے بچتے ہوئے ہٹتے ہوئے نکلنا اور چلنا پڑتا ہے ایسے گاؤں سے علامہ سید سلیمان ندویؒ جیسا بین الاقوامی شہرت واہمیت کا مالک یگانہ روزگار عالم دین تاریخ داں اور مصنف کیسے نکل آیا اور صرف حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم اور صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ہی نہیں۔ علامہ فضل حق آزاد، نواب امداد امام اثر، علامہ شوق نیموی، شفق عماد پوری، احقر بہاری، مولانا مناظر احسن گیلانی، بہار شیخ پوروی، راسخ عظیم آبادی، فوق مفتی گنجی، نجیب اشرف ندوی۔ یہ سب یکتائے روزگار شخصیتیں گوبر گوئٹھا، گھاس پوال، کھر اٹوٹی، سری پھونس، ساگ پات، کدو ترئی کے کھیت اور گاؤں سے کیسے پیدا ہو گئے۔"

یہ خرافات لوگوں کو بالخصوص مولانا صباح الدین عبدالرحمٰنؒ کو اتنی پسند آگئی کہ وہیں مطالبہ کر بیٹھے کہ اسی پر ایک مقالہ لکھ ڈالو۔ خیر مضمون لکھا یا نہیں اس سے بحث نہیں ہے۔ بحث تو یہ ہے کہ:

اُٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون

ابھی کچھ دنوں قبل مولانائے مرحوم کا ایک مضمون بابری مسجد کے متعلق کسی رسالے میں پڑھا۔ ایسا لگا کہ دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ اور مخالف کو ایسے مضبوط منطقی حصار میں مقید کر دیا ہے کہ جائے فرار نہیں، ان کی وہ تحریر ایک طرف رکھئے اور جلسوں جلوسوں اور پارلیامنٹ کی دھواں دھار سینکڑوں تقریروں کو ایک طرف رکھئے اور پھر پوچھئے:

دل بتا تیرا کدھر جانے کو جی چاہے ہے؟

اسے کہتے ہیں دل پر تیر مارنا۔

اقبالؒ کہتے ہیں:

پرانے بادہ کش ایک ایک اُٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقائے دوام لے ساقی

اقبال ایسے بے وقوف تو نہیں کہ پرانے بادہ کشوں کو اُٹھنے سے روکنے کے لیے ساقی سے آبِ بقائے دوام کی درخواست کریں۔ یہ درخواست تحصیل لاحاصل ہے، تو پھر درخواست کے کیا معنی؟ کیا بے معنی؟ یہ تو ممکن

نہیں۔ حضرت مولانا شبلی نعمانیؒ نے انسانیت کی آخری عظیم تحریک اسلام پر صدیوں کی دانستہ اور نادانستہ ڈالی ہوئی تاریخی گرد کو غلط بیانیوں کو مغالطوں کو بدگمانیوں کو کس جلال کس جمال کس حسن اور سلیقہ کیسے اعتماد اور یقین کس مہارت اور صفائی کیسی سرخ روئی اور کامیابی سے صاف کیا، اس کی مثال فارسی، اردو میں نہیں ملتی۔ ان کے بعد حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ نے تاریخ اور سیر کو کیسی بلندی، کیسی معراج عطا کی اور ان کے بعد حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ، کس جگر داری، کس دل دوزی، کس جاں خراشی سے صحت کی ایک ایک بوند، توانائی کا ایک ایک قطرہ، ہمت اور حوصلہ کا ایک ایک ذرّہ، انگشت و قلم کی ایک ایک حرکت، اور زبان و بیان کا ایک ایک ٹکڑا اس عزم، ارادے اور منصوبے کو قائم رکھنے، طاقت و قوت عطا کرنے، صحت اور توانائی بخشنے میں صَرف کر رہے ہیں؟ کون ہے جو پیچھے پیچھے آرہا ہو کہ یہ عَلَم سرنگوں نہ ہونے دیں گے، یہ جھنڈا گرنے نہ دیں گے۔ اسی میدان کے ایک کونے سے ایک سپاہی اور گرا۔ مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن نے منشائے قضا و قدر کے سامنے اپنی تلوار ٹیک دی۔ کون ہے جو کسی گوشہ سے اُٹھے، جام اور آبِ بقائے دوام کے سلسلہ کو باقی رکھے؟

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگن عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

ٹیپو سلطان شہید کی تلوار کوئی نہ اُٹھا سکا۔ ایک کافر دشمن انگریز افسر نے انتظار کیا کہ جان نکلے، جسم سرد ہو تو ہاتھ سے تلوار نکال لوں۔ مُردہ ہاتھ سے ہی سہی کہہ تو سکوں گا کہ تلوار چھینی ہے۔ دیر کے بعد بے حس و حرکت شہید ٹیپو کی طرف بڑھا۔ چاہا بے جان ہاتھ سے تلوار نکال لوں شہید ٹیپو کا مردہ ہاتھ تیزی سے بلند ہوا اور زندہ دشمن کو ختم کر کے نیچے گر گیا۔

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

رونا یہ نہیں ہے کہ مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن نہیں رہے۔ ایسی کارآمد مفید خدمت گزار، خاموش زندگی مرتی نہیں۔ مگر اس زندگی سے رشتہ جوڑنے والا کون ہے، آگے بڑھے۔ شبلی سے صباح الدین تک سلسلہ کی کڑی سے مل جائے۔ بڑی جوکھوں کے بعد روایت بنتی ہے اور بڑے

جی داروں اور سرفروشوں کے کندھوں پر روایت اپنا زندہ سفر قائم رکھتی ہے۔ اب یہ آب بقائے دوام کا پیالہ کون اپنے ہاتھ میں لیتا ہے:

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی

جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

مفہوم لوگ غلط سمجھ رہے ہیں۔ ہر شخص بڑھ کر ہاتھ میں مینا اٹھا رہا ہے، اسی لیے اب نہ وقعت مینا باقی ہے نہ آبروئے مینا بدست۔ یہ نہیں سمجھتے کہ ہر ہاتھ مینا کے لیے موزوں نہیں، مینا اٹھالینا ہی شرط نہیں۔ اٹھانے کا انداز بھی تو ہو، لبوں تک لانے کا طرز بھی ہو تو۔ پینے کا طریقہ بھی تو ہو، اظہار مستی کا سلیقہ بھی تو ہو۔ ظرف بھی تو ہو استعداد بھی تو ہو۔ ہر بوالہوس حسن پرستی شعار کرے تو حسن بھی تقدس کھوتا ہے اور پرستش کا وقار بھی جاتا ہے۔ جو اس وقت ہو رہا ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ایسا اس لیے ہو رہا ہے اور ہوتا ہے کہ شخصیت سازی کے کارخانے تو ہیں مشینیں خراب ہوگئیں اور مشین چلانے والے بے ہنر ہوگئے۔ اب کشمیر میں وہ شال نہیں بنتی اور ڈھاکہ میں وہ ململ نہیں بنتا جو انگوٹھی کے سوراخ سے کھینچ لیا جائے۔ نہ وہ کاریگر رہے نہ کاریگروں کے وہ اوزار رہے۔ کارخانے بہت بڑھ گئے، مشینیں بہت آگئیں، پیداوار بہت زیادہ ہوگئی۔ یونیورسٹیاں، کالج، تعلیم گاہیں، درس گاہیں بہت کھل گئیں۔ تعلیم گاہوں کے سامان واسباب اور ذرائع وسائل تدریس و تعلیم دیکھ کر محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی، چٹائیوں پر، گھاس پر اور زمین پر خاک نشیں جو پڑھ گئے، پڑھا گئے وہ کرسیوں پر، ٹیبل پر، میز پر، ڈیکس پر لوگ نہیں پڑھ سکتے نہیں پڑھا سکتے۔ صفحات سینہ پر لکھی ہوئی حقیقتیں جس سرعت اور سہولت سے دلوں میں منتقل ہو جاتی تھیں زریں اور طلائی جلدوں کے صفحات کے حروف اور الفاظ سینوں میں نہیں اترتے، رگ و پے میں داخل نہیں ہوتے اور اعمال میں منتقل نہیں ہوتے اور وہ اس لیے کہ پڑھنے پڑھانے کا مقصد اور موضوع بدل گیا۔

بس یہیں مجھے قلم روک دینا ہے۔ آگے بات نازک ہے اور

مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم کو دیکھا بھی سنا بھی پڑھا بھی۔ دیکھنے میں جتنے شائستہ، سننے میں اتنے ہی شستہ اور پڑھنے میں اتنے ہی شگفتہ۔ ان کی زندگی اور شخصیت بھی تکلفات سے بے نیاز

اور ان کی تحریر بھی اہتمام سے بے پروا۔ لیکن مفہوم و معانی تاثیر اور ترسیل کی تمام صفات سے آراستہ و پیراستہ، اُن کی تحریر کی ایک نازک خصوصیت جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں یہ بھی تھی کہ وہ کسی موضوع پر لکھ کر دو ٹوک اور فیصلہ کن نتیجہ خود نہیں پیش کرتے بلکہ پڑھنے والے اور سننے والے کی ذہانت اور ذوق پر بھی کچھ بوجھ ڈال دیتے، جیسے غالب کا یہ شعر:

کہاں میخانے کا دروازہ غالب اور کہاں زاہد
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

خیر یہ سب لکھنے اور بتانے تو میں اس وقت بیٹھا نہیں۔ میں تو خود یہ سوچنے اور سوچنے کی دعوت دینے کو بیٹھا کہ ہماری تاریخ، ہمارے علم، ہماری روایت، ہماری تہذیب، ہمارے دینی تحفظ کا لشکر بہت مختصر رہ گیا ہے۔ بے پناہ مخالف طاقتوں کے حملوں کا جی داری سے مقابلہ کرتے ہوئے سینوں پر زخم لیتے ہوئے اس مختصر لشکر کا ایک ایک فرد گرتا جا رہا ہے اور

ایک سپاہی اور گرا

اور جگہ لینے کو بڑھنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ ہم پڑھنے پڑھانے والے کیا سوچ رہے ہیں، کیا ارادے کر رہے ہیں؟ کیا فیصلہ کرنا چاہتے ہیں؟

..... ـــــــ "دل یا شکم"؟

تحریر: امیر شکیب ارسلان
تلخیص و ترجمہ: نذر الحفیظ ندوی

سنوسی اور سنوسیت

[الجزائر کے مشہور عالم و صوفی بزرگ شیخ احمد السنوسی اپنے عصر کے امام وقت اور مرجع عام و خاص تھے، ان کی خانقاہ صرف "شریعت و طریقت" ہی کی جامع نہ تھی بلکہ "جہاد فی سبیل اللہ" اور "انابت الی اللہ" کی تربیت گاہ بھی تھی، ان کے اخلاف نے اطالوی استعمار سے دو بدو جنگ کی اور اس خانقاہ کے مریدین باصفا اس فوج کے سپاہی تھے جو راتیں دعا و مناجات اور ذکر و اوراد میں گزارتے اور دن کو یا تو اسلحہ ساز کارخانوں میں مصروف نظر آتے یا زمین کھودنے اور نہریں نکالنے، بنجر اور شور زمین کو قابلِ زراعت بنانے اور کاشتکاری کرنے میں مشغول ہوتے۔ ان خانقاہوں اور خانقہی مدارس سے فارغ شدہ پیر و بزرگ ایک طرف مسجدوں کے ممبروں پر خطبہ دیتے تو دوسری طرف یہی لوگ میدانِ جنگ میں قائدانہ کردار بھی ادا کرتے۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے "سنت نبوی" کی مکمل اتباع کی تھی، ایسا نہیں ہے کہ صرف وہی عبادات جو شب کی چند ساعتوں کے لیے تھیں دن و رات انہی پر عمل ہوتا رہتا اور دن کے معمولات کو یکسر فراموش یا نظر انداز کر دیا جاتا یا ان کا بدل رسوم و بدعات کو بنا لیا جاتا۔

سنوسی خاندان کے مشائخ اور ان کے مریدوں نے طرابلس (لیبیا) میں اطالوی استعمار کا مقابلہ ۱۱۔۱۹۱۳ء میں بڑی پامردی سے کیا، اور جب تک کہ ترکوں کے مشورہ کے بموجب ادریس بن مہدی نے اٹلی سے جنگ بندی پر مصالحت نہیں کر لی، یہ لوگ میدانِ جنگ میں دشمنوں سے نبرد آزما رہے۔

سنوسیوں کا یہ خاندان سادات حسنی کا خاندان ہے، عرب حسنی سادات کو 'شریف'

کہتے ہیں جس طرح آنحضرتؐ سے نسبی تعلق رکھنے والوں کو ہندوستان میں 'سید' اور حضرموت میں 'حبیب' کہا جاتا ہے۔ ان لوگوں کے نام کے ساتھ 'سیدی' بھی ہوتا ہے جو عظمت واحترام کی ایک علامت ہے، جیسے یہاں کسی کو "حضرت" کہا جاتا ہے، لہذا ان کے مورث کا پورا نام "سیدی احمد شریف سنوسی" لکھا جاتا ہے، عربی میں الف لام کے اضافے سے 'الشریف السنوسی' ہوتا ہے۔

علامہ شکیب ارسلان عربی کے ادیب اور اسلامی علوم کے بڑے فاضل تھے، انھوں نے ایک جرمن مصنف کی کتاب کے عربی ترجمہ 'حاضر العالم الاسلامی' پر حاشیے لکھے ہیں، ان کے اس فٹ نوٹ میں حاشیے نے کتاب کو چار جلدوں کی ضخامت دے دی ہے، شکیب ارسلان کا ہندوستان میں تعارف ندوہ کے ماہنامہ 'الضیاء' سے ہوا تھا جو آج سے ۵۰ سال پہلے نکلا کرتا تھا۔ انھوں نے سیدی احمد السنوسی کا ذکر اور اپنی ملاقات کا حال بڑے ہی شاندار الفاظ میں کیا ہے، ان کی یہ تحریر عربی ادب کا ایک نادر تحفہ بھی ہے، اور معلومات کا خزینہ بھی۔

ادارہ 'ذکر وفکر' کی فرمائش پر مولانا نذر الحفیظ ندوی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء) نے حواشی علامہ شکیب ارسلان سے شیخ سنوسی کے حالات ترجمہ کیے ہیں، امید ہے کہ اس سے ناظرین کو علماء و مشائخ کے ایک نئے طبقہ کا تعارف حاصل ہوگا جو اگر ایک طرف اپنے گفتار و کردار میں سنت کا اطاعت گزار تھا تو دوسری طرف مسجد و دستار کی عزت قائم رکھتے ہوئے بیلچے اور تلوار اٹھانے میں بھی کسی مزدور یا سپاہی سے کم نہیں تھا۔

ناظرین میں سے بہت سے حضرات واقف ہوں گے کہ علامہ اقبالؒ نے طرابلس کی جنگ پر کئی نظمیں کہی تھیں اس میں سے ایک وہ نظم ہے جس میں فاطمہ بنت عبداللہ نامی ایک لڑکی کا ذکر ہے جو میدانِ جنگ میں سپاہیوں کو پانی پلاتے ہوئے شہید ہوئی تھی، جس کو اقبالؒ نے اس طرح مخاطب کیا ہے:

فاطمہ تو آبروئے امتِ مرحوم ہے ذرہ ذرہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے

دوسری وہ نظم ہے جس میں علامہ اقبالؒ اپنے مکاشفہ کا ذکر کرتے ہیں کہ:

فرشتے بزمِ رسالتؐ لے گئے مجھ کو حضورِ آیۂ رحمت میں لے گئے مجھ کو
حضورِ اکرمؐ نے پوچھا کہ،
"ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا"

تو شاعر نے جواب دیا:
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں جو چیز اس میں ہے جنّت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں
اور یہ سنوسی بزرگ وہی ہیں جن کے بارے میں حکیم مشرق علامہ اقبال کا شعر ہے:
کیا خوب امیر فیصلؒ[1] کو سنوسی نے یہ پیغام دیا
تو نام و نسب کا حجازی ہے پر دل کا حجازی بن نہ سکا

(ادارہ)

اسلامی دنیا نے تیرہویں صدی ہجری میں جن ممتاز اور نادرۂ روزگار شخصیتوں کو جنم دیا ان میں سنوسی طریقہ کے بانی اور مؤسس سیدی محمد بن علی سنوسی خطابی کی شخصیت عالمگیر شہرت کی حامل کہی جاتی ہے الجزائر کے مشہور شہر مستغانم اور وہاں کے ممتاز قبیلہ مجاہر سے ان کا تعلق تھا، ویسے نسبی اور خاندانی لحاظ سے سیدنا علی بن ابی طالب اور حضرت فاطمۃ الزہرا سے ان کا تعلق ہے، قبیلۂ مجاہر کے افراد کی تعداد ستّر ہزار کہی جاتی ہے۔

جہاں تک سنوسی طریقہ کا تعلق ہے تو اس میں سنت و شریعت پر بغیر کسی شرط و قید اور ادنیٰ کوتاہی کے عمل کرنا لازمی ہے، سنوسیوں کی گرفت شمالی اور مغربی افریقہ پر اتنی غیر معمولی اور مضبوط اور اثرات اتنے گہرے ہیں کہ فرانسیسی حکومت ہر وقت چوکنا رہتی، اس نے سنوسیوں پر پابندی عائد کر رکھی تھی کہ اپنے طریقہ کی اشاعت نہیں کر سکتے۔

سنوسی طریقہ کے بانی و مؤسس سیدی محمد بن علی سنوسی ایک عالم با عمل اور صاحب بصیرت انسان

---

[1] امیر فیصل بن حسین بن علی شریف مکہ۔

تھے الجزائر پر جب فرانسیسی استعمار کا غلبہ ہو گیا تو سنوسی نے اپنا ملک چھوڑ کر مختلف عرب ممالک کی سیاحت کرتے ہوئے حجاز کا رُخ کیا، حج و زیارت کے دَوران اسلامی دنیا اور خود حجاز کے بڑے ممتاز علما اور داعیوں سے ان کی ملاقات ہوئی۔ جن علماء و صلحاء سے سنوسی کی ملاقات ہوئی ان میں لیبیا کے شیخ ادریس کے والد بھی تھے۔ شیخ سنوسی نے ان کی گفتگو سے اندازہ لگایا کہ طرابلس (لیبیا) ان کی دعوتی جدوجہد اور دینی و تربیتی کام کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ چنانچہ دو ممتاز عالموں شیخ ابوالقاسم عیساوی اور عبدالعزیز عیساوی کے مشورے اور تعاون سے شیخ سنوسی نے لیبیا کو اپنی دینی دعوت و تبلیغ اور تربیت کا مرکز بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے برقہ، واحۃ الکفرہ اور جُغبوب جیسے مرکزی علاقوں کا انتخاب کیا، جہاں کے لوگوں نے سنوسی طریقہ کی بھرپور حمایت اور اس کی پُرجوش تائید کی، اس کے نتیجہ میں ان علاقوں نے خاص طور سے پورے افریقہ کو بڑے پرجوش اور مخلص مجاہدین اور داعی مہیا کیے۔

محمد بن علی سنوسی نے لیبیا کے مرکزی شہر بن غازی سے لے کر مصر کے ساحلی شہر اسکندریہ تک سنوسی خانقاہوں کا جال سا بچھا دیا، جو علاقے بے آب و گیاہ اور ویران تھے، اور جہاں چوروں اور ڈاکوؤں کی حکمرانی تھی ان علاقوں کو سنوسیوں نے آباد کر کے سرسبز و شاداب بنا دیا، اور وہ امن و امان کا گہوارہ ہی نہیں رشد و ہدایت کا مرکز بھی بن گئے، مثال کے طور پر ہم "جغبوب" اور "سیرنا" نامی ویران اور بے آب و گیاہ بستیوں کا نام لے سکتے ہیں، ان میں جغبوب کا علاقہ انتہائی ویران، چوروں اور اُچکوں کا مرکز تھا، وہاں کی مٹی بھی پُرشور اور نمکین تھی، کسی قافلے کا دن دھاڑے گزرنا بھی ناممکن تھا۔ اس علاقہ کو سیدی محمد بن علی سنوسی نے اپنی خانقاہ کے لیے جب منتخب کیا تو نہ صرف وہ رُشد و ہدایت اور ذکر و اذکار کا مرکز بن گیا بلکہ درس و تدریس اور جہاد کی تیّاری کی سب سے بڑی تربیت گاہ اور مختلف پھلوں اور زرعی پیداوار کا مرکز بن گیا۔ اسی طرح "شحات" مقام سے قریب جبل اخضر کے پاس "سیرنا" نامی ویران بستی تھی، جہاں قدیم یونانی عہد کے آثار پائے جاتے تھے، سنوسیوں نے اس علاقہ کو ایسا آباد اور معمور کر دیا کہ یہ بستی ایک بارونق شہر میں تبدیل ہو گئی، اپنی دل کش آب و ہوا اور دلچسپ مناظر نیز شیریں چشموں اور رنگا رنگ پھولوں پھلوں کے لیے بھی مشہور ہو گیا۔ شیخ محمد بن علی نے شحات مقام سے قریب ایک دوسرے علاقہ میں اپنی خانقاہ بسائی، اس علاقہ کو انھوں نے پھلوں کے باغات اور انواع و اقسام کے درختوں سے گھیر دیا۔ ان باغات میں طالب علموں کے قیام کے لیے دارالاقامے، پڑھنے کے لیے مدارس اور نماز

کے لیے مساجد تعمیر کیے گئے۔

محمد بن علی سنوسی نے اپنے بعد جانشینی کے لیے اپنے لڑکے مہدی کا انتخاب کیا اور پیشین گوئی کی کہ مستقبل میں اللہ تعالیٰ ان سے عظیم کام لے گا، بعد میں یہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی اور انھوں نے اپنے نامور والد سیدی محمد بن علی سنوسی کے ادھورے کاموں کی تکمیل کی، پورے شمالی و مغربی افریقہ میں انھوں نے اپنے مریدوں کو پھیلا دیا، ان کی قوت، شوکت اور رعب و دبدبہ سے استعماری طاقتیں کانپتی تھیں، اُس وقت کی سب سے بڑی منظم حکومتوں برطانیہ اور جرمنی نے اپنے سفراء کے ذریعہ بارہا تحفے تحائف بھیج کر سنوسیوں کو خوش کر کے اپنے حق میں ہموار کرنے کی کوشش کی لیکن انھیں کامیابی نہ ہوسکی، ترک خلیفہ سلطان عبدالحمید کو بھی استعماری طاقتوں نے سنوسیوں کی طرف سے خوفزدہ اور مرعوب کر دیا تھا اور یہ باور کرا دیا تھا کہ سنوسی خلافت اسلامیہ کا اعلان کرنے والے ہیں، اس سے سلطان عبدالحمید کو غلط فہمی اور سنوسیوں کی طرف سے بدگمانی ہوگئی، اس بات کی یقین دہانی کے لیے سلطان نے سنوسیوں کے مراکز اور خود سنوسیوں کی فوجی اور سیاسی طاقت کا اندازہ لگانا چاہا، اس مقصد سے اس نے جغبوب کو ایک وفد روانہ کیا جس میں میرے عزیز دوست اور سلطان عبدالحمید کے مشیر خاص صادق بک مرحوم بھی تھے، مجھ سے بعد میں مرحوم دوست نے بتایا کہ شیخ سنوسی محض ایک داعی اور مرشد و رہنما تھے وہ ہمیشہ عثمانی حکومت کی نہ صرف تائید و حمایت کرتے بلکہ لوگوں کو بھی اس اسلامی خلافت کے احترام اور اس کے بقا کے لیے دعا کرنے کی ترغیب دیتے رہتے تھے۔

محمد بن علی سنوسی کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادہ اور جانشین سیدی مہدی جغبوب جیسے مرکزی مقام کو چھوڑ اندرونی صحرائی علاقہ واحۃ الکفرۃ چلے گئے، جو بنغازی شہر سے آٹھ دن کی مسافت پر ہے۔

بعض حضرات نے جغبوب جیسے مرکز کو ترک کر کے واحۃ الکفرۃ جیسے بے آب و گیاہ اور ویران صحرائی علاقہ کو مرکز بنانے کی مختلف تاویلیں اور وجوہات بیان کی ہیں، بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ چونکہ جغبوب ایک اسلامی مرکز میں تبدیل ہوچکا تھا اور اس نے باقاعدہ ایک بارونق اور آباد شہر کی صورت اختیار کر لی تھی اس لیے آبادی سے دور ایک ایسے علاقے کا انتخاب کیا گیا جس کو از سر نو آباد کیا جائے، اس طرح صحرائی علاقوں کی آہستہ آہستہ آباد کاری کی جائے، دوسری توجیہ بعض حضرات نے

یہ بھی کی ہے کہ جب مصر پر انگریزوں کے قدم جم گئے تو شیخ سنوسی پر ایک وحشت سی چھا گئی اس لیے انھوں نے جغبوب جیسے مرکزی شہر سے دور رہ کر اندرونی صحرائی علاقہ میں بسنے اور فوجی چھاؤنی و مرکز تعمیر کرنے کو اپنا نصب العین قرار دے دیا۔ لیکن ایک تیسری وجہ بھی لوگ یہ بیان کرتے ہیں کہ شیخ محمد بن علی سنوسی نے بہت پہلے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ اٹلی کے ساتھ لیبیا کی جنگ ہوگی، اس صورت میں لیبیا کے مرکزی شہر برقہ، جغبوب اور طرابلس اٹلی کی فوجی یورش کا نشانہ بنیں گے۔ ان باتوں کے پیش نظر سنوسی نے اپنے مریدوں کی دینی تعلیم و تربیت کے ساتھ خدا کی راہ میں جہاد کی تیاری اور مشق بھی شروع کرادی تھی، آخرکار وہی ہوا جس کا اندیشہ ظاہر کیا گیا تھا، یعنی ۱۹۱۱ء میں اٹلی سے جنگ کا آغاز ہو گیا۔

سنوسیوں کے پاس اٹلی کی فوجوں کی طرح نہ تو جدید فوجی ساز و سامان تھے اور نہ ہی دفاعی ہتھیاروں سے وہ مسلح تھے، اگر وہ کسی چیز سے مسلح تھے تو وہ ایمان کی تلوار تھی اور کتاب و سنت پر عمل اور اسلاف کرام کا مکمل اتباع، یہی ان کا کل سرمایہ تھا۔ اس لیے انھوں نے بحر متوسط اور سوڈان کے درمیانی علاقہ کا انتخاب کیا تاکہ استعماری طاقتوں کی نگاہوں اور تعاقب و سازش سے دور رہیں، یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ بعض ترک افسران سنوسیوں کو تنگ کرنے کے لیے گویا مقرر کر دیے گئے تھے، مختلف بہانوں سے سنوسی خانقاہوں کی تلاشی لی جاتی، اسلحہ کی ذخیرہ اندوزی کا ان پر شبہ کیا جاتا، یہ افواہ بھی اڑائی گئی کہ سنوسی اپنی الگ فوج تیار کر رہے ہیں تاکہ سلطان عبدالحمید کے بجائے ان کی خلافت کا اعلان کر دیا جائے۔ اس بنا پر سنوسیوں نے جغبوب کا علاقہ چھوڑ کر صحرا کی راہ لی۔ پھر واحۃ الکفرہ ایسا مرکزی مقام تھا جہاں سے سوڈان اور وسطی افریقہ کے اندرونی علاقوں تک اپنی دعوت کا پھیلانا سنوسیوں کے لیے آسان تھا۔

واحۃ الکفرہ ایک بے آب و گیاہ علاقہ تھا، لیکن سنوسیوں کی آمد کے بعد سے وہ ایک طاقتور فوجی چھاؤنی کے علاوہ ایک ایسے بڑے بارونق شہر میں تبدیل ہو گیا جہاں سینکڑوں قسم کے پھل دار درخت لگائے گئے تھے۔ بنجر زمینوں کو کاشت کے قابل بنا دیا گیا کہ بڑی مقدار میں یہاں مختلف قسم کے غلے پیدا ہونے لگے، جس سے نہ صرف واحۃ الکفرہ کی آبادی کی ضروریات پوری ہوتیں بلکہ دوسرے شہروں کو بھی یہاں سے غلے اور پھل روانہ کیے جاتے تھے، دوسری طرف خانقاہوں کے ساتھ مساجد، مدارس، دار الاقامے لوگوں کی رہائش کے لیے پختہ مکانات بڑی منصوبہ بندی سے تعمیر کیے گئے۔ واحۃ الکفرہ کے علاوہ "واحۃ الوجنات"، "واحۃ ودن"، "واحۃ قرو" اور وادی عین کو سرسبز و شاداب بنا دیا گیا اور اس طرح ان کی قلعہ بندی کی گئی کہ وہ

فوجی چھاؤنی کی حیثیت اختیار کر گئے، اس بنا پر برطانوی استعمار کو یہ اندیشہ ہونے لگا کہ مصر و سوڈان کے سرحدی حدود پر سنوسی ان پر حملہ آور ہو سکتے ہیں، اسی طرح فرانسیسیوں کو یہ خدشہ ہونے لگا کہ وادی کی سمت سے سنوسی شمالی و مغربی افریقہ کی فرنچ مقبوضات پر یورش کر سکتے ہیں، تیسری طرف اٹلی سنوسیوں کی طاقت سے مرعوب ہو کر ان سے قریب تر آنے کی کوشش کر رہا تھا، اسی کے ساتھ طرابلس پر بھی اس کی نگاہیں جمی ہوئی تھیں، مغربی استعمار کے علاوہ سلطان عبدالحمید کو الگ یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ آخر اندرونی صحرا میں سنوسیوں کے جانے کا مقصد کیا ہے، اسی مقصد اور سنوسیوں کے عزائم معلوم کرنے کے لیے سلطان نے دوسری بار صادق بک کی سربراہی میں ایک اور وفد بھیجا۔ شیخ سنوسی نے جواب دیا کہ ان کا مقصد صرف اسلام کی تبلیغ و اشاعت ہے، اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ سنوسی نے سلطان عبدالحمید کی دعوت پر ترکی جانے سے معذرت کر دی۔ اسی حال میں سیدی مہدی سنوسی بیس سال تک اپنی دعوتی اور تربیتی مہم میں مشغول رہے، یہاں تک کہ ان کا انتقال ہو گیا، اُن کے جانشین ان کے بھتیجے سیدی احمد الشریف سنوسی ہوئے، جنھوں نے طرابلس کی جنگ میں عالمی شہرت حاصل کی، یہ واقعہ بھی ہے کہ اگر سیدی احمد الشریف سنوسی کا وجود نہ ہوتا تو طرابلس کا دفاع ممکن نہ تھا، اس کے بعد بھی سنوسی کا جہاد اٹلی کے خلاف جاری رہا، یہاں تک کہ پورے لیبیا پر اس نے فوجی یورش کر دی، اس کے بعد ہی برطانیہ اور اٹلی دونوں سیدی احمد الشریف سنوسی کے چچازاد بھائی سیدی ادریس بن سیدی مہدی کے ساتھ جنگ بندی کے مسئلہ پر گفتگو کرنے پر آمادہ ہو گئے، ان دونوں ملکوں نے سیدی ادریس کو اس بات پر راضی کر لیا کہ سنوسیوں کی حکومت برقہ کے حدود تک رہے گی اور اٹلی کا قبضہ بنغازی اور درنہ پر رہے گا، اس کے علاوہ بعض ساحلی علاقوں پر بھی اس کا کنٹرول رہے گا، جب سیدی احمدی الشریف سنوسی نے یہ صورت حال دیکھی تو انھوں نے خاندانی اختلاف اور انتشار سے بچنے کے لیے اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا اور خاموشی سے میدان جنگ سے اپنے کو اس طرح الگ کر لیا کہ ترک وزیر جنگ انور پاشا کو ۱۹۱۵ء میں ایک خط لکھا کہ ایک آب دوز کشتی بھیج دیں جو انھیں آکر ترکی لے جائے۔ چنانچہ اپنے رفقاء کے ساتھ اس آبدوز کشتی پر قسطنطنیہ پہنچ گئے، جہاں ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔

سلطان محمد وحید الدین نے سیدی احمد الشریف کی آمد کو غیر معمولی اہمیت دی، حسن اتفاق یہ پیش آیا کہ جس دن سیدی احمد الشریف ترکی پہنچے وہی دن آل عثمان کے تخت نشینی کی تاریخ بھی تھی، یہ جشن ملک گیر

پیمانے پر منایا جاتا ہے، خصوصاً تخت نشینی کی تقریب مشہور صحابی میزبانِ رسول حضرت ابوایوب انصاری کے نام نامی سے منسوب جامع ابوایوب میں انجام دی جاتی ہے۔ سلطان نے سیدی احمد الشریف کی اس آمد کو غنیمت سمجھتے ہوئے ان سے یہ درخواست کی کہ تلوار حمائل کرنے کا فریضہ ان کے ذریعہ انجام پائے تو انھیں مسرّت ہوگی۔ اس شاہانہ اور باوقار تقریب میں سیدی احمد الشریف شریک ہوئے اور انھوں نے بہ نفس نفیس سلطان کو تلوار عطا کی۔

سیدی احمد الشریف عرصہ تک ترکی شہر بروصہ میں مقیم رہے، پھر جب یونانیوں کا اس پر قبضہ ہوگیا تو وہاں سے قونیہ چلے گئے۔

میں عرصہ سے سیدی احمد الشریف سنوسی کے متعلق سُن رہا تھا، اس کے بعد حالات ایسے پیش آئے کہ میرے اور ان کے درمیان مراسلات کا تعلق قائم ہوگیا، اس سے ملاقات کا اشتیاق اور بھی بڑھ گیا۔ تقدیر کی خوبی دیکھئے کہ اچانک سیدی احمد الشریف بلا سان وگمان ترکی تشریف لے آئے۔ میں اس زمانہ میں عثمانیوں اور ترکوں کے درمیان اتحاد قائم کرنے کی مہم پر جرمنی گیا ہوا تھا۔ ابھی برلن میں میری مہم پورے طور پر پایۂ تکمیل کو بھی نہیں پہنچی تھی کہ بلغاریہ نے جنگ روکنے کی درخواست پیش کردی، اس سے جرمنی اور اس کے حلیفوں کے درمیان سراسیمگی پھیل گئی، انور پاشا نے مجھے ترکی سفارت خانہ کے ذریعہ چند اشارتی الفاظ میں پیغام بھیج کر جلد از جلد ترکی پہنچنے کی ہدایت کی۔ چنانچہ جب ہم ترکی پہنچ گئے تو سیدی احمد الشریف سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات اور بعد کی نشستوں میں انھوں نے تفصیل سے اپنے حالات بتائے، ان کی مفصّل گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ :

ترک وزیر جنگ انور پاشا نے اپنے بھائی نوری کو پہلی جنگ عظیم کے دوران طرابلس الغرب کا سپہ سالار بنا کر بھیجا تھا۔ ان کے ساتھ بعض چوٹی کے کمانڈر اور فوجی جنرل بھی تھے۔ اسلحہ کا ذخیرہ بھی وافر مقدار میں ان کے ساتھ تھا۔ انور پاشا نے اپنے بھائی نوری سے چلتے وقت یہ کہا کہ سنوسیوں کو اس بات پر تیار کر لینا کہ وہ اٹلی سے صلح اور انگریزوں سے جنگ کریں، جب کہ سیدی احمد الشریف کا خیال اس کے برعکس تھا، یعنی وہ انگریزوں سے صلح اور اٹلی سے جنگ کرنا چاہتے تھے۔

نوری نے لیبیا پہنچتے ہی اپنا کام شروع کردیا، لیکن سنوسی اپنے عزم وارادے پر اٹل رہے،

یہاں تک کہ دونوں کے درمیان اختلافات کی نوبت آگئی۔ انور پاشا نے انگریزوں کے خلاف تصادم کی جو پالیسی اختیار کی تھی اور اس کی وہ تلقین سنوسیوں کو کر رہے تھے، اس میں جرمنوں کی یہ حکمت عملی کام کر رہی تھی کہ اس طرح انگریزوں کو زیادہ سے زیادہ نقصان ہوگا، ان کی فوج کا بڑا حصہ سنوسیوں سے اُلجھ جائے گا اور جرمنوں پر سے انگریزوں کا دباؤ کم ہو جائے گا۔

اس کے برعکس سنوسیوں کا خیال تھا کہ مصر پر حملہ کرنے کے بجائے اس قوت سے وہ اٹلی سے جنگ کریں، ان کو پورا اندیشہ تھا کہ مصر پر قبضہ کی صورت میں ان کو ناکامی سے دوچار ہونا پڑے گا، اس لیے کہ انگریزوں کی فوجی طاقت بڑھی ہوئی تھی اور وہ اس سے خوب واقف تھے جب ان کا حملہ ناکام ہو جائے گا تو عربوں کے حوصلے انگریزوں کے خلاف پست ہو جائیں گے اور ان کی امیدوں پر پانی پھر جائے گا۔

تیسری بات یہ تھی کہ انگریزوں پر قبضہ کی صورت میں جبل اخضر (لیبیا) اور مصر کے درمیان راستہ بند ہو جائے گا، غذا کی رسد چونکہ اس راستے سے ہوتی ہے۔ اس صورت میں عرب بھوکوں مر جائیں گے۔

اِدھر حال یہ تھا کہ برطانوی جنرل مگزول سیدی احمد الشریف سنوسی سے دوستی پیدا کرنا چاہتا تھا۔ اکثر وہ تحفے تحائف کے علاوہ سنوسی کی پسند کی کتابیں بھیجا کرتا، وہ اس طرح ہر ممکن وسائل اختیار کر کے سنوسیوں کو راضی رکھنا چاہتا تھا، اس مقصد سے اس نے سنوسیوں کی فوجی وردی مصر میں تیار کروائی تھی، دونوں فریق باہمی تصادم سے گریز کرنے کا ہر ممکن طریقہ اختیار کر رہے تھے اور اس میں اپنی عافیت سمجھتے تھے۔ سنوسی کے بعض فوجی افسران ترک کمانڈر نوری کے اخراج پر زور دے رہے تھے، سیدی احمد الشریف اس اخراج کو پسند نہیں کرتے تھے، دوسری طرف انور پاشا اپنے بھائی نوری پر برابر زور ڈال رہے تھے کہ انگریزوں سے چھیڑ چھاڑ کی جائے اور انگریزوں اور سنوسیوں کے درمیان بندوق کی نبلی دبا دی جائے۔ ادھر انور پاشا سنوسی کو اپنے خطوط میں اس بات پر تیار کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ انگریزوں سے دو دو ہاتھ کر لیے جائیں، یہ موقع غنیمت ہے۔ ان کے ساتھ کسی طرح کی ڈھیل یا نرمی مناسب نہیں۔ جب سنوسی نے اس پر بھی قدم نہیں اُٹھایا تو نوری نے براہ راست بغیر مشورہ کے انگریزوں سے چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ شروع کر دیا جب

بڑی ناعاقبت اندیشی یہ ہوئی کہ نوری اور اس کے ہمنوا ساتھیوں نے ان تجارتی جہازوں پر فائرنگ شروع کر دی جو مصر سے سلّوم تجارتی اور غذائی اشیا لایا کرتے تھے۔ سنوسی کو جب اس کا علم ہوا تو انھیں بڑا غصّہ آیا، انھوں نے اس چھیڑ چھاڑ کے انجام بد سے نوری کو متنبہ بھی کیا، لیکن نوری نے اس کی کوئی پروا نہیں کی، بلکہ اس نے اپنے بھائی انور پاشا کو خط لکھا کہ سنوسی انگریزوں کے دشمن نہیں بلکہ در پردہ ان کی حمایت کرتے ہیں، اس کے علاوہ نوری کے کارندے مصر جا کر سنوسیوں کے خلاف عوام میں زبردست پروپیگنڈہ کرنے لگے۔

اس عوامی افواہ کے نتیجہ میں مصر سے سنوسیوں کے پاس عتاب نامے آنے لگے۔ سیدی احمد الشریف نے اس صورت حال کو دیکھ کر نوری کو طلب کیا اور کہا کہ میں اب اس جنگ کے لیے تیار ہوں، اگر حملہ ناکام رہا تو ذمے دار میں نہیں تم ہو گے، چنانچہ جو اندیشہ انھوں نے ظاہر کیا تھا وہی ہوا، خوں ریز تصادم کے بعد نوری اور سنوسی کی فوج کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ نوری انگریزوں کے ہاتھ گرفتاری سے بچ نکلے، خود سنوسی اپنی فوج کو لے کر برِّ تونس کی طرف نکل گئے، انگریزوں نے چاہا کہ تیرہ ہزار فوجیوں کے ذریعہ اس مٹھی بھر جماعت کو پیس کر رکھ دیں لیکن انھیں شدید ناکامیوں سے دوچار ہونا پڑا، سخت جانی اور مالی نقصانات سے گھبرا کر انگریز فوج پیچھے ہٹ گئی، خود سنوسی اپنی فوج کے ساتھ سلّوم چلے گئے۔ انگریزوں نے وہاں بھی حملہ کر کے سنوسیوں کو پسپا کرنا چاہا مگر ناکام رہے۔ آخر میں مایوس ہو کر انھوں نے سیدی احمد الشریف کے چچازاد بھائی کے ساتھ صلح کی گفتگو شروع کر دی۔

(جاری)

قصیدہ بردہ

(۴)

وَکَیۡفَ یُدۡرِکُ فِی الدُّنۡیَا حَقِیۡقَتَهُ　　قَوۡمٌ نِیَامٌ تَسَلَّوۡا عَنۡهُ بِالۡحُلُمِ

(وہ خوابیدہ افراد آپؐ کی حقیقت کا کہاں ادراک کر سکتے ہیں جو صرف خواب میں آپؐ کو دیکھ کر تسلی حاصل کر لیتے ہیں)۔

یہ شعر دراصل ماقبل شعر کی تائید کرتا ہے، کَیۡفَ یُدۡرِکُ قَوۡمٌ نیامٌ خوابیدہ لوگ کہاں ادراک کر سکتے ہیں؟ استفہام انکاری ہے، یعنی دنیا کے رہنے والے آپ کی حقیقت کا مرتبہ پہچان ہی نہیں سکتے، صرف خواب میں دیکھ کر دل کو تسلّی دے سکتے ہیں۔

اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ آپ کے عند اللہ درجات کا ادراک اور آپ کے مقام عالی کی معرفت اس دنیا میں ناممکن ہے وہ تو قیامت کے روز ہی معلوم ہوگی، کیونکہ اوّلاً دنیا بذات خود غفلت اور نیند میں مبتلا ہے، حدیث شریف میں ہے:

الناس نیام فاذا ماتوا انتبھوا

(لوگ سب نیند میں ہیں، جب مریں گے تو ہوش میں آجائیں گے)

لہذا اس شعر میں قوم سے مراد ساری دنیا کے لوگ ہیں، خواب میں دیکھ کر تسلی پا جاتے ہیں، خواب میں دیکھنے کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ واقعی کسی کو یہ سعادت حاصل ہو کہ خواب میں آپؐ کا دیدار اس کو نصیب ہو، حدیث شریف میں آیا ہے کہ جس نے مجھے خواب میں بھی دیکھا اس نے مجھ ہی کو دیکھا۔ (من رآنی فقد رآنی حقًا)، اور ایک دوسری حدیث میں ہے کہ خواب میں جس نے آپؐ کو دیکھا اس نے واقعی آپؐ ہی کو دیکھ لیا کیونکہ شیطان

آپؐ کی شبیہ اختیار نہیں کر سکتا، اس سلسلہ میں بعض علماء کا رجحان یہ ہے کہ جس نے آپؐ کو اس ہیئت اور شبیہ میں دیکھا جو آپؐ کی تھی تو اس نے بے شک آپؐ کو دیکھا، مگر جس نے کسی دوسری ہیئت میں دیکھا وہ خواب معتبر نہیں ہے، مزید یہ کہ خواب ایک مومن محب صادق کا خواب معتبر ہے، کفار و مشرکین اور معاندین اگر دعویٰ کریں تو وہ ان کے تصورات کا پرتو ہوگا اور ان کے معاندانہ اوہام کی تصویر ہوگی۔ اس شعر کی تشریح میں اگر زیادہ گہرے جائیے تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ کے دنیاوی وجود کو دیکھنے والے بھی اس حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے خاص کر رکھا ہے، جہاں کسی نبی مرسل یا ولی مقرب کی رسائی نہیں ہے، اور انھوں نے اگرچہ آپ کو دیکھا مگر آپؐ کے اصلی مرتبہ کو نہیں جان سکے جس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے جس نے ان کو یہ مرتبہ بخشا ہے، اور ان کا دیکھنا بھی ایسا ہے جیسے کوئی خواب دیکھے ؛

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

فَمَبْلَغُ الْعِلْمِ فِيْهِ أَنَّهُ بَشَرٌ ۔۔۔ وَأَنَّهُ خَيْرُ خَلْقِ اللّٰهِ كُلِّهِمِ

(آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں انتہائی معلومات یہ ہیں کہ آپؐ بشر ہیں، اور یہ کہ آپ اللہ کی کل مخلوقات سے بہتر ہیں)

آپؐ کا بشر ہونا ذات اور شخصیت کی بناء پر ہے اور تمام انسانوں میں اعلیٰ اور افضل ہونا باعتبار صفت کے ہے، انسان کو جو علم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اس کی رو سے اس کے فہم کی پرواز جہاں تک جا سکتی ہے اس کے مطابق آپؐ کی اصل یہی ہے کہ آپؐ بشر ہیں، اور قرآن کریم میں آپ کا بشر ہونا بار بار واضح کیا گیا ہے، اور آپؐ سے پہلے جتنے انبیاء گزرے ہیں ان کی قرآن نے محاکات یہی کی ہے کہ انھوں نے اعلان کیا کہ میں تم ہی جیسا ایک انسان ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی بے شک ایک بشر ہی تھے اور اللہ کے بندہ اور رسول برحق تھے، اگر بشر سے ماسوا ہوتے تو کمالِ خُلق اور معجزانہ سیرت کوئی تعجب کی بات نہ ہوتی۔ دوسرے یہ کہ آپؐ پھر انسانوں کے لیے اسوہ اور نمونہ نہیں بن سکتے تھے، لوگ کہتے کہ یہ اخلاق و عادات تو اس ذات کے ہیں جو بشریت سے ماسوا ہے اور ہم بشر ہیں کس طرح آپؐ کو نمونہ بنا سکتے ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے تمام انبیائے کرام کو انسانوں میں پیدا کیا، ان کی پیدائش، دنیا سے وفات، مرض کی تکلیف، فاقہ کی مشقت، نکاح کی ضرورت، رزق میں تنگی اور وسعت، سب اسی طرح آپؐ پر بھی گزاری گئی جو بشریت کا لازمہ ہے، اگر فرشتے نازل کیے جاتے تو ہم کہہ سکتے تھے کہ ان کو تو اللہ تعالیٰ نے بشری ضروریات سے بلند اور

پاک رکھا ہے بھلا وہ کیا ہمارے درد دکھ کو جانیں، لہٰذا ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم بھی بشر ہی تھے اور اس لباس بشریت میں رہ کر آپؐ نے ایسا اعلیٰ وارفع نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا جو کوئی دوسرا نہیں پیش کر سکا اور اللہ کا بندہ ہونا آپؐ کی شان کے مطابق ہے اور ایک بڑی مدح بھی ہے، کیونکہ حق عبدیت آپؐ نے ادا کیا، رسالت کی امانت انسانوں تک پہنچا دی، شیخ بوصیریؒ اپنے ایک شعر میں پہلے کہہ چکے ہیں کہ تم اپنے نبی برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح و نعت ضرور کرو مگر اعتدال پر قائم رہو، ان کو عیسائیوں کی طرح خدا کا بیٹا نہ کہنا، یعنی ماورائے بشریت ان کے لیے درجہ نہ تجویز کرنا۔ اس شعر سے وہم ہوتا ہے کہ وہ اس سے متعارض بات کہنا چاہتے ہیں کہ لوگوں کا علم تو بس اسی قدر ہے کہ آپ بشر ہیں اور تمام انسانوں سے افضل ہیں، مگر ... ؛ یہ جملہ بتا رہا ہے کہ وہ کچھ اور درجہ تجویز کرنا چاہتے ہیں لیکن واقعہ یہ نہیں ہے۔ وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ انسانی مبلغ علم یہی ہے کہ آپؐ بشر اور تمام مخلوقات سے افضل ہیں، اب اس کے بعد جو آپ کے درجات عند اللہ ہیں وہ ہم نہیں جان سکتے اور نہ ہم اس کا احاطہ کر سکتے ہیں، وہ صرف اللہ تعالیٰ کے علم ہے۔

وَكُلُّ آيٍ أَتَى الرُّسُلُ الْكِرَامُ بِهَا ۞ فَإِنَّمَا اتَّصَلَتْ مِنْ نُوْرِهٖ بِهِمِ

فَإِنَّهٗ شَمْسُ فَضْلٍ هُمْ كَوَاكِبُهَا ۞ يُظْهِرْنَ أَنْوَارَهَا لِلنَّاسِ فِي الظُّلَمِ

(تمام انبیائے کرام جو بھی معجزات لائے وہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نور سے ان تک پہونچے ــــ کیونکہ آپؐ فضل و کمال کے آفتاب ہیں، اور انبیاء اس کے کواکب ہیں جو اپنی روشنی انسانوں کو تاریکیوں میں دکھلاتے رہے)۔

مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ کو سراپا نور بنا کر بھیجا، اور نور (روشنی) کے جتنے ذرائع ہیں ان میں آپؐ کی حیثیت ایک آفتاب کی ہے۔ ان دو شعروں میں حضرت بوصیری یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آفتاب بھی ایک جرم ہے، ستارے بھی اجرام سماوی ہیں، مگر دونوں میں فرق ظاہر ہے، اسی طرح آپؐ بھی بشر ہیں، اور تمام انبیائے کرام بھی بشر ہیں، اور سارے انسان بشر ہیں، لیکن جس طرح اللہ تعالیٰ نے آفتاب کو تمام اجرام سماوی پر فوقیت دی ہے اسی طرح تمام انسانوں میں آپؐ کو ممتاز بشر بنا کر بھیجا۔ اس کو یوں سمجھئے کہ ایک دیا بھی روشنی کا آلہ ہے، قندیل بھی روشنی کا ذریعہ ہے، تارے بھی روشنی پہنچاتے ہیں اور آفتاب بھی روشنی پہنچاتا ہے، لہٰذا یہ تو سب کہہ سکتے ہیں کہ مٹی کا دیا جو تیل سے جلتا ہے اور آفتاب جو دنیا کو روشن کرتا ہے، دونوں روشنی پہنچانے کے ذرائع ہیں اور اس صفت میں یکساں ہیں۔ لیکن جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔

دوسری بات جو شارح الباجوری نے لکھی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو نور کامل بنایا، اور آپؐ سے پہلے جتنے انبیائے کرام گزرے ہیں سب کو اس آفتاب ہدایت سے مربوط رکھا ہے، اور انبیائے سابقین جو معجزات لائے وہ سب کے سب آپؐ کے نور کا پرتو تھے۔ دوسرے شعر میں تاریکیوں 'ظُلَم' کا لفظ آیا ہے، اس کا مطلب کفر ہے، یعنی کفر کی اندھیاریوں میں انبیائے کرام جو ہدایت کی روشنی لے کر آئے، وہ تمام روشن کرنے والی ہدایتیں ایسی تھیں جیسے آفتاب کے مقابلہ میں تاروں کی روشنی ہو۔

أَكْرِمْ بِخَلْقِ نَبِيٍّ زَانَهُ خُلُقٌ ۔۔۔ بِالْحُسْنِ مُشْتَمِلٍ بِالْبِشْرِ مُتَّسِمِ

(کیا عظمت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جمال ظاہری کی جس کو آپ کے اخلاق نے چار چاند لگا دیے، سارا حسن آپؐ کی ذات گرامی میں جمع ہے اور آپؐ کی خندہ پیشانی آپؐ کے جمال جہاں آرا کا جزء ہے، یعنی ہمیشہ آپؐ کو بشاش و خندہ دیکھا گیا)۔

یہ مضمون پہلے بھی ایک شعر میں گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم کو ظاہری جمال بھی کمال کا عطا فرمایا تھا، اور حسن اخلاق میں بھی آپؐ کو بے مثال بنایا ہے۔ اس شعر میں آپؐ کے جمال ظاہری کی مزید ایک صفت بتا رہے ہیں کہ آپ ہمیشہ خندہ پیشانی سے ملا کرتے تھے اور چہرۂ مبارک ہمیشہ ہشاش و بشاش رہتا تھا، عربی داں حضرات جانتے ہیں کہ أَكْرِمْ فعل تعجب کہا جاتا ہے جو کسی ایسی عظمت کو بیان کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے جہاں الفاظ کفایت نہیں کرتے، جیسے اردو میں کہیں "کیا کہنا ہے آپ کے حسن و جمال کا" یا اسی طرح کہتے ہیں آپؐ کے سراپا جمال کی عظمت کا کیا کہنا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ کان أحسن الناس خَلْقًا آپ تمام انسانوں میں سب سے زیادہ حسین و جمیل تھے۔ ایک فارسی کا شعر ہے:

اکنوں توئی جمیل جہاں گرچہ پیش ازیں
آوازۂ جمال زکنعاں برآمدہ

یعنی آپؐ اپنے عہد میں سب سے زیادہ حسین و جمیل ہیں اگرچہ آپ سے پیشتر حسن کا شہرہ کنعاں سے اٹھا تھا، یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کا حسن مشہور رہا۔

جہاں تک حسن اخلاق کا تعلق ہے اس پر قرآن ناطق ہے وَإِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيمٍ (اور اخلاق آپؐ کے بہت عالی ہیں ـــ (سورۂ قلم)

كَالزَّهْرِ فِي تَرَفٍ وَالْبَدْرِ فِي شَرَفٍ ۔۔۔ وَالْبَحْرِ فِي كَرَمٍ وَالدَّهْرِ فِي هِمَمِ

كَأَنَّهُ وَهُوَ فَرْدٌ مِنْ جَلَالَتِهِ ۔۔۔ فِي عَسْكَرٍ حِيْنَ تَلْقَاهُ وَفِي حَشَمِ

(وہ بزرگ گرامی) صباحت میں جیسے کلی، اوج و رفعت میں جیسے چودھویں کا چاند، سخاوت میں جیسے دریا اور ہمت و پامردی میں جیسے زمانہ۔

جب بھی آپ سے ملئے، آپ ایک فوج کے درمیان ہوں، یا خدام کے جھرمٹ میں ہوں، اپنی جلالت شان سے تن تنہا سب پر بھاری اور سب میں ممتاز نظر آئیں گے، گویا کہ آپ ہی ہیں اور کوئی نہیں ہے۔ (عربی داں حضرات کے لیے: کانہ فرد من جلالتہ وھو فی عسکر حین تلقاہ وفی حشم)

ان دونوں شعر کا مفہوم یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جمال جہاں آرا کو اگر تشبیہ دی جائے تو جہاں تک چہرۂ انور کا تعلق ہے وہ اپنی صباحت میں کلی کے مانند ہے، اوج و رفعت اور ضیا بخشی میں مثل ماہتاب کے ہے اور جہاں تک عادات و فضائل کا تعلق ہے آپ کی سخاوت مثل دریا کے ہے، سخاوت کے لیے دریا کی تشبیہ اس لیے دیتے ہیں کہ اس سے انسان، حیوان، چرند، پرند ہر شخص بقدر ضرورت پانی لیتا ہے، دریا کی روانی کم نہیں ہوتی، اور دریا سے صرف پانی ہی نہیں بلکہ کھانے کے لیے مچھلیاں اور زینت کے لیے موتی بھی نکلتے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے:

"وھو الذی سخر البحر لتاکلوا منہ لحما طریا وتستخرجوا منہ حلیۃ تلبسونھا۔"

اور وہی تو ہے جس نے دریا کو تمہارے اختیار میں کیا تاکہ اس میں سے تازہ گوشت کھاؤ اور اس سے زیور (موتی وغیرہ) نکالو جسے تم پہنتے ہو۔ (۱۶/۱۴)

'صباحت' میں نے ترف کا ترجمہ کیا ہے، اصل ترجمہ اس لفظ کا نرمی ہے ملائم ہونا، جیسے کلی نرم و ملائم ہوتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک اس درجہ نرم تھے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

مامسست حریرا ولا دیباجا ألین من کف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

(میں نے نبی کریمؐ کے دست مبارک سے زیادہ نہ ریشم کو ملائم پایا اور نہ دیباج (ایک نرم کپڑا) کو۔

وَالدَّھرِ فِی ھِمَمٍ کا مطلب یہ ہے کہ ہمت و پامردی، شدائد کا مقابلہ کرنے میں آپ کی مثال دھر (زمانہ) کی جیسی تھی، عرب قدیم عقائد کی بنا پر مصائب و شدائد اور نعمت و اقبال مندی سب کی نسبت زمانہ کی طرف کرتے تھے، جیسے فارسی اور اردو کے شعرا ر آسمان کو مصائب و شدائد کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں، کسی مصیبت زدہ کو کہتے ہیں "فلک گزیدہ" ہے، آسمان ظلم ڈھا رہا ہے، یہ بات اسلامی عقیدہ کے لحاظ سے غلط ہے کیونکہ آسمان اور زمین سب اللہ کی مخلوق ہیں کسی میں طاقت نہیں کہ کسی کو نقصان یا فائدہ پہونچا سکیں، البتہ اس کی ایک تاویل یہ ہے کہ ظرف بول کر مظروف مراد لینا ایک عام طریقہ ہے، چونکہ خوش حالی اور بدحالی، سختی اور نرمی کا مشاہدہ ہم زمانہ کے بدلنے سے کرتے ہیں، اس لیے زمانہ کی طرف ان امور کی نسبت کر دیا کرتے ہیں۔ عربی میں بھی اس کی مثال ہے جیسے کہیں نھارہ صائم لیلہ قائم ظاہر ہے کہ دن روزہ نہیں رکھتا، رات کھڑی نہیں رہتی، دن میں روزہ رکھا جاتا ہے، رات کو قیام کیا جاتا ہے مگر یہ بولنے کا ایک طریقہ ہے۔ بوصیریؒ اپنے ممدوح پاکؐ کے بارے میں کہتے ہیں کہ آپ کی ہمت و شجاعت ایسی تھی جیسے زمانہ ہو۔ جو ہر وار برداشت کر لیتا ہے، اور اپنی جگہ سے ہلتا نہیں ہے۔

دوسرا شعر، عربی ترکیب کے لحاظ سے، ذرا پیچیدہ سا ہے، کہنا یہ چاہتے ہیں کہ آپؐ کو بڑے سے بڑے مجمع میں دیکھو ہر ایک کی نگاہ آپؐ ہی پڑتی ہے، خدام ہوں یا عساکر ہر مجلس یا ہر مجمع میں آپؐ اپنی جلالتِ شان سے تنہا ہی نظر آتے ہیں۔

كَأَنَّمَا اللُّؤْلُؤُ الْمَكْنُونُ فِي صَدَفٍ ۔۔۔ مِنْ مَعْدِنَيْ مَنْطِقٍ مِنْهُ وَمُبْتَسَمِ

لَا طِيبَ يَعْدِلُ تُرْبًا ضَمَّ أَعْظُمَهُ ۔۔۔ طُوبَى لِمُنْتَشِقٍ مِنْهُ وَمُلْتَثِمِ

(دندان مبارک) گویا کہ موتی ہیں جو صدف میں ہوں، ان موتیوں کا معدن گفتگو اور تبسم ہے، کوئی خوشبو اس مٹی کی برابری نہیں کر سکتی جس مٹی نے آپ کی ہڈیوں کو اپنی آغوش میں لیا ہے، مبارک ہو اس شخص کو جس کو اسی مٹی کی خوشبو نصیب ہو یا اس کے چومنے کی سعادت ملی ہو۔

پہلے شعر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لب و دندان کو اُن موتیوں سے تشبیہ دی ہے جو اپنی سیپوں (صدف) میں محفوظ ہوں اور ان کو گفتگو اور تبسم فرمانے کے وقت دیکھا جاتا ہے۔

دوسرے شعر میں آپؐ کی تربت پاک کی مٹی کو بتایا جا رہا ہے کہ وہ مٹی جس میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا جسد مبارک محفوظ ہے۔ اس کی خوشبو کا مقابلہ دنیا کی کوئی خوشبو نہیں کر سکتی، کتنے خوش نصیب ہیں وہ جن کو

ان کے سونگھنے یا چومنے کا موقع ملے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

ما شممت عنبرًا ولا مسکًا ولا شیئًا اطیب من ریح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

میں نے عنبر، مشک اور دنیا کی کوئی ایسی خوشبو نہیں سونگھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انفاس پاک سے زیادہ عطر بیز ہو۔

شیخ باجوری نے اس مصرعہ پر "خوش نصیب ہے وہ جو اس مٹی کو سونگھے یا چومے" کی ایک اور شرح نقل کی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ طُوبیٰ سے مراد جنت کا درخت ہے جس کے متعلق احادیث میں وارد ہے کہ اس کے سایہ میں سوار ایک سو برس تک چلتا رہے گا، یعنی اس درجہ گھنا سایہ دار درخت ہے، اس کے بعد کا لفظ لمنتشق میں حرف ل "تبیین" وضاحت کے لیے ہے، منتشق سونگھنے کی جگہ۔ یعنی بینی (ناک) اور ملتثم مغفر پہننے کی جگہ یعنی چہرہ، لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ جنّت کا سایہ دار درخت طوبیٰ آپ ہی کی بینی (ناک) اور چہرۂ انور کا مظہر ہے۔ یہ تاویل اس لیے کی جا رہی ہے کہ شیخ بوصیریؒ پر یہ الزام نہ آئے کہ انھوں نے 'قبر چومنے' یا قبر کی مٹی سونگھنے کو روا رکھا ہے، کیونکہ شرعًا یہ مکروہ ہے۔ لیکن عربی جاننے والے سمجھ سکتے ہیں کہ یہ مفہوم پہنانا محض دور کی تاویل ہے جو سیاق و سباق سے مختلف ہے، شیخ بوصیری نے سونگھنے اور چومنے ہی کو سعادت کی بات کہا ہے، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ امر فرطِ محبّت میں جائز ہوگا، ہمیں بجائے اپنا عقیدہ اور خیال بیان کرنے کے شاعر کی ترجمانی کرنا چاہیے۔

أَبَانَ مَوْلِدُهُ عَنْ طِیبِ عُنْصُرِهِ   یَا طِیبَ مبتدأٍ مِنْهُ وَمُخْتَتِمِ

ولادت باسعادت نے آپؐ کے خاندانی شرف و طہارت کو ظاہر کر دیا۔ کیا کہنے ہیں آپؐ کی ابتدا، اور آپؐ کی انتہا کے۔

اس شعر میں اُن معجزات کی طرف اشارہ ہے جو آپ کی پیدائش سے ماقبل اور پیدائش کے روز ظاہر ہوئے، اگرچہ ان روایات کی صداقت مؤرخینِ اسلام اور سیرت نگارانِ نبویؐ کے نزدیک صحیح نہیں ہے، مثلاً یہ روایت کہ پیدائش سے پہلے ایک فرشتہ نے آپؐ کی والدۂ ماجدہ کو ایک گلاس دودھ کا لاکر پیش کیا، اور پیدائش کے وقت ایوانِ کسریٰ کے چودہ کنگرے زمیں بوس ہو گئے، دریائے ساوہ

خشک ہوگیا۔ بوصیریؒ کے شارحین نے انہی روایات کی طرف اشارہ کیا ہے جس کو قسطلانی کے حوالے سے الروض الانف میں نقل کیا گیا ہے، چونکہ ان روایات کی صحت بہت زیادہ مشکوک ہے اس لیے علامہ شبلی نعمانیؒ نے سیرۃ النبی کی مشہور تحریر ظہور قدسی میں اس طرح اس کی تردید کی ہے کہ غلط روایات پر اعتماد کرنے والوں کو بھی بُرا نہ لگے۔ مولانا فرماتے ہیں:

"ارباب سیر اپنے محدود پیرایۂ بیان میں لکھتے ہیں کہ: "آج کی رات ایوان کسریٰ کے چودہ کنگرے گر گئے، آتشکدۂ فارس بجھ گیا، دریائے ساوہ خشک ہوگیا" لیکن سچ یہ ہے کہ ایوانِ کسریٰ نہیں بلکہ شانِ عجم، شوکتِ روم، اوجِ چین کے قصر ہائے فلک بوس گر پڑے، آتشِ فارس نہیں بلکہ جحیم شر، آتش کدۂ کفر، آذر کدۂ گمرہی سرد ہو کر رہ گئے، صنم خانوں میں خاک اڑنے لگی، بُت کدے خاک میں مل گئے، شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے اوراق خزاں دیدہ ایک ایک کرکے جھڑ گئے۔"

اس شعر میں آپ کے شرف خاندانی کی طرف اشارہ ہے جس کو "عنصر" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، اس سے مراد بنی ہاشم کا خاندان ہے، بعض شارحین کا رجحان یہ ہے کہ اس سے نسب ذکی از آدم مراد ہے کہ ثابت شدہ صحیح نسل سے پاکیزہ خاندانوں سے گزرتا ہوا آپ کا خاندان بنی ہاشم تک اور ان سے حضرت عبداللہ تک پہنچا، اور جہاں تک آپ کی پاکیزہ ابتدار کا تعلق ہے اور پاکیزہ تر انتہا کا موضوع ہے اس میں آج تک کسی کو حرف رکھنے یا زبان کھولنے کی جرأت نہ ہوئی ہے اور نہ ہو سکتی ہے، اس شعر میں بلاغت کی صنعت تکرار (طیب) اور صنعت مراعاۃ النظیر مبتدا و مختتم قابلِ تحسین ہے۔

يَوْمَ تَفَرَّسَ فِيهِ الْفُرْسُ أَنَّهُمُ ... قَدْ أُنْذِرُوا بِحُلُولِ الْبُؤْسِ وَالنِّقَمِ

ولادت باسعادت کا وہ دن تھا جس میں اہلِ فارس (کے مجوسیوں) نے تاڑ لیا تھا کہ نکبت و مصیبت کے آنے کا وقت آگیا ہے۔

یہ بھی اسی روایت کا ایک ٹکڑا ہے جس میں کہا جاتا ہے کہ ولادت نبوی کے زمانہ میں، یا اسی وقت آتش کدۂ فارس بجھ گیا تھا، اس شعر میں براہ راست یہ نہیں کہا گیا ہے مگر اشارہ اسی طرف ہے مطلب یہ ہے کہ ان کے علماء اور نجوم دانوں نے پیشین گوئی کر دی تھی کہ آج ایسا ستارہ روشن ہوا ہے جس سے ان کا زوال ہو جائے گا، اور ان کے رسم و رواج کو نیست و نابود کرنے والی ہستی اس دنیا میں پیدا ہو گئی ہے۔

(جاری)

علامہ عبدالسلام الدّرعی النّاصری کا سفرنامۂ حج

(۹)

وادیٔ نعمان کے متعلق یہ بات متعین ہے کہ تنعیم کے قریب نہیں ہے، جس نے لکھا ہے اس کو کسی سبب سے وہم ہوگیا ہے، یہ وادی عرفات کے حدود ختم ہونے کے بعد منیٰ کی طرف ہے، صاحب قاموس نے اس کو طائف کی طرف بتایا ہے مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے، اس وادی کا نام مختلف اشعار عرب میں آیا ہے، جس میں مشہور شعر یہ ہے:

تَضَوَّعَ مِسْکًا بَطْنُ نَعْمَانَ اِذْ مَشَتْ		بِہٖ زَیْنَبُ فِیْ نِسْوَۃٍ خَفِـرَاتٍ

(وادیٔ نعمان بوئے مشک سے مہک اٹھی جب اس میں زینب اپنی ہمجولیوں کے ساتھ اٹھلاتی ہوئی چلی)۔

اور یہ بات کہ وہ وادی نعمان ہی ہے جس میں "اراک" نامی درخت ہوتے تھے اور اس کی مسواکیں بہت نرم ریشوں کی اور خوشبودار ہوا کرتی تھیں۔ ابن باجہ کا یہ شعر "الروض المعطار" میں نقل کیا گیا ہے:

تَخَیَّرْتُ مِنْ نَعْمَانَ عُوْدَ اَرَاکِـہٖ		لِھِنْدٍ، وَلٰکِنْ مَنْ یُبَلِّغُھَا ھِنْـدَا

(میں نے وادی نعمان کے اراک کی لکڑی (مسواک) ہند کے لیے پسند کی ہیں، مگر اس کو ہند تک پہنچائے گا کون؟)

ابوبکر الصائغ کے چند شعر اسی پر ہیں، (طوالت کے خیال سے، اور اس لیے کہ جو لوگ عربی سے دلچسپی نہیں رکھتے ان پر بار ہوگا صرف ایک شعر لکھتا ہوں — مترجم):

أَسُكَّانَ نَعْمانَ الاراكِ تَيَقَّنُوا بأنكم فی رَبْعِ قَلبی سُکّانُ

(اراک والی وادی نعمان کے باشندو! تم یقین کرو کہ میرے وسط قلب میں تم رہتے ہو)

تنعیم کے بارے میں مصنّف لکھتے ہیں، یہ وہ مقام ہے جہاں سے آجکل اہلِ مکّہ اور باہر سے آئے ہوئے لوگ عمرہ کا احرام باندھتے ہیں، کیونکہ حرم سے قریب ترین حِلّ (حدودِ حرم سے باہری مقام) یہی ہے، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر یہیں آکر احرام باندھا تھا، وہ اپنے بھائی عبدالرحمٰن بن ابی بکر کے ساتھ آئی تھیں۔ ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اپنی بہن کے پیچھے اونٹنی پر بیٹھ جاؤ، اور ان پہاڑیوں کے بعد جو جگہ آئے وہاں یہ (حضرت عائشہؓ) احرام باندھ لیں، یہاں سے عمرہ مقبول ہے[1] اسی طرح جیسا کہ تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہے، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ جب کعبہ مشرفہ کی تعمیر کر چکے تو آپ نے کعبہ کی اندرونی اور بیرونی دیواروں پر خلوق (ایک قسم کا عطر یا خوشبو) لگایا، اور فرمایا کہ جس میں طاقت ہو تنعیم جاکر احرام باندھے اور مناسک عمرہ ادا کرے اور جو نہ جا سکتا ہو اُس کو چاہیے کہ ایک قربانی کا جانور ذبح کرے (محض شکرانہ کے طور پر، کوئی فرض واجب نہیں ہے) چنانچہ ان کے ساتھ ایک بڑی تعداد میں لوگ یہاں (تنعیم) آئے اور عمرہ ادا کیا۔ اس دن جتنے صدقے لوگوں نے دیے، اور جتنے جانوروں کی قربانی ہوئی اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ خود حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے سَو اونٹ ذبح کیے تھے۔

تنعیم میں تین مسجدیں ہیں جن کی حضرت عائشہ ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کی طرف نسبت کی جاتی ہے، اور انھیں "مساجدِ عائشہ" کہا جاتا ہے، کیونکہ یہی وہ جگہ ہے جہاں سے انھوں نے عمرہ کا احرام باندھا تھا، اور اسی کے قریب آکر لوگ آج بھی احرام باندھتے ہیں اور احرام کا دوگانہ ادا کرتے ہیں، یہ چھوٹی سی مسجد ہے، مضبوط بنی ہوئی ہے اور اس کے بائیں جانب نشیب میں ایک چھوٹا سا تالاب ہے، اور چند میٹھے پانی کے کنوئیں ہیں۔ اہلِ مکہ کا معمول ہے کہ حجاج کا استقبال کرنے کے لیے یہاں تک آتے ہیں اور خیمے

---

[1] صحیح بخاری میں تنعیم کی جگہ نہیں بتائی گئی ہے، روایت میں صرف اس قدر ہے کہ ام المؤمنین نے فرمایا کہ یارسول اللہ آپ نے عمرہ ادا کر لیا کاش میں بھی کر سکتی۔ آپؐ نے فرمایا اے عبدالرحمٰن! اپنی بہن کو لے جاؤ اور تنعیم سے عمرہ کرالاؤ، چنانچہ وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پیچھے اونٹنی کی کاٹھی پر بیٹھ گئے اور انھوں نے عمرہ کر لیا۔ صحیح بخاری کتاب الحج باب الحج علی الرحل۔ (مترجم)

نصب کیے جاتے ہیں، اور دوکانیں لگ جاتی ہیں، یہاں تک کہ طباخ (باورچی) بھی موجود رہتے ہیں۔

آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ حجاج جب "سرف" نامی جگہ سے گزرتے ہیں تو اپنے بائیں جانب جعرانہ[1] بتاتے ہیں اور اس کو قدیم عمرہ کہتے ہیں، اور جب تنعیم پہنچتے ہیں تو اس کو 'جدید عمرہ' کہتے ہیں۔ شیخ ابو سالم کہتے ہیں کہ ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جعرانہ سے عمرہ کا احرام پہلے باندھا جاتا تھا اور تنعیم سے اب باندھا جاتا ہے، کسی جگہ کا نام اس کام سے منسوب ہو جاتا ہے جہاں وہ انجام دیا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

" لَهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوٰاتٌ "

لفظ 'صلوات' کا مفہوم ہے مساجد۔ کیونکہ یہاں صلوات یعنی نمازیں پڑھی جاتی ہیں۔ اس کو کہتے ہیں تسمية الشئ باسم ما يقع فيه" (کسی شے کا وہ نام رکھنا جہاں کوئی خاص کام انجام دیا جاتا ہے)۔

الزاھر۔ ذوطویٰ

تنعیم سے آگے بڑھے، دو پہاڑوں کے درمیان کا تنگ راستہ ملا، اس کے دہانے پر ایک کنواں اور خالی جگہ ہے جس کو مشہد[2] کہا جاتا ہے۔ اگر آپ تنعیم سے مکہ جا رہے ہیں تو آپ کے دائیں جانب یہ مقام نظر آئے گا۔ لوگوں کا خیال ہے یہاں پر آکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہوئے تھے، ہم لوگ اسی دن اس کے آگے زاھر نامی وادی میں پہنچ گئے جو دو پہاڑوں کے بیچ میں ایک وسیع جگہ ہے یہاں کچھ درخت اور عمارتیں بھی دکھائی دیں، اسی کے قریب دامنِ کوہ پر، اگر آپ مکہ مکرمہ کی طرف بڑھ رہے ہیں تو آپ کے دائیں جانب، چند کھجور کے درخت ہیں جن کو جنّات مكة (مکہ کے باغات) کہا جاتا ہے، اس کے بعد ایک مقبرہ ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ کی قبر ہے، اور یہ بات ثابت ہے کہ حج کے بعد مکہ مکرمہ ہی میں ان کا انتقال ہوا تھا۔

---

[1] جعرانہ کا صحیح تلفظ جِعْرانہ ہے، بعض محققین نے (ر) کو مشدّد بھی بتایا ہے جعرّانہ۔

[2] عصر عثمانی میں ایک مسجد بنادی گئی تھی، اس کو عوام مسجد شہید کہا کرتے تھے، جس کی اصل 'مشہد' ہے حاضر ہونے یا موجود رہنے کی جگہ۔ (مترجم)

'الروض المعطار' میں مذکور ہے کہ ذو طویٰ[1] مکہ مکرمہ کے قریب ہے، یہی وہ جگہ ہے جہاں عبداللہ بن عمرؓ مدفون ہیں، یہ مقام مکہ مکرمہ سے تین میل پر ہے، کسی نے چھ میل بھی لکھا ہے، بعض اقوال کے مطابق یہ مقام 'فخ' ہے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ میں داخل ہونے سے پہلے غسل فرمایا تھا، اور یہاں مکہ مکرمہ کے مہاجرین کا مقبرہ تھا، جو لوگ مکہ کی مجاورت اختیار کرتے اور اُن کی وفات ہوجاتی تو یہاں لاکر دفن کیے جاتے تھے، نیز شامی اور مصری قافلے مکہ مکرمہ میں داخل ہونے سے پہلے یہاں خیمہ لگاکر ایک رات گزارا کرتے تھے، مگر وقوف عرفہ کے بعد جب واپس آتے تو مکہ مکرمہ سے باہر وادی مُحصّب (جس کو بطحا مکہ بھی کہتے ہیں) میں خیمہ لگایا کرتے تھے، لیکن شامی حجاج جانے اور منیٰ سے واپسی میں دونوں مرتبہ خیمہ یہیں لگایا کرتے تھے، پھر یہاں سے الزاھر کی طرف کوچ کرتے، لیکن تحقیقی بات یہ ہے کہ اس جگہ کا نام ذوطویٰ ہے، اور احادیث میں اسی نام سے اس کا ذکر آیا ہے، اس بنا پر کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذوطویٰ میں ایک شب گزاری ہے اور یہاں سے غسل فرماکر مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تھے، حجاج کی اکثریت اس سنت کو ادا کرتی ہے، ذوطویٰ اور مکہ مکرمہ کے درمیان کوئی اور وادی نہیں ہے، اکثر حجاج کے نزدیک ثابت شدہ بات یہ ہے کہ ذوطویٰ سے ایک موڑ کَدَاء کی طرف جاتا ہے، جو مکہ مکرمہ کا بالائی حصہ ہے، اور دوسرا راستہ جبل قیعقان سے ہوکر نکلتا ہے، پہلے موڑ کو ثَنِيَّةُ الحَجُون کہتے ہیں اور دوسرے کو ثنية الحصحاص کہا جاتا ہے، الحجون کو مَعْلَاة بھی کہتے ہیں، روایات میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ ذوطویٰ میں رات گزارتے تھے جو دو موڑوں کے دہانے پر ہے، اور وہاں غسل فرماتے اور جب صبح ہوتی تو مکہ مکرمہ کا رُخ کرتے۔ بخاریؒ نے یہ اضافہ کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی کیا کرتے تھے[2]

---

[1] اس لفظ کا پہلا حرف (ط) تینوں حرکتوں (فتحہ کسرہ اور ضمہ) سے سنا گیا ہے، طُوىٰ، طَوىٰ، طِوَىٰ حاشیہ صحیح بخاری کتاب الحج (مترجم)

[2] اصل روایت کے الفاظ یہ ہیں: عن ابن عمر قال: بات النبی صلی اللہ علیہ وسلم بذی طوی حتی أصبح ثم دخل مکة وکان ابن عمر یفعله۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رات ذوطویٰ میں گزاری اور جب صبح ہوگئی تو مکہ میں داخل ہوئے ابن عمرؓ بھی یہی کیا کرتے تھے، (بخاری کتاب الحج باب دخول مکة نهارًا و لیلًا، دوسری روایات بھی اس سے ملتی جلتی ہیں، امام بخاری نے کئی باب قائم کیے ہیں: (۱) مکہ میں داخل ہونے سے پہلے غسل کرنا (۲) مکہ میں رات دن میں داخل ہونا، (۳) مکہ میں کس طرف سے داخل ہوا جائے۔ (مترجم)

المُعَلاۃ ہی کو کَدَاء بھی کہتے ہیں (بعض لوگوں نے اس کو غیر منصرف کہا ہے) دوسرا راستہ جو قیعقان کی پہاڑی سے جاتا ہے اس کے نشیبی حصے کو 'کُدَیٰ' کہتے ہیں، اور اسی پہاڑی کے دامن پر جو آبادی ہے وہ 'شبیکہ' کہلاتی ہے، حجۃ الوداع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ذوطویٰ سے کَدَاء (المعلاۃ) کی طرف مڑے یہاں پر ایک مقام ہے جس کے بارے میں تمام مورخین کا اتفاق ہے کہ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اونٹنی سے اُترے تھے، اس جگہ کی اس تاریخی عظمت کو محفوظ رکھنے کے لیے زبیدہ نے ایک مسجد بنادی تھی جو اَب بھی ہے، لیکن الارزقی نے تاریخ مکہ میں لکھا ہے کہ جہاں مسجد ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز پڑھنے کی جگہ نہیں ہے بلکہ آپ نے اس جگہ پر نماز ادا کی تھی، جو بہت سے پتھروں کے ڈھیر ہونے کی وجہ سے ٹیلہ سی بن گئی تھی جس کو 'اُکَیْمَہ' کہتے ہیں اور یہ مسجد اس سے چند گز کے فاصلہ پر ہے۔

تنبیہ: کَدَاء مکہ شہر سے بلندی پر ہے، درمیان میں پہاڑ نہ ہو تو یہیں سے نظر آسکتا ہے مگر قافلے کو پہاڑ کے کنارے کنارے گھوم کر جانا پڑتا ہے، اس پہاڑ کا نام حجون ہے، اس کے نشیب میں المُحَصَّب ہے جس کو 'الأبطح' بھی کہتے ہیں، اور یہ بنی کنانہ کا خیف[1] تھا۔ بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منیٰ میں واپسی کے وقت فرمایا تھا کہ ہم کل انشاء اللہ خیف بنی کنانہ میں اتریں گے جہاں کفار نے کفر پر ثابت قدم رہنے کے لیے ایک دوسرے سے قسم لی تھی۔

کَدَاء۔ کُدَیٰ:

الدّہلوی لکھتے ہیں کہ آجکل حجاج کی اکثریت سنت کے خلاف مکہ مکرمہ میں داخل ہوتی ہے، لوگ عام طور پر باب الشُّبیکہ سے داخل ہوتے ہیں جو مکہ کا نشیبی حصہ ہے جس کو کُدَی کہا جاتا ہے، حالانکہ صحیح بخاری میں یہ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد بن الولید کو فتح مکہ کے موقع پر ہدایت کی تھی کہ وہ مکہ کے بالائی حصہ کَدَاء سے داخل ہوں، اور خود کُدی کی طرف سے داخل ہوئے تھے، لیکن آجکل جو

---

[1] خَیْف (سیف کے وزن پر) وہ مقام جو ذرا بلندی پر ہو، زمخشری نے اساس البلاغہ میں لکھا ہے ھو المکان المرتفع، اقرب الموارد میں ہے وہ مقام جو پہاڑوں کے دامن پر ہو مگر نہر سے بلند ہو، اس کو قدرتی چبوترہ کہا جا سکتا ہے جو پتھروں کے ڈھیر کی وجہ سے بن جاتا ہے۔ (مترجم)

ہو رہا ہے اس کی بات سے کوئی دلیل نہیں لی جاسکتی، کیونکہ آنحضرتؐ احرام میں نہیں تھے، دوسرے آپ کا مقصد پورے مکہ شہر کو ہر طرف سے دیکھنا تھا، اس کے برخلاف حج اور عمرہ کے سلسلہ میں آپؐ کا معمول یہی رہا کہ حجون کی طرف سے داخل ہوتے جیسا کہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر آپؐ نے کیا۔ خلاصہ یہ کہ سنت نبوی کے اتباع کا حق یہ ہے کہ حج و عمرہ کے لیے جب جائے تو بالائی حصہ (کدار۔ حجون) سے داخل ہو اور واپسی میں نشیبی جانب کُدی سے شبیکہ کی طرف مڑے۔ چنانچہ ہمارے قافلے نے سنت کے مطابق ذوطویٰ میں رات گزاری، صبح کو غسل کیا اور کدار کی طرف چل پڑے، ایک پہاڑی کے اوپر سے جانے کا راستہ چھوڑ کر اس کے بائیں جانب سے کنارے کا راستہ اختیار کیا، اور دوپہر ڈھلتے ہی حجون کے مقبرہ تک پہنچ گئے، یہاں سے کعبۃ المشرفہ صاف نظر آسکتا ہے لیکن درمیان میں پہاڑ حائل ہیں۔ لیکن ہمارے مصری ساتھی اپنے مطوفوں کے ہمراہ جبل قیعقان کے راستہ سے شبیکہ کی طرف چلے گئے کیونکہ فتح مکہ کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی راستہ سے گئے تھے۔ احادیث میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر بھی متعدد بار اسی راستہ سے مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تھے کیونکہ ان کا مکان وہاں سے قریب پڑتا تھا، اور یہ بھی مذکور نہیں ہے کہ وہ عمرہ کا احرام باندھے ہوتے تھے کیونکہ وہ حج یا عمرہ کی عبادت کے غرض سے ہمیشہ نہیں آتے تھے، بلکہ اپنے گھر آیا کرتے تھے، جیسا کہ شوافع اور مالکیہ کا مسلک ہے، بہرحال ذوطویٰ سے ہمارا اور مصری حجاج کا راستہ الگ ہوگیا۔ تنعیم ہی میں مکہ مکرمہ کے مطوفوں کی جماعتیں استقبال کے لیے موجود تھیں، تکیہ مصریہ سے وابستہ مطوفوں کی خواتین بھی مصری حجاج کی خواتین کے لیے کھانے کا سامان لے کر آئی تھیں، متعدد باورچی بھی تھے، پانی کے مشکیزے، صراحیاں، گلاس سب حاضر تھے۔ تعجب ہوا کہ مکہ کی خواتین نے بھی مصری خواتین کو دیکھ کر 'ولا ویل' شروع کر دیا ایک آواز 'بب بب، بب بب' کی برقعوں سے نکلنے لگی۔ افسوس کہ مطوفوں کو آداب دخول مکہ بتانا چاہیے تھا، طواف کے مسائل بتانا چاہیے تھا، کثرتِ تلبیہ کی ترغیب دینا چاہیے تھا، یہ سب تو ہوا نہیں راستہ بھر 'بب بب' ہوتا رہا۔ جب یہ لوگ ذوطویٰ سے الگ ہوئے تو ہمیں راحت محسوس ہوئی، بعد میں معلوم ہوا کہ مصری حجاج کا قافلہ ہم سے پہلے ہی مکہ مکرمہ میں عصر سے پہلے داخل ہوگیا تھا۔

مکّۃ المکرّمۃ میں:

حجون سے بائیں جانب حضرت سیدہ ام المؤمنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا مقبرہ ہے اور

چند فرلانگ پہلے ہی سے گنبد نظر آیا، مگر اب پھر اونٹوں سے کجاوہ اُتارنا اور چند ساعت کے بعد پھر کوچ کرنا دشوار تھا، اس لیے نیت ہی سے زیارت کر لی، اور بہ آواز سلام عرض کیا اور سفر جاری رکھا۔ [مکہ اور حجون کے درمیان تھوڑا راستہ صحرائی ہے باقی پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے] ہم لوگ پہاڑ کے کنارے کنارے چلے اور دفعۃً مکہ مکرمہ کے 'رات بازار' میں پہنچ گئے، یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ اس کو رات بازار کیوں کہتے ہیں، حالانکہ کھانے اور قہوہ کی دوکانیں کھلی ہوئی تھیں، وہاں سے دائیں جانب مڑ کر باب الزیادۃ کی گلیوں میں آگئے اور صبحۃ الشبان کے سامنے میدان میں اونٹ اور خچر بٹھا دیے گئے، ان کو پانی اور چارہ دیا گیا اور ہم لوگ شیخ مصطفیٰ صالح سنبل کے مکان پر فروکش ہوئے اور ان کی قیادت میں حرم شریف کی طرف رُخ کیا، شیخ مصطفیٰ نے دعائیں گھر ہی سے شروع کرا دیں، راستہ بھر دعائیں کراتے رہے خود روتے رہے اور ہم سب کو رُلاتے رہے، جس وقت حرم شریف پر نظر پڑی جسم میں کپکپی سی آگئی اور آواز خود بخود بند ہو گئی اور ایسا محسوس ہوا جیسے بدن سے خون خشک ہو گیا، وہ آنکھ جو راستہ بھر اسی گھر کو دیکھنے کے لیے بے چین تھی معلوم ہوا اس میں خشکی ہی خشکی ہے، کبھی نمی نہیں آئی تھی، اگر شیخ مصطفیٰ کی دعائیں نہ ہوتیں تو شاید دعا کرنا ہی بھول جاتا، دل جو تڑپ رہا تھا معلوم ہوا جیسے پتھر کا ہو گیا، کوئی حس و حرکت نہیں، اب رونا اس بات کا تھا کہ رونا کیوں نہیں آرہا ہے، اپنے وجود پر شرم آنے لگی، "یا لیتنی مِتُّ قبل ھذا وکنت نسیا منسیا" "وائے کاش! میں اس سے پہلے مر چکتی اور بھولی بسری ہو گئی ہوتی) مطوف صاحب کے پیچھے پیچھے طواف کرتا رہا، یا طواف کرایا گیا،

---

[۱] شیخ حمد الجاسر نے جو الدرعی کا سفرنامہ مرتب کیا ہے اس میں زیادہ تر جغرافیہ سے متعلق باتوں کو نقل کیا ہے اور اسی کی تحقیق کی ہے۔ مکہ مکرمہ میں داخل ہونے کے بعد شیخ درعی نے اپنی جو کیفیات لکھی ہیں ان کو نقل نہیں کیا اور اتنا لکھنے پر اکتفا کیا کہ "مکہ آکر دینی جذبات کا اُبھرنا ایک قدرتی بات ہے، ہمارے دوست (صاحبنا یعنی الدرعی) نے بھی اس کو نظم و نثر میں بہت تفصیل سے بیان کیا ہے، اس لیے ہم اس کو حذف کرتے ہیں، مگر اردو کے راقم مترجم نے اس حصے کو نقل کرنا ضروری سمجھا اس لیے جامعہ ام القریٰ کے کتب خانہ سے اصل سفرنامہ نکال کر دیکھا اور اس سے یہ عبارت نقل کی ہے اس کے علاوہ ۱۳۰ شعر کا قصیدہ ہے وہ اس لیے نہیں نقل کیا گیا کہ اشعار کا ترجمہ دشوار ہوتا ہے اور اس میں ذوق و شوق کے بیان کے علاوہ زیادہ تر رعایت لفظی اور صنائع و بدائع ہوتے ہیں ان کا واضح کرنا مترجم کو دوسرے رُخ پر ڈال دے گا، شیخ حمد الجاسر نے دونوں کو حذف کر دیا ہے۔ (مترجم)

میں بندھے جانور کی طرح چلتا اور بیمار (طوطے) کی طرح الفاظ دہراتا رہا۔ مگر جب ملتزم پر آکر مطوف نے اپنی گلوگیر آواز میں کہا یا رب البیت العتیق تو ایسا محسوس ہوا جیسے نشے سے یک بیک ہوش آگیا ہو، یا جیسے کسی نے نیزہ مار کر نیند سے بیدار کر دیا ہو، جا کر ملتزم سے چمٹ گیا، پھر معلوم نہیں میں کیا پڑھتا رہا، کیا سُنتا رہا۔ مطوف زمزم کے کنویں کے قریب لے گئے اور خوب پانی پلایا اور وضو کرایا، اور مصلّیٰ مالکی پر عشاء کی جماعت شروع ہو چکی تھی میں بھی اس میں شریک ہو گیا۔]

رات مکہ مکرمہ میں برحۃ السّمان کے قریب شیخ مصطفیٰ صالح سنبل کے یہاں گزاری، پُرتکلف کھانا ملا، جس میں سبزیاں، گوشت، اور چاول تھے، مگر گوشت کو ہاتھ نہیں لگایا کیونکہ مکہ مکرمہ کی بکریاں سنا کی پتیاں کھاتی ہیں جو دست آور ہے، مکہ والے ہمیشہ کھاتے ہیں اور ان کو کوئی شکایت نہیں ہوتی مگر حجاج کو یہ گوشت نقصان پہنچاتا ہے، رات کے چار گھنٹے آرام کیا، سفر کی کدورت اور راستے کی مشقت اب یاد بھی نہ رہیں، کعبۃ اللہ کا ایک منظر ساری تھکن کو دور کرنے کے لیے کافی تھا، مکہ کی پاک بستی میں میرا نجس وجود پہنچ گیا یہ محض اللہ تعالیٰ کا کرم ہے ورنہ کتنے حجاج اس راستہ میں لوٹے گئے، کچھ شہید ہوگئے، کچھ پیاس کی شدت میں جان بحق ہوگئے، یہاں پہنچنا محض اللہ تعالیٰ کا کرم تھا، ایک نظر بنائے ابراہیمی کو دیکھ لیا تو ایسا محسوس ہوا کہ زندگی کی قیمت وصول ہوگئی، رات کے نصف آخر میں پھر حرم شریف آگئے۔ خدا بھلا کرے میرے مطوف شیخ مصطفیٰ سنبل کا کہ انھوں نے مجھے تنہا نہیں چھوڑا بلکہ خود ساتھ ہو لیے، یہ رات آٹھویں ذی الحجہ کی رات ہے، کل ترویہ کا دن ہے۔

مِنیٰ کی طرف خروج:

نماز فجر کے بعد طواف کیا اور اپنی قیام گاہ پر واپس آگئے، ذرا دن چڑھا تو پھر کجاوے کسے گئے اور ہم لوگ (مغاربہ) منیٰ کی طرف روانہ ہوئے، توپ چھوٹنے کی آواز ہماری روانگی سے پہلے ہی آنے لگی تھی، یہ اعلان تھا کہ منیٰ کی طرف کوچ کرنے کا وقت آگیا ہے۔ جو لوگ متمتع تھے انھوں نے دوبارہ احرام باندھ کر طواف اور سعی کیا، اس سفر میں مصری حجاج ہمارے ساتھ نہیں تھے، کیونکہ وہ لوگ خوف اور دہشت کی بناء پر آٹھویں کو منیٰ نہیں جاتے یہ سنت مستقلاً ترک ہوگئی ہے، مگر ہم لوگ طے کر چکے تھے کہ خواہ جو بھی ہو جو سنت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اس پر ثابت قدم رہیں گے، جان کا خوف ضرور ہے، مگر جب

سنت ہی چھوٹ گئی تو زندگی بے مزہ اور بے حیائی کی ہوگی۔ منیٰ ظہر سے پہلے پہنچ گئے، اور ظہر ظہر کے وقت میں ادا کی اور ایک مثل پر عصر کی نماز پڑھی۔ اب رات گزارنے کا مسئلہ تھا، ہمارے مطوف نے بہت الحاح اور خلوص کے ساتھ ہم سے کہا کہ آپ نے سنت ادا کر دی، عشار کی نماز یہاں نہ پڑھیئے، اور رات گزارنا اپنی ہلاکت کو دعوت دینا ہے، آس پاس میں کوئی آبادی نہیں اور ہم چند نفر مغربی حجاج کے سوا اس میدان میں کوئی نہیں ہے، مسجد خیف میں ایک چھوٹا سا دالان ہے جس میں کنکر بچھے ہوئے ہیں، اور ایک منبر بھی ہے۔ اس دالان سے باہر پتھروں سے احاطہ کی ہوئی ایک جگہ ہے جہاں ناقۂ نبویؐ آکر ٹھہرا تھا وہاں نماز نفل پڑھی مگر اس احاطہ سے باہر، اندر اس لیے نہیں گئے کہ ہو سکتا ہے جہاں ہم قدم رکھیں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یا صحابۂ کرام کی سجدگاہ ہو۔

یہ میرا جذباتی معاملہ ہے، جو فقہی لحاظ سے کوئی حیثیت نہیں رکھتا، دوسرے حجاج نے اس کے اندر جا کر نفلیں پڑھیں اور دعائیں کرتے رہے، اللہ تعالیٰ سب کی سننے والا اور ہر ایک کی دعا قبول کرنے والا ہے۔

میں نے یہاں چند شعر کہے جو میرے جذبات کی کسی قدر ترجمانی کرتے ہیں (اشعار حذف کر دیے گئے ہیں) بہر حال اپنے مطوف کے اصرار کی بنا پر اور اس لیے کہ ہمارے پاس موم بتیاں بھی نہ تھیں اور اپنے دفاع کے لیے کوئی سامان نہ تھا، رات تاریک تھی اور کیڑوں اور زہریلے جانوروں کا بھی خطرہ تھا، اور متواتر خبریں ایسی سننے میں آئی تھیں کہ رات کو لٹیرے آتے ہیں اور حاجیوں کو قتل کر دیتے ہیں، اس لیے بادل نخواستہ مغرب کی نماز پڑھتے ہی عرفہ کی طرف کوچ کیا، اور راستہ بھر اللہ کی امان وحفاظت طلب کرتے رہے، مالکی مذہب کے مطابق ہم لوگوں نے مکہ مکرمہ میں داخلے کے بعد ہی سے تلبیہ موقوف کر دیا تھا اور تکبیر وتہلیل میں مشغول رہے اور دعائیں پڑھتے رہے۔ منیٰ میں بھی کھانا ہمارے مطوف صاحب کی طرف سے ملا، جو کھجور، روٹی اور سبزی پر مشتمل تھا، پانی کے مشکیزے ساتھ تھے، ہر وضو اطمینان سے کیا۔ والحمد للہ علیٰ ذلک۔

(جاری)

مولانا محمد خالد غازی پوری ندوی

اُردو زبان و اَدب پر
سیّد احمد شہیدؒ کی تحریک کے اثرات
(۲)

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کا وعظ :

زندگی کے ان تابندہ نقوش کو شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے وعظ و نصیحت کے آئینہ میں ملاحظہ فرمائیے۔ وقائع احمدی میں یہ وعظ ان الفاظ میں موجود ہے :

"مولانا نے ظہر کی نماز کے بعد فرمایا، امیر کی طاعت ہر ایک پر فرض ہے ہر مسلمان کو چاہیے کہ اس کا حکم ملنے میں چوں چرا نہ کرے اگرچہ اپنے نفس کے خلاف معلوم ہو، ہم نے سنا ہے کہ آج جو لوگوں کا مال و اسباب واپس ہوا تو بعض بھائیوں کو ناگوار گزرا یہ بات نہ جانے ہم نے خدا اور رسولؐ کے حکم کے موافق واپس کروادیا ہے، اس مال کا لینا بھائیوں کو درست نہ تھا۔ اس بات سے خوش ہونا چاہیے اور شکر کرنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو قیامت کے مواخذہ سے بچایا اور جو کسی کے دل میں بشریت کی راہ سے کچھ خطرہ نفسانی آیا ہو تو اس سے توبہ کرے۔ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے امید ہے کہ بخش دے گا۔ مولانا کا وعظ سُن کر لوگوں پر بڑا اثر ہوا، اور اپنے دل میں بہت نادم ہوئے، اور کہا کہ مولانا نے حق فرمایا۔"

'تقویۃ الایمان' کی ادبی حیثیت :

مولانا کی علمی قابلیت، عقل سلیم، نیز منطق اور زور استدلال اور زور کلام کا صحیح اندازہ ان کی کتابوں سے ہوتا ہے، مولانا کی چھوٹی بڑی تصنیفات میں فی الوقت تقویۃ الایمان جو اردو ہی میں لکھی گئی، اور حقیقت میں یہ کتاب اس تحریک کی جان و روح اور آئینہ ہے جس میں اس عظیم الشان تحریک کی صورت نظر آتی

ہے۔ آپ نے یہ کتاب اس وقت لکھی جب اردو زبان ایّامِ طفولیت سے گزر رہی تھی ابھی گھٹنوں چلنا نہ آتا تھا، حیرت ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں جب اردو نثر میں گنتی کی کتابیں تھیں ایک صاحب کمال نے اس میں کیا جادو بھر دیا ہے اور اس کی مدد سے اپنے خیالات کو کتنی خوبی سے ادا کیا ہے۔ موجِ کوثر کے مصنّف نے اس پر یوں تبصرہ کیا ہے:

"یہ کتاب نہ صرف مذہبی بلکہ ادبی نقطۂ نظر سے بھی بڑی اہم ہے، اس کا طرزِ تحریر ایسا بااثر اور پُرزور ہے کہ بقول صاحب سیر المصنّفین معلوم ہوتا ہے کہ ایک دریائے زخار امنڈا چلا آتا ہے۔"

شاہ صاحب نے اپنی کتاب کے پہلے باب میں توحید کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ آپ کے زورِ بیان اور جوشِ اصلاح کا نہایت عمدہ نمونہ ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

"سننا چاہیے کہ اکثر لوگ پیروں اور پیغمبروں کو اور شہیدوں کو اور پریوں کو مشکل کے وقت پکارتے ہیں، ان سے مرادیں مانگتے ہیں اور ان کی منّتیں مانتے ہیں اور حاجت برائی کے لیے ان کی نذر و نیاز کرتے ہیں، اور بلا کے ٹلنے کے لیے اپنے بیٹوں کو ان کی طرف منسوب کرتے ہیں، کوئی اپنے بیٹے کا نام عبدالنبی رکھتا ہے کوئی علی بخش، کوئی حسین بخش، کوئی مدار بخش، کوئی سالار بخش . . . . ان کے جینے کے لیے کوئی کسی کے نام کی چوٹی رکھتا ہے، کوئی کسی کے نام کی بدھی پہناتا ہے، کوئی کسی کے نام کے کپڑے پہناتا ہے، کوئی کسی کے نام کی بیڑی ڈالتا ہے، کوئی کسی کے نام کے جانور ذبح کرتا ہے، کوئی مشکل کے وقت کسی کی دہائی دیتا ہے، کوئی اپنی باتوں میں کسی کے نام کی قسم کھاتا ہے، غرض جو کچھ ہندو اپنے بتوں سے کرتے ہیں، سو وہ سب کچھ یہ جھوٹے مسلمان انبیاء اور اولیاء سے اماموں سے اور شہیدوں سے اور فرشتوں اور پریوں سے کر گزرتے ہیں، اور دعویٰ مسلمانی کیے جاتے ہیں، سبحان اللہ یہ منہ اور دعویٰ۔"

کسی زبان کی ترقّی کا راز:

کسی زبان کی ترقی، وسعت اور ہمہ گیری کی بات یہ ہوتی ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ اور ہر مراحل

یں اظہارِ رائے کا ذریعہ اور اس کی ضرورتوں کا کفیل ہو، اس کے ساتھ ساتھ اس کے ادبی سرمایہ میں دوسری زبانوں کی قدریں، معانی و مفاہیم کو جذب کرنے کی صلاحیت ہو تو اس سے بھی اس کے ادبی اور علمی دائرہ میں وسعت آتی ہے، عربی زبان میں یونانی علوم کے منتقلی سے اس کی قدر و قیمت میں مزید اضافہ ہوا، اسی طرح اردو زبان میں فارسی اور عربی کے بیش بہا علمی ذخائر کی منتقلی نے اس کو آج بین الاقوامی حیثیت دی، اور ہر موضوع پر اس زبان میں خامہ فرسائی کی گئی۔ اس تحریک پر جو کچھ لکھا گیا یا اس کے مقاصد کی وضاحت کی گئی، اس کے لیے فارسی زبان کو بھی ذریعہ بنایا گیا، سید صاحب کے ملفوظات کا مجموعہ صراطِ مستقیم، جسے مولانا اسمٰعیل شہیدؒ اور مولانا عبدالحی صاحب نے ترتیب دیا، آپ کی تحریک کا بہترین آرگن ہے، جہاں معاشرہ کی دکھتی رگوں کو پکڑا گیا اور مؤثر پیرایۂ بیان میں اس کی خامیوں کی نشان دہی کی گئی ہے، اس کو بھی اردو کا جامہ پہنایا جاچکا ہے۔ شاہ صاحب کی دوسری کتاب 'منصبِ امامت' ہے، جو آپ کی ادبی نگارشات کا بہترین نمونہ ہے، جہاں وہ مقربین بارگاہ الٰہ کی محبوبیت کا تذکرہ کرتے ہیں وہ حصہ بڑا دلکش و دل آویز ہے۔ ہم حضرت شہیدؒ کی ایک عبارت اسی کتاب سے نقل کرتے ہیں ہر چند کہ اصل کتاب فارسی میں ہے، لیکن اس کا اردو ترجمہ بھی زبان و بیان کی تاثیر سے پُر اور ادبی قدر و قیمت سے لبریز ہے اور جذبہ عقیدت و الہانہ محبت، اور عظمت و احترام کا بہترین ادبی نمونہ ہے، وہ فرماتے ہیں:

"معلوم ہونا چاہیئے کہ انبیاء علیہم السّلام کو دیگر افرادِ انسانی کے مقابلہ میں خاص امتیاز حاصل ہے ان پر قدرت کی نظرِ رحمت اور ان کو عنایاتِ الہیہ سے خاص مسرت ہے وہ فراوانی انعامات سے سرفراز اور فضل و کرم کی بارشوں سے ممتاز ہیں، چمن محبوبیت کے گل یاسمین اور انجمن مقبولیت کے اورنگ نشین ہیں۔ آسمان انس کے درخشاں اختر اور عالم قدس کے افسر ہیں، مناصب جلیلہ کی تفویض کے لائق اور مہتم بالشان امور عظام کی انجام دہی میں فائق ہیں، کروبیوں کی محفلوں کے سردار اور قدوسی لشکروں کے سپہ سالار ہیں ان کی خاص توجہ بند دروازوں کی کنجی ہے اور ان کی دعا لاریب مقبول ہوتی ہے ان سے محبت کرنے والا حضرت رب العزت کا محبوب اور ان سے عداوت رکھنے والا اس بارگاہ میں مبغوض و مغضوب ہے ان کی محبت ترقیٔ درجات کا ذریعہ

اور ان کا توسل نجات کا وسیلہ ہے[1]۔"

تحریک کے فروغ میں مولانا عبدالحیٔؒ کا کردار:

اس تحریک کے گلِ سرسبد مولانا عبدالحی خلیفہ اجل حضرت سید احمد شہیدؒ ہیں، آپ کے فیضِ صحبت نے انھیں جوہرِ آب دار بنا دیا تھا وہ خاموش طبع تھے، لیکن ان کا ایمان چٹان کی طرح محکم و مضبوط تھا، زبان و بیان پر بے پناہ قدرت تھی، زورِ خطابت کا یہ حال تھا کہ مسلسل کئی کئی گھنٹے تقریر کرتے اور اپنی ولولہ انگیز تقریروں سے جوشِ جہاد پیدا کرتے، آپ کے خطبات کے نمونے سیرت سید احمد شہیدؒ میں جو موجود ہیں ادبی اور فنی قدر و قیمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لکھنؤ میں قیام کے دوران ایک روز آپ نے جمعہ کے دن وعظ فرمایا، مسجد غازیوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی، ازدحام کا عالم یہ تھا کہ لوگوں نے اگلوں کی پشت پر سجدہ کیا، "وَلَقَدْ آتَيْنَا إِبْرَاهِيمَ رُشْدَهُ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهِ عَالِمِينَ" (اور ہم نے پہلے ہی سے ابراہیم کو نیک راہ دی تھی اور ہمیں ان کی خبر تھی)۔ اس کے ضمن میں تعزیہ داری عرس، محفل سرود قبر پرستی وغیرہ کو کھول کھول کر بیان کیا، ہزاروں شیعہ اور سنی سنتے تھے اور سیکڑوں آدمی زار و قطار روتے تھے، اور آپس میں کہتے تھے کہ سبحان اللہ اس بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا آج ہی قرآن مجید نازل ہوا ہے، افسوس کہ آج تک ہم گمراہی میں مبتلا رہے۔

مولانا عبدالحیٔؒ کی اثر انگیز تقریر:

وقائع احمدی میں ہے کہ تمام حاضرین محفل سکتہ کے عالم میں تھے، مولانا عبدالحی صاحب نے سب کی طرف مخاطب ہو کر کہا:

> "صاحبو! تم سب سے ایک عرض کرتا ہوں اس کو متوجہ ہو کر سنو اور اس کا جواب دو، وہ یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کی داڑھی اتنی بڑی تھی کہ تمام سینہ چھپا لیا تھا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی داڑھی بھی ایسی ہی تھی۔ اہل سنت و جماعت محبت چار یار کا دعویٰ رکھتے ہیں اور حضرات شیعہ کو حضرت علی مرتضیٰ کی محبت کا دعویٰ ہے، محبت کے معنی ہیں اس چیز کی طرف میل و رغبت کرنا جو مرضیٔ محبوب کے موافق ہو نہ یہ کہ اپنے محبوب کی

---

[1] منصب امامت ص ۴

رضا کے خلاف چلے۔ بڑا تعجب ہے کہ دونوں فریق داڑھیاں منڈواتے ہیں اور منہ
سے صحابہ اور اہل بیت کی محبت کا دعویٰ کیے جاتے ہیں۔"

یہ سُن کر جن صاحبوں کی داڑھیاں مُنڈی تھیں، انھوں نے منہ پر رومال باندھ لیے، توبہ کی اور اسی روز سے لوگوں کو ہدایت ہونا شروع ہوگئی۔

تقریر کا حاصل یہی ہے کہ جس موضوع پر مقرر بول رہا ہو، اس کا حق ادا کردے اور مجمع میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت اس غرض سے کرے کہ وہ مجمع کو متاثر کرکے اپنا ہم خیال بنالے اسی لیے تقریر کو نثر فنی کی بہترین قسموں میں شمار کیا جاتا ہے، ان تصریحات کے آئینہ میں ان خطبات کی ادبی حیثیت کا پتہ چلتا ہے۔

شاہ ہدایت علی جے پوریؒ:

حضرت سید صاحبؒ اور آپ کی تحریک کا اثر دور دراز خطّوں تک پہنچا، بڑی قدآور شخصیتیں متاثر ہوئیں اور زندگی کے پُرپیچ راہوں میں آپ کی رہبری قبول کی اور آپ کے داعیانہ اصول وضوابط کی روشنی میں برصغیر کے لاکھوں عوام کو رہنمائی ملی اور ہدایت کی ساقی گری ہوئی۔ اس کے لیے جس زبان کا استعمال ہوا وہ عام طور سے اردو ہی تھی، جس کی وجہ سے اردو کو دور دراز خطّوں میں پہنچنے اور پروان چڑھنے کا موقع ملا، اور اس کی ادبی اور فنّی حیثیت بھی اُجاگر ہوئی، اس موقع پر حضرت شاہ ہدایت علی صاحبؒ جے پوری کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا، جن کے ذریعہ اللہ رب العزّت نے ایک وسیع حلقہ کو متاثر کیا، جن کے یہاں تصوّف کی چاشنی بھی ہے اور علم وعمل کی کارفرمائی بھی اخلاص وللّٰہیت کا بے پناہ جذبہ بھی ہے اور حسن اخلاق کا بے مثال نمونہ بھی۔ حضرت شاہ ہدایت علیؒ نے تصوّف وسلوک پر کئی اہم کتابیں تصنیف فرمائیں، مثلاً، معیار السلوک و دافع الاوہام والشکوک احسن التقویم، فتوح الحرمین فی مبشرات رسول الثقلین اور دُرِّ ثانی جو خلاصہ ہے حضرت مجدّدؒ کے مکتوب کا، جس کی ترتیب وتلخیص حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنی اسیری کے زمانہ میں جے پور سنٹرل جیل میں کی ہے حضرت شاہ صاحبؒ نے خواجہ معصوم سرہندیؒ کے مکتوبات کا خلاصہ بھی کیا ہے لیکن وہ مکمل نہ ہوسکا۔ ان کتابوں کے مندرجات سے جہاں شاہ صاحب کے علمی وسعت، دقّت رسی، فکر عمیق، وسعت نظری اور تصوّف میں اعتدال و توازن کا اندازہ ہوتا ہے وہیں آپ کی ادبی حیثیت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ تصوّف کے ژولیدہ اور

باریک مسائل کو جس طرح آپ نے حل کیا ہے وہ زبان پر قدرت کی دلیل ہے اور پھر سلیس اور عام فہم انداز میں جس کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہی روح کام کر رہی ہے جو سید صاحبؒ کی تحریک کی اصل روح اور جان تھی، اسلامی عقیدہ میں توحید کا جو مقام ہے، اس کی وضاحت کرتے ہوئے احسن التقویم میں یوں رقم طراز ہیں:

"اولیاء اللہ اور ابرار و صالحین و شہداء اور عام مومنین نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ یادِ حق اور اتباع حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے حاصل کیا ہے اور بتوسل حضرات انبیاء مرسلین علیہم الصلوٰۃ والسلام و صحابہؓ کمال عروج پر پہنچے ہیں اور ان کا ہر فعل اور ذکر و فکر خالص توحید سے لبریز تھا، اور اس میں شرک غیر اللہ کا شائبہ بھی نہیں، کیونکہ اسلام میں شرک سے زیادہ کوئی چیز بدتر نہیں، اسی واسطے حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے صاحبزادے سے فرمایا: "اے میرے بیٹے! اللہ کی ذات و صفات میں کبھی شرک نہ کرنا، تحقیق شرک کرنا بڑا ظلم ہے"۔ اور سورۂ کہف کے آخر میں ہے: "تو جو شخص چاہے کہ اللہ سے ملاقات کرے پس اس کو چاہیئے کہ اللہ کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے"۔ اور خود حضورؐ کو ارشاد ہے: "اے نبیؐ! آپ کہہ دیں کہ میں اپنی ذات کا مالک نہیں ہوں کہ نقصان سے بچالوں، یا نفع حاصل کروں مگر اللہ جو چاہے گا وہ ہوگا"

یہ ہے توحید اصلی خالص جس سے تمام مذاہب خالی ہیں، اور اسی خالص توحید سے مسلمانوں کے پیشواؤں کو اصلی اور حقیقی تقرب حق اور انتہائی عروج ملا ہے۔

حضرت سید احمد شہیدؒ سے روحانی نسبت:

حضرت شاہ ہدایت علی صاحبؒ جد امجد حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب مدظلہ العالی کا تعلق حضرت سید صاحبؒ سے نسبی تو نہیں لیکن روحانی علمی اور فکری ضرور ہے، حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب مدظلہٗ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا کہ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا جھکاؤ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم کی طرف کیوں ہے تو معلوم ہونا چاہیئے کہ حضرت سید شہید کی نسبت کام کر رہی ہے، ہمارا پورا ننھیال حضرت سید احمد کی تحریک میں شریک تھا بلکہ ہمارے ایک عزیز کا عالم یہ تھا کہ ان کے دونوں پیر جہاد

میں کٹ گئے تھے، چلنے پھرنے سے معذور تھے لیکن کبھی کبھی جہاد کا ایسا غلبہ ہوتا کہ عزیزوں سے کہتے میرے لیے گھوڑا تیار کرو اور مجھے اس کی پشت سے باندھ دو، اس کے بعد گھنٹوں گھوڑے پر سوار رہتے اور تلوار اور نیزے اس طرح چلاتے گویا میدانِ جہاد میں غنیم کی فوج پر یلغار کر رہے ہیں۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ سید صاحب شہید ہو گئے تو کہتے تھے کہ نہیں وہ زندہ ہیں اور پھر آئیں گے اور پورے ملک کو کافروں سے آزاد کرائیں گے۔ ظاہر ہے اس تعلق کا اثر خاندان کے سپوتوں پر ضرور ہوگا اور وارداتِ قلبیہ اور نگارشاتِ علم میں اس کے اثرات ضرور نمایاں ہوں گے۔ حضرت شاہ ہدایت علی صاحبؒ نے انسان کی بشریت پر جہاں کلام کیا ہے، وہ بھی انھیں کا حصہ ہے۔ اس مضمون کو جس خوبی سے ادا کیا ہے اس میں خطابت کا زور اور تحریر کا بانکپن نمایاں ہے۔ فرماتے ہیں:

"یہی انسان جامع کمالات ہے یہی انسان اصل مخلوقات ہے، یہی انسان آئینہ ذات وصفات رحمٰن ہے، یہی انسان مبدا الکمال ہے، یہی انسان علمہ البیان ہے، یہی انسان احسن التقویم دلیل ذات سبحان ہے، اسی کا قلب مسجد حقیقی و جلوہ گاہ خالق زمین و آسمان ہے۔

لیکن لفظاً ہر بشر، بشر ہے اور حقیقتاً لفظ بشر حضرات انبیاء کے واسطے درست ہے اور کمال بشر خیر البشر علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے لیے موزوں و مناسب ہے۔ آگے فرماتے ہیں:

"جو انسان صاحبِ دل نہیں وہ دل کو کیا جانے، اور جو ہری نہیں وہ گوہر کو کیا جانے، جو بیدرد ہے وہ اہلِ درد کو کیا پہچانے . . . . . یہ جہاں دارِ عمل ہے اور جزا و سزا آنے والا ہے مَنْ طَلَبَ وَجَدَ عام ہے، عقل و شعور سے کام لے تو تمام مخلوق میں بہترین مخلوق ہے۔ اسی مخلوق کی تہذیب کے لیے پیغمبر علیہم السلام آئے اور صوفیاءِ کرام اور علماءِ عظام نے اپنی کوششیں صرف کیں، جو ان سے قریب ہوا اس کی زندگی میں انقلاب آیا اور سوچ و فکر کے پیمانے یکسر بدل گئے۔"

سرسیّد احمد خاں پر تحریک کے اثرات:

حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک سے جہاں جوشِ جہاد اور کفر سے عناد پیدا ہوا وہیں سوچ و فکر

کے پیمانے بھی بدلے، ملّت اسلامیہ کو اپنے تشخصات و امتیازات کی بقا کے لیے تعلیمی میدان میں آگے بڑھانے کی کوشش کی گئی لہذا دارالعلوم دیوبند اور علی گڑھ تحریک ہر چند کہ دونوں کا بہاؤ مخالف سمتوں میں رہا لیکن حقیقت میں اسی تحریک اصلاح و اجتہاد کے تاثر ہی کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے اور دارالعلوم ندوۃ العلماء تو حقیقت میں اسی خوانِ نعما کا خوشہ چیں اور اسی شجر طوبیٰ کی ایک پُر بہار اور مثمر شاخ ہے۔ علی گڑھ تحریک کے روح رواں گلِ سرسبد، سرسید احمد خاں سید صاحب کی تحریک سے بے حد متاثر تھے۔ انھوں نے اپنی کتاب 'آثار الصنادید' میں حضرت سید احمد بریلویؒ، شاہ اسماعیل شہید اور شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کے حالات جس فرطِ ادب اور محبت سے لکھے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں ان بزرگوں سے بڑی عقیدت تھی۔ 'موجِ کوثر' کے مصنف نے حیات جاوید کے حوالہ سے لکھا ہے کہ: "وہ حضرت سید احمد کی تحریک اصلاح سے بہت متاثر ہوئے انھوں نے اپنے آپ کو اس زمانے میں علی الاعلان وہابی مسلمان کہا تھا جب وہابی باغی سمجھے جاتے تھے۔

سرسیّد نے ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب کا جواب لکھتے ہوئے تصریح کی تھی کہ مولانا سید احمد شہید اور ٹھیک ٹھیک سمجھو تو شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی تمام کوشش اس امر پر مبذول تھی کہ ہندوستان میں اپنے مذہب اسلام کی تہذیب و اصلاح کرنی چاہیے۔ سرسید نے حضرت سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کی تائید میں کئی کتابیں لکھیں، مثلاً راہ سنت و رد بدعت اور کلمۃ الحق وغیرہ۔

شدّتِ تاثر اور تہذیب الاخلاق کا اجرا:

اسی تاثر کا نتیجہ ہے کہ قوم کی زبوں حالی دیکھ کر اس کی اصلاح کے لیے مختلف علمی سوسائٹیاں قائم کیں اور عملاً اس کی ترویج و ترقی کی کوشش کی اور اس کا انھیں شدّت سے احساس تھا کہ، قوم کی اصلاح کے لیے ضروری ہے کہ ایک نئی زبان تیار ہو جو فارسی کی جگہ لے کیونکہ اس زبان کا مستقبل ہندوستان میں تاریک ہے، ایک نیا لٹریچر پیدا ہو جو شاندار ماضی اور موجودہ زبوں حالی کی تصویر قوم کے سامنے کھینچ کر رکھ دے، ایک نئی نثر رائج ہو، جو زور انشاء دکھانے کے لیے نہیں بلکہ روزمرّہ کے واقعات بیان کرنے کے لیے کام آئے۔ انہیں احساسات کو عملی شکل دینے کے غرض سے تہذیب الاخلاق کا اجرا کیا گیا ہر چند کہ تہذیب الاخلاق کی وجہ سے انھیں مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس میں کوئی شک نہیں اس کی وجہ سے قوم

میں ایک نئی زندگی پیدا ہو گئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ۲۰ فروری ۱۹۵۴ء کو علی گڑھ یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"اغلب خیال یہ ہے کہ عوام کے ذہنی رجحانات پر جتنے ہمہ گیر اثرات تہذیب الاخلاق نے چھوڑے ہیں، ہندوستان کے کسی اور رسالے نے نہیں چھوڑے... اس رسالے کے اجراء سے موجودہ اردو ادب کی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے، اردو نے اس رسالے کی بدولت اتنا فروغ پایا کہ دقیق سے دقیق مطالب کا اظہار اس زبان میں ہونے لگا۔ اس دور کا کوئی مسلمان ادیب ایسا نہ تھا جو تہذیب الاخلاق کے حلقۂ ادب سے متاثر نہ ہوا ہو، دورِ جدید کے بلند معیار مصنفین نے اسی خوانِ نعمت سے لقمے چُنے اور اسی حلقہ کے اثر و نفوذ سے نقد و بصر کی نئی قدریں اور فکر و نظر کے نئے زاویے متعین ہوئے۔"

نظم و قصائد پر تحریک کے اثرات:

اس تحریک کے زیرِ اثر اردو زبان و ادب کے نثر فنی کو جہاں فروغ ہوا وہیں اس کے دور رس اثرات نظم و قصائد میں بھی چھٹکی ہوئی چاندنی کی طرح نظر آئے ہیں یوں تو رزم نامے اور شاہ نامے فارسی اور اردو میں خاصی تعداد میں لکھے گئے، اردو میں صوفی شعراء نے مثنویاں لکھیں جن کے ذریعہ اخلاقی مضامین میں دلکشی پیدا ہوئی۔ مولانا حالی کی مقبول ترین مسدس سامنے آئی، اور حضرت عبدالرزاق کلامی نے فتوح الشام کو ۲۵۰۰۰ ہزار اشعار میں صمصام الاسلام کے نام سے منظوم کیا، اور حفیظ جالندھری نے شاہنامہ اسلام لکھا۔ مولانا شبلی نے اسلامی تاریخ کے واقعات پر مشتمل نظمیں لکھیں اور رزمیہ قصائد خود اقبال کے یہاں بھی ملتے ہیں، پھر علیم ناصری نے شہدائے بالاکوٹ کی مناسبت سے شاہ نامہ بالاکوٹ تحریر کیا جس کے بارے میں مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم فرماتے ہیں:

"علیم ناصری صاحب کے یہاں زبان و بیان میں بڑی سادگی و شگفتگی ہے، طرزِ ادا میں دلکشی دلکشائی، تاریخی واقعات کا تسلسل اور جزئیات کا احاطہ، مزاج کی اسلامیت اور دینی غیرت و حمیت اور فن کے ظاہری و معنوی محاسن کی موجودگی نے ان کے شاہ نامہ بالاکوٹ میں عصرِ حاضر کے ایک اچھے اسلامی رزمیہ کی شان پیدا کر دی ہے"

جس کو پڑھتے ہوئے آنکھیں بھی نم ہوتی ہیں اور دلوں میں حرکت و حرارت بھی محسوس ہوتی ہے اور یہ کسی ادبی شاہکار کی کامیابی کی ایک بڑی دلیل اور کھلا ثبوت ہے۔

حرفِ آخر:

حضرت سید صاحب کے رفقاء اور مریدین پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹے۔ حوادثات کے شرارے برسے، زمانے کے بے رحم ظالم پنجوں سے انھیں خاک و خون میں غلطاں کیا گیا لیکن وہ عزت کے پہاڑ ثابت ہوئے، قید و بند کی مصیبتیں جھیلیں، فاقہ مستی کی صعوبتیں اٹھائیں لیکن اُف نہ کیا، مختلف قسم کے ان پر مقدمے قائم کیے گئے، پھانسی کا حکم سُنایا گیا، جلاوطنی پر مجبور ہونا پڑا۔ پوری پوری بستیاں مع ساز و سامان کے زمین بوس کردی گئیں لیکن انھیں شکایت نہیں ہوئی۔ دعوت و عزیمت کی داستان اگر دیکھنا ہو تو انھیں مظلومین کی تحریروں کو دیکھیے جنھوں نے خونِ دل سے صفحۂ قرطاس پر ایمان و یقین اور دعوت و عزیمت کی تاریخ ثبت کی ہے، تحریر کا بانکپن ان کی ادبیت کا غماز ہے، اور تحریر کی حلاوت ان کی للّٰہیت و خلوص کی آئینہ دار ہے۔ تاریخ عجیب تواریخ عجیب اور سوانح عجیبہ کے مؤلفہ مولانا محمد جعفر تھانیسری کے دامن سے واقعات و حالات، احساسات اور تصورات کے بیش بہا ان ادبی آبگینوں اور جواہر ریزوں کو چُنا جاسکتا ہے، تذکرۂ صادقہ، اور سرگزشت مجاہدین میں ڈھونڈا جاسکتا ہے، وقائع احمدی، سوانح احمدی کے آئینہ میں ان کی تصویریں دیکھی جاسکتی ہیں۔ آثار الصنادید اور حیات طیبہ میں ان پاکیزہ نفوس کی قدآور اور دل آویز شخصیتیں نظروں میں پھر جاتی ہیں۔ اور پھر سیرت سید احمد شہید تو ان سب کا عطر اور خلاصہ ہے جس کے زبان و بیان پر تبصرہ آفتاب کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔

حضرت سید صاحب کی تحریک اپنے حجم و زمانے کے اعتبار سے ضرور قلیل تھی لیکن اپنے اثرات کے اعتبار سے اس کے حدود بے حد وسیع تھے اس کی اثراندازی سے اردو زبان کیسے محروم رہتی اسی کا ہلکا نمونہ اس مختصر مضمون میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی گئی ہے۔

گر قبول افتد زہے عزّ و شرف

ترتیب: شفیق الرحمٰن ندوی

عالمِ اسلام کی علمی وثقافتی سرگرمیاں

حج سے چند روز قبل حرم کی حرمت کی پامالی کا جو المیہ خمینی کے آلۂ کار ایرانیوں کے ذریعہ پیش آیا، اس پر ساری دنیا کے مسلمانوں نے شدید ردِّ عمل کا اظہار کیا، واقعہ یہ ہے کہ اس حادثہ نے ہر مسلمان کو تڑپا یا اور اس کی غیرتِ ایمانی کو ابھارا اور اس پر مسلمانوں کے اندر ردعمل پیدا ہونا، واقعہ کی مذمت کرنا، اور اس سنگین اور گھناؤنے جرم کا ارتکاب کرنے والوں سے اعلان برات کرنا بقول مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی مدظلہٗ طبعی بھی ہے، شرعی بھی ہے، اور غیرتِ ایمانی کے عین مطابق ہے، مسلمان خواہ دنیا کے کسی خطہ کا باشندہ ہو ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور خانۂ کعبہ کے بارے میں بہت زیادہ حسّاس اور غیور واقع ہوا ہے۔ وہ سب کچھ برداشت کرسکتا ہے لیکن وہ کبھی برداشت نہیں کرسکتا کہ ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یا کعبہ مشرفہ کی حرمت پر آنچ آئے۔ یہی وجہ ہے کہ اس المیہ پر کئی ماہ گزر گئے لیکن مختلف شکلوں میں ردعمل کے اظہار کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ عالم عرب میں بھی اور اس سے باہر بھی، بلکہ دوری اور مہجوری کے احساس نے دنیائے عرب سے باہر کے مسلمانوں کے دلوں میں سوز و گداز زیادہ ہی پیدا کر دیا ہے۔ اس لیے ان کی بے قراری اور اضطراب کا منظر دیدنی ہوتا ہے۔

اسی ردّ عمل کی ایک کڑی وہ سہ روزہ کانفرنس ہے جو قاہرہ میں ۱۵، ۱۶، ۱۷ نومبر کو "تقدس حرم اور مسلمانوں کی ذمہ داریاں" کے عنوان سے منعقد ہوئی، جس میں علماء، دانشوروں، دینی اداروں، بالخصوص جامعہ ازہر، عوامی تنظیموں، عصری جامعات کے اساتذہ، وزارت اوقاف غرض ہر شعبہ اور ہر سطح کے لوگوں نے شرکت کی۔ کانفرنس کے شرکاء نے حادثہ حرم کے ذمہ داروں کی کھل کر مذمت کی اور بہ یک زبان سب نے کہا کہ مکہ مکرمہ کو

اللہ تعالیٰ نے حرم قرار دیا ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے مدینہ منورہ کو حرم ٹھہرایا ہے، ان دونوں مقدس شہروں کی حرمت باتفاق قائم ہے اور قیامت تک ان کی حرمت برقرار رہے گی، کوئی شخص یا کوئی گروہ ان کی حیثیت نہیں بدل سکتا، جو لوگ بھی ان دونوں شہروں کا تقدس پامال کرتے ہیں وہ شعائر اللہ کی توہین کے مرتکب ہوتے ہیں، صرف یہی نہیں کہ ایسے لوگ امن وامان درہم برہم کرنے کے مجرم ہیں بلکہ سعودی عرب کی بالادستی کو چیلنج کرتے ہیں، دنیا کا کوئی ملک اس کی اجازت نہیں دے گا اور نہ ایسی شنیع حرکت کی کوئی تائید کرے گا" کانفرنس کے شرکاء نے ایک قرارداد پاس کی جس میں کہا گیا کہ حرم مکی اور حرم مدنی سعودی عرب کے پاس ایک عظیم اور مقدّس امانت ہے، وہ اس امانت کی نگہداشت کا پابند ہے، اسے پورے عزم اور آہنی ہاتھوں کے ذریعہ اپنا فرض انجام دینا چاہیے، وہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو اپنی پُشت پر پائے گا، مصر کے علاوہ ملیشیا، انڈونیشیا، فلپائن، سنگاپور، افریقہ کے متعدد ممالک میں احتجاجی جلسے ہوئے۔

اس نوع کی متعدد کانفرنسیں ہندوستان میں بھی منعقد ہوئیں جن میں ایک جلسہ تحفظ حرم کے نام سے جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام ۸ رنومبر کو دہلی میں ہوا۔ جس میں امام حرم شیخ عبداللہ السبیل نے شرکت فرمائی اور متعدد تقریریں ہوئیں۔ دوسری کانفرنس جامعہ سلفیہ بنارس میں امام ابن تیمیہ کے نام پر سمینار کی شکل میں ہوئی جس میں ڈاکٹر عبدالمحسن الترکی وائس چانسلر امام محمد بن سعود یونیورسٹی نے شرکت کی اور اس کا افتتاح عالم اسلام کے مشہور مفکّر اور داعی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ، نے کیا، اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے شیخ ترکی نے کہا کہ امام ابن تیمیہ کے کارناموں میں یہ ایک اہم کارنامہ ہے کہ انھوں نے شیعیت کی حقیقت واضح کر دی، آج جو فتنہ خمینی صاحب نے اُٹھایا ہے اس کی حقیقت سمجھنے کے لیے امام ابن تیمیہ کی تعلیمات سے ہمیں روشنی ملتی ہے، حرم شریف کی حرمت قرآن سے ثابت ہے جو لوگ اس کے امن کو غارت کر رہے ہیں وہ دین کی مخالفت کر رہے ہیں، ڈاکٹر شیخ عبداللہ عبدالمحسن الترکی کی تقریر کا رجحان اسی موضوع پر رہا۔

اس سمینار میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی الحسنی ندوی مدظلہ، کا مقالہ عربی میں تھا، وہ آپ نے خود پڑھ کر سنایا اور اس پر اصل موضوع امام ابن تیمیہ سے متعلق گفتگو کی۔ یہ تقریر رسالہ کی شکل میں شائع ہونے والی ہے، اردو ترجمہ 'تعمیر حیات' میں آچکا ہے۔

لکھنؤ میں اسی نام سے ایک اور اجتماع ہوا، جس میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی الحسنی ندوی مدظلہ، نے فرمایا کہ حرم کے واقعہ پر مسلمانوں میں شدید ردِّ عمل ہوا ہے وہ طبعی بھی ہے اور شرعی بھی، اور غیرت ایمانی

کے عین مطابق ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ دنیا کے کسی ملک یا قوم کو اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ حرم کو رقابتوں، سیاسی مقاصد کے حصول، نعرہ بازیوں کے لیے استعمال کرے۔ مولانا نے مزید فرمایا کہ اگرچہ حرم شریف کی حفاظت کا ذمہ دار اللہ ہے مگر اس نے مسلمانوں پر یہ بھی فرض قرار دیا ہے کہ اس کی حفاظت جان و دل سے کریں۔

اس سلسلہ کا سب سے اہم اور سنجیدہ اور ملک کے پڑھے لکھے علما و دانشوروں کا نمائندہ اجتماع لکھنؤ میں ۲۰، ۲۱ دسمبر کو "تقدس حج" کے عنوان سے ہوا۔ یہ کانفرنس شرکاء کے تنوع اور توازن و اعتدال کے اعتبار سے زیادہ وقیع کہی جاسکتی ہے، اس میں لکھنؤ یونی ورسٹی کے مسلم اساتذہ کے علاوہ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ، جامعہ ملیہ، جواہر لال نہرو یونی ورسٹی، دہلی یونی ورسٹی اور الہ آباد یونی ورسٹی کے پروفیسر شریک ہوئے۔ دینی مدارس کے اساتذہ اور طلبہ کثیر تعداد میں تھے، دارالمصنفین اعظم گڑھ کی نمائندگی بھی تھی۔ افتتاحی نشست کی صدارت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ نے فرمائی۔ مولانا نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا: "خانۂ خدا کی پہلی خصوصیت امن کی ہے اس لیے ہم سب کی مشترکہ ذمہ داری ہے کہ اس کی اس خصوصیت پر آنچ نہ آئے، جب امن و امان ہوگا تب ہی عبادت بھی ہو سکے گی، اس لیے اس مقدس مقام کو سیاسی مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنانے اور سیاسی اکھاڑہ بننے سے محفوظ رکھا جائے۔" مولانا نے کہا: "بیت اللہ ہی نہیں ہر مسجد کو پاک رکھنا، پرسکون رکھنا، تنازعات اور سیاسی معاملات سے دور رکھنا ضروری ہے۔" تقدس حج کانفرنس کی ایک نشست کی صدارت "ذکر و فکر" کے رکن ادارت جناب ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی نے کی، اس میں پیش کردہ مقالے فکری، علمی اور متوازن تھے۔

اس ضمن میں ایک اور کانفرنس کا ذکر نامناسب نہ ہوگا، یہ کانفرنس گزشتہ دنوں تہران میں منعقد ہوئی، جس میں شیعہ علماء کا ایک مخصوص طبقہ شریک ہوا، اس میں اظہارِ ندامت کے بجائے مخالف ردِ عمل ظاہر کیا گیا، باہر کی دنیا سے اس میں شرکت کے لیے چند گمنام لوگ ہی میسر آسکے، جن کا جغرافیہ ہنوز پردۂ خفا میں ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ فرقہ میں بھی ایک طبقہ واقعہ حرم کے سلسلے میں خمینی نواز فسادیوں کی حرکت کو غلط اور شنیع سمجھتا ہے، لیکن انتقامی کارروائی کے خوف سے اس کی زبان بند ہے، چنانچہ ایک اخباری اطلاع مظہر ہے کہ ایک شیعہ وکیل کو یوپی شیعہ وکلاء کانفرنس سے اس لیے خارج کر دیا گیا کہ وہ واقعہ حرم میں ایران کے رویہ کو غلط سمجھتا ہے، نیز عراق، ایران جنگ میں ایران کی ہمنوائی کے لیے تیار نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بیت اللہ شریف ہر مسلمان کے لیے قبلۂ دیدۂ و دل ہے، یہی وجہ ہے کہ دنیا کا

ہر مسلمان اس بارے میں ایک آواز اور یکساں احساس کا حامل ہے۔

نیویارک میں وحدت کلمہ کا مظاہرہ :

امریکہ بالخصوص نیویارک میں مختلف ممالک اور متنوع قومیتوں کے لوگ رہائش پذیر ہیں۔ یہ لوگ اپنے قومی دنوں میں یا کسی خاص دن انتظامیہ سے اجازت لے کر جلوس نکالتے ہیں اور اہم شاہراہوں پر گشت کرتے ہیں، اس کا مقصد اپنی قومی خصوصیات کو اُجاگر کرنا اور اپنے تشخص کو نمایاں کرنا ہوتا ہے، وہاں مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والے مسلمان بھی بڑی تعداد میں قیام پذیر ہیں، یہ لوگ بھی سال میں ایک دن اپنا جلوس نکالتے ہیں، الگ الگ ممالک کے قومی خصائص کو نمایاں کرنے کے بجائے اسلامی خصائص کا تعارف کرانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ مسلمان خواہ کسی خطّے سے تعلق رکھتا ہو وہ امت مسلمہ کا ایک فرد ہے، اور ایمان واخوت اسلامی کے رشتہ میں منسلک ہے، اس کی نگاہ میں ہر کلمہ گو اس کا بھائی ہے، زبان کی اجنبیت اور جغرافیائی حدود کی دوری اس راہ میں حائل نہیں ہوسکتی۔

گزشتہ سال اس نوع کا ایک جلوس نکالا گیا تھا جس میں تقریباً دس ہزار افراد شریک ہوئے، جلوس کے اختتام پر عشائیہ کا نظم تھا جس میں چار سو سے زیادہ لوگ شریک ہوئے، اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے بعض ممتاز افراد نے تقریریں کیں اور وحدت کلمہ کی بنیاد پر اتفاق واتحاد پر زور دیا۔ اس سال وحدتِ اسلامی کے مظاہرے اور جلوس کے لیے ۲۷ ستمبر کی تاریخ مقرر کی گئی تھی اس مقصد کے لیے نیویارک شہر کے کارپوریشن سے باضابطہ اجازت حاصل کی گئی، جلوس میں بڑی تعداد میں لوگ شریک ہوئے، ان میں عورتیں بھی تھیں، مختلف مراکز اسلامیہ کے نمائندے بھی تھے، کالے مسلمانوں کے رہنما وارث الدین محمد بھی شریکِ جلوس رہے، بعض عیسائی اور یہودی تنظیموں کے ذمہ دار بھی شریک ہوئے اور وحدتِ اسلامی کا مظاہرہ دیکھا، جلوس کی لمبائی اور تعداد کی کثرت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ تین گھنٹے میں جلوس اپنی منزل تک پہنچا، جلوس میں شریک افراد رنگ برنگ کے بینر لیے ہوئے تھے جن میں اسلامی تعلیمات کے نمونے لکھے ہوئے تھے، مثلاً کسی پر "وما أرسلناك إلا رحمة للعالمين" (اے نبیؐ! ہم نے آپ کو سارے جہاں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے) تحریر تھی، کسی پر "الجنة تحت اقدام الامهات" (جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔ کسی پر "ان اکرمکم عند الله اتقاکم" (اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم

میں سب سے بہتر وہ ہے جو تقویٰ و پرہیزگاری میں بڑھا ہوا ہے، بعض پر "خیارکم خیارکم لنسائکم" (تم میں بہترین لوگ وہ ہیں جو اپنی عورتوں کے حق میں بہترین ہیں)۔ کسی پر تحریر تھی "السلام والعدالة للجمیع" (امن وسلامتی اور عدل وانصاف ہر ایک کا حق ہے)۔ تمام بینر اسی نوع کی تحریروں پر مشتمل تھے جن میں کوئی نہ کوئی اسلامی و نبوی تعلیم ہوتی۔ جلوس کے اختتام سے قبل ہی ظہر کا وقت ہوگیا، مائک سے صدائے اذان بلند ہوئی، سڑک ہی پر صف بندی ہوئی، مختلف زبانوں اور مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے خدائے واحد کے حضور میں سربسجود ہوگئے۔

انڈونیشیا میں دعوتی کام:

انڈونیشیا سے آمدہ خبروں کے مطابق گزشتہ دنوں مدرسین کے دو تربیتی پروگرام ہوئے۔ ایک وسطی جاوا میں، دوسرا مغربی جاوا میں۔ ان پروگراموں میں نہضة العلماء کی سرپرستی میں چلنے والے مدارس کے اساتذہ شریک ہوئے، طریقۂ تدریس پر نظری لکچر کے علاوہ عملی تربیت بھی دی گئی۔ نیز تدریس کے نئے وسائل سے اساتذہ کو روشناس کرایا گیا اور ان کو کام میں لانے کی مشق کرائی گئی۔ تدریب کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ عربی زبان وادب کی تدریس بہتر طور پر ہوسکے اور اس کے خوش گوار نتائج برآمد ہوں، دوسرا مقصد یہ تھا کہ مدرسین میں دینی اور دعوتی شعور بیدار کیا جائے تاکہ وہ بیک وقت مدرس اور داعی ومربی کے فرائض بحسن وخوبی انجام دے سکیں۔ اس مقصد کے لیے بعض گراں قدر محاضروں کا نظم کیا۔ ایک محاضرہ ڈاکٹر محمد احمد سلیم نے دیا جس کا عنوان تھا: "اسلامی تربیت میں استاد کا کردار"۔ دوسرا محاضرہ "جدید سائنس میں مسلم سائنس دانوں کا حصہ" یہ محاضرہ شیخ خلیل حسن نے دیا، معلوم ہوا کہ طلبہ کے اندر اسلامی شعور بیدار کرنے اور ان کا علمی معیار بلند کرنے کے لیے اس نوع کے محاضرے اکثر وبیشتر ہوتے رہتے ہیں۔

اخباری اطلاع کے مطابق "پنچ شیلا" جو احمد سوئیکارنو، مصر کے جمال عبدالناصر، یوگوسلاویہ کے مارشل ٹیٹو اور ہندوستان کے جواہر لال نہرو کے ذہن کی پیداوار ہے۔ اسلامی اداروں اور مسلم تنظیموں کے کام کی راہ میں حائل ہے، کوئی تنظیم اس سے روگردانی نہیں کرسکتی ہے۔ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ عیسائی مشنریوں کو دعوتی وتبلیغی سرگرمیوں کی آزادی ہے، پابندیاں صرف مسلمانوں کے لیے ہیں، اطمینان کی بات یہ ہے کہ تمام رکاوٹوں کے باوجود دعوت کا کام رکا نہیں ہے۔ گذشتہ دو برسوں میں ۲۹ نئی مسجدیں تعمیر ہوئی ہیں اور پانچ نئے

مدرسے کھولے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ زیر تعمیر ۱۹ مسجدوں اور چار دینی مدارس کی تعمیر مکمل کی گئی ہے، واضح رہے کہ یہ مدرسے اور یہ مسجدیں ان علاقوں میں تعمیر کی گئی ہیں جو عیسائی سرگرمیوں کا خاص نشانہ ہیں۔ ایک اطلاع کے مطابق ۱۵۲ مبلغین دور دراز علاقوں میں دعوتی کاموں میں معروف ہیں۔ عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں اور ان کے اعداد و شمار کے مقابلہ میں مسلمانوں کی طرف سے یہ کوششیں ابتدائی نوعیت کی ہیں لیکن بہرصورت اطمینان کی بات ہے کہ اس طرف توجہ مبذول ہوئی ہے، میدان بالکل خالی نہیں ہے۔

ترکی میں اسلام اور لادینیت کی کشمکش :

'ذکر و فکر' کے ایک گزشتہ شمارے میں تفصیل آچکی ہے کہ ترکی کی یونی ورسٹیوں کے ذمہ داروں نے پردہ نشین لڑکیوں کے لیے اعلیٰ تعلیم کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ 'البلاغ' کویت کی ایک خبر کے مطابق اس حکم نامہ کا طلبہ اور طالبات پر شدید ردعمل ہوا ہے، چنانچہ اس غیر دانشمندانہ فیصلہ کو بدلوانے کے لیے یونی ورسٹیوں کے طلبہ میدان میں آگئے ہیں۔ دباؤ ڈالنے کے لیے ۱۹ یونی ورسٹیوں کے طلبہ اور طالبات نے بھوک ہڑتال کی اور سلجوق یونی ورسٹی کے آفس کا گھیراؤ کیا، پولیس نے طلبہ کی ایک بڑی تعداد کو گرفتار کیا، نیز پردہ کے حق میں ناجائز مظاہرہ کرنے اور کمالی سیکولرزم کی توہین کرنے کے الزام میں مقدمہ دائر کر دیا۔ اطلاعات مظہر ہیں کہ ان مقدمات کے فیصلے کے لیے جو خصوصی عدالتیں قائم کی گئی تھیں انھوں نے بہت سے طلبہ کو بری کر دیا ہے۔

ترک اپنی طبیعت اور مزاج کے لحاظ سے مسلمان ہیں، یونی ورسٹی کے اس نوع کے فیصلے ترک عوام کے مزاج کے خلاف ہیں۔ نام نہاد سیکولر بے موقع اور بے محل جہاد میں مصروف ہیں۔ انشاء اللہ انھیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ ترک مسلمانوں کے ذہن و دماغ سے اسلام کو کھرچنا آسان نہیں ہے۔

REGD. NO. D (SE)/53 **ZIKR-O-FIKR** Vol. [illegible] Part 4
Reg No. 45862/86 Feb -1988

G 1/278, Okhla, P O. Jamia Nagar, New Delhi-110025

① حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی کی اصلاحی ودعوتی تقریروں کا پہلا سیٹ ①

مولانا ندوی نے جن اہم اسلامی ممالک اور اہم علاقوں کا ملک و بیرون ملک دورہ فرمایا وہاں انھوں نے وہاں کے مخصوص حالات اور مسائل کو سامنے رکھ کر اپنے تاریخی مطالعہ کا نچوڑ، قرآن سے استفادہ کائنات کا لب لباب اور اپنا درد دل رکھا، ان تقریروں اور خطبات میں ایسے حقائق و مضامین آگئے ہیں اور ان میں جو دعوت و پیغام اور نقشۂ عمل پایا جاتا ہے وہ نہ صرف اُن علاقوں کے لئے جہاں یہ تقریریں ہوئیں بلکہ وہ بیشتر اسلامی ممالک اور دوسرے علاقوں کے اہلِ فکر و نظر کے لئے لائق توجہ اور مستحق فکر و نظر ہیں، اس سلسلے کے حسب ذیل مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں جن کی قیمتیں ہماری فہرست کتب سے معلوم ہو سکتی ہیں

مجموعۂ اصلاحیات مولانا ابوالحسن علی ندوی

۱۔ "مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں":۔ جس میں بڑی جرأت کے ساتھ مغربی تہذیب کے نقائص پر نکتہ چینی اور مشرق کے پرستاران مغرب کی غلامانہ ذہنیت اور اندھی تقلید پر صاف صاف تنقید کی گئی ہے، اور مشرق و مغرب کی درمیانی خلیج کو پاٹنے اور انسانیت کی صحیح رہنمائی و خدمت کے لئے ایک راہِ اعتدال کی نشاندہی کی گئی ہے۔ (عربی اردو اور انگریزی تینوں زبانوں میں دستیاب ہے)

۲۔ "پیام انسانیت":۔ پبلک جلسوں کی پانچ اہم تقریریں جن میں زندگی کے مسائل پر نئے طرز سے سوچنے اور نئے طریقے پر کوشش کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

(فی الحال اُردو و ہندی دونوں زبانوں میں دستیاب ہے)

۳۔ "مقام انسانیت":۔ مخلوط اجتماعات کی پانچ اہم تقریریں جن میں اغراض و تعصبات، قوم پرستی اور سیاسی مقاصد سے بالاتر اور بالکل آزاد و بے تعلق ہو کر عام انسانوں کے سامنے وہ حقیقتیں رکھی گئی ہیں جن پر انسانیت کی نجات اور سلامتی موقوف ہے، اور جن کو نظر انداز کر کے ہمارا یہ پورا تمدن اور پوری انسانی سوسائٹی اس وقت سخت خطرہ سے دوچار ہے۔

(فی الحال صرف اُردو اور ہندی میں دستیاب ہے)

۴۔ "نئی دنیا امریکہ میں صاف صاف باتیں":۔ مولانا ندوی کی ان اہم تقریروں اور خطبات کا فکر انگیز مجموعہ جو انھوں نے امریکہ و کنیڈا میں کی تھیں، جن میں مغربی تہذیب و امریکی معاشرہ کا جائزہ، تجزیہ و مطالعہ پیش کیا، اور امریکہ میں مقیم مسلمانوں کے بارے میں مشورے، تجربے اور اندیشے ظاہر کئے ہیں۔ (عربی، اُردو، وانگریزی تینوں زبانوں میں دستیاب ہیں)

۵۔ "پا جا سراغ زندگی":۔ طلبائے علوم نبوت کا منصب و مقام، ملت کی ان سے توقعات، عصر حاضر میں ان کی ذمہ داریاں، طلباء و علماء مدارس کے لئے ایک مفید و اہم تحفہ (صرف اُردو میں)

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام پوسٹ بکس ۱۱۹ لکھنؤ

(ندوۃ العلماء)

Printed at Lahooti Print Aids, Jama Masjid, Delhi-110006
and published by Syed Taha Abdullah, G 1/278, Okhla,
P. O. Jamia Nagar, New Delhi-110025

Dr. Zakir Husa

ایک علمی دینی اور ادبی ماہنامہ

ذکر و فکر (دہلی)

مرتبہ

خواجہ احمد فاروقی

مجلس ادارت

خلیق احمد نظامی

عبداللہ عباس ندوی — خواجہ احمد فاروقی

خط و کتابت کا پتہ

جی ۱/۲۷۸ اوکھلا، ڈاکخانہ جامعہ نگر، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵

ایڈیٹر : خواجہ احمد فاروقی

منیجر : محمد شبیر ندوی

پرنٹر پبلیشر : طٰہٰ عبداللہ

مطبع : لاہوتی پرنٹ ایڈس، جامع مسجد دہلی ۶

قیمت : ۵۰/ روپے (سالانہ) فی پرچہ ۵/

غیر ممالک سے ۲۰ ڈالر (یا اس کے بالمقابل سکہ ہندوستانی روپے میں)

تمام پرچے ہوائی ڈاک سے بھیجے جائیں گے اور وی پی نہیں بھیجی جائے گی

نوٹ

رقم، ڈرافٹ یا منی آرڈر کے ذریعہ ہی ارسال فرمائیں۔ اگر چیک سے رقم بھیجنا چاہیں تو مزید آٹھ روپے برائے بنک کا اضافہ کرکے بھیجیں۔ نیز ڈرافٹ، منی آرڈر یا چیک مندرجہ ذیل پتہ پر بھیجیں:

ZIKR-O-FIKR (Academy)
G-1/278, OKHLA, JAMIA NAGAR
NEW DELHI-110025

جلد (۳) رجب المرجب ۱۴۰۸ھ
شمارہ (۵) مارچ ۱۹۸۸ء

ترتیب

ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی

مذاکرات

ایران و عراق کی جنگ کو ختم کرانے کے لیے جو تدبیریں ممکن تھیں وہ کی جاچکیں، اقوام متحدہ نے جنگ بندی کی اپیلیں کیں، مسلم ممالک کے سربراہوں نے منت سماجت کی، عرب سربراہوں نے وفود بھیجے، یورپ امریکا میں رہنے والے مسلمانوں نے گزارشیں کیں، مسلمانوں کی عالمی تنظیموں مؤتمر اسلامی، اسلامک سکریٹریٹ، رابطہ اسلامی وغیرہ نے اپنے سالانہ اجتماعات میں تجاویز پاس کیں، عراق نے ہر وفد کا خیر مقدم کیا، اور کسی اپیل کا جواب ضد اور نخوت کے ساتھ نہیں دیا، مگر 'ولایت فقیہ' کا کبر و ناز کسی کو خاطر میں لانے کے لیے تیار نہیں ہے،

خلقے بہ منت یک طرف، آں شوخ تنہا یک طرف

اس جنگ کے نتیجہ میں عراق کے ساتھ سعودی عرب اور خلیج کی ریاستیں بھی اقتصادی عدم توازن کا شکار ہیں، اور ان ممالک میں تجارت و ملازمت کے ذریعہ لاکھوں کی تعداد میں روزی و روزگار حاصل کرنے والے انسان بے چین ہیں، کروڑوں نہیں اربوں کی گنتی میں ایران کے تومان اور عراق کے دینار روزانہ پانی کی طرح بہائے جارہے ہیں، اور اس معاملہ میں ایران زیادہ تباہ ہو رہا ہے، شاہ کے وقت کی جمع کی ہوئی دولت لُٹ چکی، اس نے اسلحہ کے لحاظ سے شرق اوسط میں اپنے آپ کو سب سے زیادہ مضبوط بنا رکھا تھا، وہ اسلحہ ضائع ہوچکے، تجربہ کار اور آزمودہ جرنیل و کرنیل کے سر قلم کردیے گئے۔

ایران کی اس ضد کو سہارا امریکہ اور اسرائیل سے علانیہ طور پر حاصل ہے۔ لیبیا اور سیریا خام بھی اس تابوت کو کاندھا دے رہے ہیں، اور عوام کو یقین دلایا جارہا ہے کہ اب وہ دن دور نہیں جب ائمہ معصومین اور شہدا کے مظلومین کے خون کا بدلہ لیا جائے گا، ان کے واعظ و ذاکر (خاکش بدہناں) یہ

منادی کر رہے ہیں کہ کربلا، نجف اور بغداد کے بعد کی منزل مدینہ منورہ کی ہے جہاں روضۂ انور ہے اور اس روضہ میں شیخین، صدیقؓ و فاروقؓ کی قبریں ہیں۔

عوام کے لیے ـــ اور خاص طور پر ایرانی عوام کے لیے نعروں کی وہی حیثیت ہے جو سپیرے کی بانسری کی ہے جس کی آواز سن کر ناگ اور ناگن اپنے بلوں سے نکل کر میدان میں آکر تھرکنے اور ناچنے لگتے ہیں، اور نعرہ بھی ایسا جس کو صدیوں سے نسل در نسل ایک ایک کان میں بار بار پھونکا گیا ہے۔

اب نئی بات ایران کے وسائل اعلام سے یہ کہی جا رہی ہے کہ اس جنگ کو باقی رکھنے کا مقصد یہ ہے کہ عربوں کی قوت اس طرح معدوم کر دی جائے جس طرح سرنج سے جسم کا خون نکال لیا جاتا ہے، اس کو عربی میں حرب تنزیف کہتے ہیں، جنگ جب تک رہے گی دونوں طرف کی فوجیں تیار رہیں گی۔ محاذ جنگ کے اخراجات ظاہر ہے سعودی عرب اور خلیج کے جمع شدہ خزانوں سے ادا ہوں گے، جب یہ خزانے خالی ہو جائیں گے تو پھر ایران کے لیے بصرہ سے کویت اور کویت سے صحرائے نجد کا میدان خالی ملے گا۔ لیکن یہ تو نقشۂ جنگ بنانے والوں کی ذمہ داری ہے کہ ایران کو بتائیں کہ عمل تنزیف Blood Sucking کا اثر یک طرفہ کیوں کر ہوگا، خود ایران بھی تو کھوکھلا ہو چکا ہے اور اس کی رگوں سے خون کے آخری قطرے نچوڑے جا رہے ہیں، اور اگر عرب تباہ ہوئے تو کیا ایران باقی رہ جائے گا؟ لیکن دیکھا گیا ہے کہ جب کسی فرد یا قوم کا وقت آ جاتا ہے تو اس کو سامنے کی چیز بھی نظر نہیں آتی، اور وہ ایسے شکنجے میں پھنس جاتا ہے کہ نادانوں کو بھی اس کی بدعقلی پر حیرت ہونے لگتی ہے۔

ایران کی کامیابی شہنشاہیت کے مقابلہ میں ایک افسانوی طریقہ پر عمل میں آئی، کچھ لوگوں نے کہا کہ یہ امام باڑوں (حسینیات) کا برپا کیا ہوا انقلاب ہے، ذکر مصائب بیان کر کے رلانے والوں نے اپنی آہ و بکا سے قصرہائے شاہی میں شگاف ڈال دیے، کسی نے کہا یہ کیسٹوں (cassettes) کے ذریعہ پھیلا ہوا انقلاب ہے جو ٹرانسسٹرس کے ذریعہ پیرس سے طہران کا سلسلہ جوڑے ہوا تھا، باخبر اہل سیاست نے کہا کہ یہ کمیونسٹوں کی منظم سازش کا ظہور ہے ورنہ کہاں امام باڑوں کے ذاکر اور مقبروں کے مجاور اور کہاں شیر و شمس (ایران کے جھنڈے کی علامت) سے نبرد آزمائی؟ لیکن جب شہنشاہیت واقعی دم توڑنے لگی تو کہا گیا کہ یہ سب عوام کی طاقت تھی، اور عوام کی طاقت کیا تھی؟ نعرے، جلسے، جلوس،

ہزاروں کے جلوس، لاکھوں کے جلوس، گھیراؤ، پتھراؤ، توڑ پھوڑ، عوام کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ ملکوں کو اس راستے سے فتح کیا جاتا ہے، بادشاہتوں کی بساطیں یوں ہی الٹا کرتی ہیں، اور اب ہمت اور بڑھی امریکہ کی ہزیمت یوں دکھائی گئی کہ اس کے سفارت کار ڈیڑھ سال تک بند رہے اور امریکہ کچھ نہ کر سکا، یہ باتیں اس درجہ مرتب و مہذب اور ڈرامے کے سین پے بہ پے اس طرح پیش کیے جاتے رہے کہ لوگوں کو یقین دلا دیا گیا کہ اصل طاقت جلوسوں اور نعروں کی طاقت ہے۔ سنہ ۱۹۵۶ء میں مصر پر عبدالناصر کی طرف سے اسی طرح کا پروپیگنڈہ کیا گیا کہ اس نے سہ طرفی حملوں کو ناکام بنایا، اور اب خلیج سے میحط تک (گلف سے لے کر مغرب اقصیٰ تک) ایک قوم کی حکمرانی ہوگی جس کا نام عرب ہے' عرب قومیت کا نشہ ایسا تھا کہ اسلام کے متبادل Parallel قوت کے طور پر اس کو پیش کیا جانے لگا، بلکہ اسلام کا دوسرا نام رجعیت میراث پرستی وغیرہ رکھا گیا بے چارے علمائے دین تک اپنی عزت بچانے اور نوجوانوں میں مقبولیت حاصل کرنے کے لیے 'قومیت عربیہ' کی حمایت میں تقریریں کرنے پر مجبور تھے، مگر جب ڈرامہ کا آخری 'سین' سامنے آیا تو معلوم ہوا کہ زیاں ہی زیاں تھا سود کا نام و نشان نہ تھا، کچھ اسی طرح کی صورت حال آجکل ایران کی سرزمین پر نظر آرہی ہے، ایک طرف ولایت فقیہ کے لامحدود اختیارات ہیں، جو افسانوں سے بڑھ کر خدائی انداز کے ہیں، دوسرے عوام کا یہ یقین کہ اصل قوت نعروں اور مظاہرات کی قوت ہے۔

حکومت بھی اندرونی خلفشار، اشیاء زیست کی گرانی اور انسانی گردنوں کی ارزانی کا جواز یہی پیش کر سکتی ہے کہ ملک جنگ کی حالت میں ہے۔ اور جنگ بھی مقدس جنگ ہے، عراق اور عراق کے ساتھ عرب ریاستیں سب توپ کے دہانے پر ہیں اور اپنے دفاع پر مجبور ہیں۔ غرض جنگ جاری ہے اور جنگ جاری رہے گی کیونکہ امریکہ اور اسرائیل کا مفاد اسی میں ہے، اور اسرائیل کے حکماء یا اکابر Elders کا پروٹوکول جن لوگوں نے پڑھا ہے وہ جانتے ہیں کہ کرۂ ارض یا نصف کرۂ ارض پر حکومت کرنے کے ذرائع میں یہ بھی داخل ہے کہ عرب حکومتوں کو آپس میں ٹکرا کر ختم کر دیا جائے۔

تصحیح: گزشتہ شمارہ میں صفحہ ۲۴ پر "الناس نیام فاذا ماتوا انتبھوا" حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا مقولہ ہے نہ کہ حدیث شریف۔

(ادارہ)

حضرت مولانا محمد اشرف سلیمانی
صدر شعبۂ عربی، پشاور یونیورسٹی

حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک کا اثر پشتو ادب پر

حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک نے اردو ادب پر جو اثر ڈالا اسے دنیا جانتی ہے اور موجودہ مذاکرہ میں بھی آپ اس پر متعدد وقیع مقالات سُن چکے بہتر ہے کہ اس عظیم محفل میں صوبہ سرحد کی اس سرزمین کی زبان پشتو پر جو اس تحریک کے اثرات مرتب ہوئے اس کے بارے میں مختصر چند کلمات عرض کر دیے جائیں۔

میرے دوستو! یوں تو پٹھان اور ان کی سرزمین سرحد حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت کی وجہ سے بدنام ہے۔ گو کہ موصوف نے اسی سرزمین کو اس کی ایمانی حرارت و جذبۂ جہاد کی بناء پر اپنے پہلے کیمپ کے طور پر منتخب فرمایا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ چند غدّار خوانین اور نوابوں اور ان کے مفاد پرست حامیوں کے علاوہ پورا علاقہ حضرت امیر شہید رحمۃ اللہ علیہ کا حامی تھا اور اس نے آپ کی مدد کو اپنی سعادت سمجھا جنگوں میں آپ کے شانہ بشانہ لڑے اور آپ کی تحریک کو خوش آمدید کہا، مجاہدین نے بالاکوٹ کے مقام پر اپنے خون سے جو نقوش ثبت کیے تھے پشتو ادب نے اُسے نظم و نثر میں قلمبند کیا اور اس خونیں اور جانبازی کی داستان نے بزمیہ شاعری کی جگہ رزمیہ شاعری کو وجود بخشا جو پٹھانوں کے مجاہدانہ کردار کی آئینہ دار تھی، جنگ نامہ، چار بیتے، ٹپے، غزل، نیمکئی، بدلہ[1] سب اصناف شاعری جنگ و جہاد کے جذبات سے بھرپور ہو گئے، چونکہ پٹھانوں کا عمومی مزاج جہاد و قتال کا خوگر ہے، اس لیے

---

[1] یہ سب پشتو شاعری کے مشہور اصناف سخن ہیں۔

نہ صرف حضرت امیر شہید رحمۃ اللہ علیہ کے کارناموں کو پشتو شاعری میں اُجاگر کیا گیا بلکہ اپنے مجاہد مرشدوں اور رہنماؤں کے واقعات کو بھی رزمیہ شاعری کی زینت بنایا اس قسم کے سیکڑوں چار بیتے اور بدلے لکھے گئے جو مردانہ مجالس اور حجروں میں گائے جاتے تھے اس کے علاوہ گھروں میں گائے جانے والے گیتوں اور سندروں میں بھی یہی روح کار فرما ہوگئی اور گھروں میں بھی یہی آتشیں مجاہدانہ نغمے یا "رجزیہ" اشعار پڑھے جاتے تھے۔

حضرت امیر شہیدؒ کی تحریک نے جو جذبۂ جہاد پیدا کیا تھا اور اسی جذبہ نے جیسے پشتو شاعری میں چار بیتہ اور دیگر اصناف سخن کو ان کے کارناموں سے گرانبار کیا تھا اسی طرح بعد کے ہونے والے دینی معرکے اور جنگیں عوامی شعراء کا عنوان و مشق سخن بن گئیں چنانچہ پہلے سکھوں اور پھر انگریزوں کے خلاف جنگیں اخوند صاحب سوات کی سرکردگی میں ہوئیں جن میں باجوڑ اور اسمار سے لے کر کابل تک کے پٹھانوں نے حصہ لیا اور ان چار بیتوں کا موضوع بن گئیں اسی طرح کابل، ڈکہ، ارناوی گداو، ملاکنڈ، چکدرہ، کامرانی یتراہ کے انگریزوں کے خلاف معرکے، بڑے ملا صاحب، چکنور ملا صاحب اور عمرا خان کے جہاد ان چار بیتوں کا پُر لطف اور زوردار مضمون ہے اور پشتو ادب کا وہ جاندار حصہ ہیں جس نے پٹھانوں میں جذبۂ جہاد اور استعماریت کے خلاف سرفروشی کو زندہ رکھا اور اسے دوام بخشا بلکہ پشتو چار بیتہ اور بدلہ نے ملی طور پر اسلامی اور دینی جذبے کو استوار رکھا اور اسے مزید توانائی بخشی۔ چار بیتہ کی یہی کیفیت دگر اصناف شاعری ٹپہ، بدلہ اور نیمکئی وغیرہ میں سرایت کر گئی اور آگے بڑھ کر جب سیاسی تحریکوں کا دور آیا تو چار بیتہ وغیرہ نے وہاں بھی وہی کردار ادا کیا غرض پشتو ادب کے اس پُرزور محرک نے اس خطے کی تاریخ سیاست اور شخصیات پر گہرا اثر ڈالا۔

یہ چار بیتے عربی جاہلی شاعری کی طرح لوح و قلم کی بجائے انسانی حافظے پر مرتسم ہوتے تھے پٹھانوں کے اس وسیع خطے میں جو جنگیں پہلے سکھوں اور پھر انگریزوں سے ہوئیں عصری شعراء کا موضوع بن گئیں اور انھوں نے اپنے مجاہدانہ جذبات کو چار بیتوں کی صورت میں پیش کیا اس دور کے متعدد شعراء مثلاً برہان اخون، نوردین اخون، گل محمد، احمد گل، حمید اخون علی خان، مقصود گل محمد دین، اکبر شاہ، نواب خان، نورعلی شاہ، طالب گل پایاؤ، میاں عنوان الدین، عبداللہ اخون، غریبے، محمود، غازی الدین ارسلا اخون، عبدالغفار،

ے پشتو گیت

عیسیٰ اخون زادہ، توکل، شاہ گل، ناصر سکیا، گل محمد ڈوڈیال والے، میر افضل، علی خان اخون، امانت اخون، بہرام، برآور، دوستم، عجم، بنیری، حمید گل، مجید شاہ، میرا باجی، میر عبداللہ، میاں رجب، محمد جی، محمد جان، میر محمد، قاسم، سید احمد، سید کمال، یاسین، محمود جان کریم، ظریف خان پشاوری، سراج بنوں والے وغیرہ نے ہر اس جہاد کو جو کسی خاص اہمیت کا حامل تھا اپنے پُر لطف اور جاندار چار بیتوں سے عامۃ الناس میں دوام بخشا اسی طرح یہ رزمیہ چار بیتے پٹھانوں کی مجاہدانہ زندگی کا سامان اور ان کی تاریخی تگ و تاز و جنگی مہمات کا دلچسپ مرقع بن گئے جس میں ان کی تاریخ دمکتی دکھائی دیتی ہے۔

اس رزمیہ شاعری اور مجاہدانہ ترانوں کی ابتدا چونکہ حضرت امیر شہید رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت اور ان کے ذوقِ جہاد کی مرہون منت ہے اس لیے یہ بات برملا کہی جا سکتی ہے کہ بالاکوٹ کی بلندیوں پر جن شہدا کا پاک خون گرا تھا وہ کسی صورت رائیگاں نہیں گیا بلکہ اس خطے میں جہاد و حریت کے جس پودے کو انھوں نے لگایا تھا اس کی پیہم آبیاری کرتا رہا اور انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ بھی کرتا رہے گا اور یہ شجر ہمیشہ برگ و بار لاتا رہے گا اور اس کے اثرات ملت کو حیات تازہ کا پیغام بخشتے رہیں گے۔

سرِ خاکِ شہیدے برگ ہائے لالہ می پاشم
کہ خونش با نہال ملت ما سازگار آمد

کیا یہ جذبۂ جہاد افغان مجاہدین کی موجودہ کامرانیوں میں نہیں دیکھا جا سکتا۔ مجاہدین کی تعریف میں جو چار بیتے لکھے گئے ظاہر ہے وہ سب اس مختصر مجلس میں نہیں پیش کیے جا سکتے نمونۃً دو ایسے چار بیتے پیش کرتا ہوں جو مدتوں عوام و خواص کی محفلوں میں پڑھے جاتے رہے۔

لہ ھندہ دی راغلی پہ غزا ئیسے سفر کہ
لہ ھندہ دی راغلی خو وطن ئے بریلی
اوس ناست دی پہ ملکا کبن جوړ دوئی گولئ
پہ ډاګہ ورتہ ناست دی ثنا د پاک اکبر کہ
لہ ھندہ دی راغلی پہ غزا ئیسے سفر کہ

(ہند سے آکر انھوں نے جہاد کے لیے سفر اختیار کیا اگرچہ ان کا وطن بریلی ہے مگر ملکا میں بیٹھ کر کارتوس بنا رہے ہیں، وہ کھلے میدان میں بیٹھ کے اللہ پاک کی ثنا کرتے ہیں۔

Jamia Na
New

ہیں کہ آگر انھوں نے جہاد کے لیے سفر اختیار کیا ہے)۔
ایک طویل سات بندوں پر مشتمل چار بیتہ گل محمد شاعر نے حضرت سید احمد شہید کے بارے
میں کہا ہے:

سید احمدؒ بادشاہ دِ بولی بہرام خان مولوی
پہ کنھار جنگ دے کنھار شہ پہ تا بوستان مولوی

(اے مولوی بہرام خان! تمھیں سید احمد بادشاہؒ بلا رہے ہیں۔ کنھار (ہزارہ) پر جنگ ہو رہی۔ اے مولوی! کنھار تجھ پر گلستان ہو جائے)۔

سید احمدؒ بادشاہ دِ بولی څنګه حال دے نا
دہ وے مردودو وھم را کرے خدائے اقبال نا
دَ اسلام ننگ نشتہ غالب خلق ارزال دے نا
دَ زیړو توپے خلاصیدے پر شہینان مولوی

(اے مولوی بہرام خان! تمھیں سید احمدؒ بادشاہ بلا رہے ہیں کہ کیا حال ہے۔ انھوں نے مردودوں سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اقبال مند بنایا ہے۔ اسلام پر آج کوئی غیرت نہیں کر رہا کہ اکثریت رزیلوں کی ہے۔ اے مولوی! پیتل کے توپ داغے جا رہے تھے)۔

دَ زیړو توپے خلاصیدے چہ دزھارو ونا
مزکہ اسمان مشول ترکئی چہ دوند غبار و ونا
دہ مولوی صاحب پہ لاس کینے ذوالفقار و ونا
چہ لہ مردود سرہ ئیے شہ جنگ پہ سپین میدان مولوی

(پیتل کی توپیں داغی جا رہی تھیں جس سے گھن گرج پیدا ہو رہا تھا۔ اتنا دھند اور گرد وغبار تھا کہ زمین اور آسمان چھپ گئے تھے اور مولوی صاحب کے ہاتھ میں ذوالفقار تھی، جس وقت ان کی مردود کے ساتھ کھلے میدان میں جنگ ہو گئی تھی)۔

چہ لہ مردود سرہ ئیے شہ جنگ دَ لعل محمد قندھاری

سیلا نو ماتے چہ اوکړہ ولاړ حیران ګبری
د جنګ تدبیر برابر نہ شہ دادہ ورځ دلری

پورہ یئے نہ وژ دبل لار شہ ناصر خاں مولوی

(اور جس وقت لعل محمد قندہاری کی مردود کے ساتھ جنگ ہوئی، اور سادات کو پیچھے ہٹنا پڑا اور گبری حیران کھڑے تھے اور جنگ کی تدبیر اس دن کی راس نہیں آئی کہ وہ دن پیچھے ہٹنے کا تھا اور ناصر خان مولوی میدانِ جنگ سے زخمی چلے گئے کہ اس کا وقت پورا نہیں ہوا تھا)۔

دا ناصر خان غازی د تورے یو مزرے و دخلقہ
غازیانو هیڅ کے ونہ کړو دیرلبے و و خلقہ
تلی یئے د کړہ چہ پہ نورم ګبرے وو خلقہ

دیرے یئے پور تہ کړے رواں چہ مشول سیدان مولوی

(یہ ناصر خان غازی تو تلوار کے ایک شیر تھے۔ اس دن دھوکہ ہوا اور نہ غازیوں نے تو کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی اور جو بھی گبری تھا اس نے دھوکہ کیا۔ اے مولوی! سب نے ڈیرے اٹھا لیے جب سادات روانہ ہو گئے)۔

سید احمد بادشاہ روان شہ کوز شو نګرے و تہ
کفار پرے دیر مشول غلبہ غوبرا شہ جرے و تہ
حورو پیالے راوړے شہ ور د جنت لرے وتہ

خدائے دِ لہ سیلے تاسو کاندے جنتیاں مولوی

(سید احمد بادشاہ شونگرہ پایاں روانہ ہو گئے کہ ان پر کفار بہت غالب آگئے اور حوروں نے ان کو پیالے لاکر دیئے اور جنت کے دروازے ان کے لیے کھل گئے۔ اے مولوی! اللہ تعالیٰ آپ سب کو جنتی بنا دے)۔

ایک شاعر موئیزی نے ایک زوردار چار بیتہ لکھا جس کا پہلا شعر یہ ہے :

قاصد د بادشاہ راغئے یوسف زے اولمزیدو   بہ نیت د غزا لاړو پہ نومبار اور ژبیدو

(بادشاہ (سید صاحبؒ) کا قاصد آگیا تو تمام یوسف زئی مشتعل ہو گئے اور غزا کی نیت سے نوشہرہ جاکر (میدان میں) پھیل گئے)۔

تحریر: امیر البیان شکیب ارسلان
تلخیص و ترجمہ: مولانا نذر الحفیظ ندوی

سنوسی اور سنوسیت

(۲)

قبل اس کے کہ سیدی احمد الشریف کے عم زاد سیدی ادریس سے انگریزوں نے کن شرائط پر صلح کی اور کس طرح کا غدر مسلمانوں کے ساتھ کیا گیا مناسب ہوگا کہ اٹلی نے طرابلس پر کیسے قبضہ کیا اور سنوسیوں کے ساتھ ان کی جنگ کیوں اور کیسے ہوئی، اس پس منظر پر روشنی ڈالی جائے، تاکہ سنوسیوں کی اصل طاقت، غیر معمولی اثرات اور مجاہدانہ کارناموں اور غیر معمولی قربانیوں کی جھلک آپ کے سامنے آجائے، دوسری طرف اطالوی فوجوں کی چیرہ دستیوں اور چنگیزیت کی داستان بھی مہذب دنیا کے سامنے آجائے گی۔

فرانس نے جب مصری اور سوڈانی سرحد پر واقع علاقہ فاشودہ پر قبضہ کیا تو انگریزوں نے اس پر شدید احتجاج کیا اور جنگ کی دھمکی دے دی، اگرچہ دونوں ملکوں کے درمیان جنگ کی نوبت نہیں آئی، لیکن دونوں نے خفیہ طور پر افریقہ کو آپس میں بندربانٹ کرلیا، یہ سن ۱۹۲۰ء کی بات ہے، فرانس نے انگریزوں کے حق میں سوڈان اور یوگنڈہ سے دست برداری حاصل کرلی، اس کے بالمقابل برطانیہ نے مراکش، شمالی افریقہ اور مغربی سوڈان کے علاقوں سے دستبرداری دے دی، افریقہ کی اسی تقسیم نے آگے چل کر پہلی جنگ عظیم میں اہم کردار ادا کیا ہے، چنانچہ جرمنی نے مراکش پر فرانسیسی اقتدار اور اٹلی اور اسپین نے بھی اعتراضات کیے اس کے نتیجہ میں جبل الطارق میں بڑی طاقتوں کے درمیان ایک خفیہ کانفرنس میں عرب دنیا کی تقسیم پر معاہدہ ہوگیا، اس کے نتیجہ میں استعماری طاقتوں نے اپنے اپنے علاقوں پر قبضہ کرلیا تو اٹلی نے بھی افریقہ میں اپنے حصہ کا مطالبہ کیا، اس کے بعد بھی اطالوی فوجوں نے مغربی طرابلس پر یورش کردی، عثمانی خلیفہ کو اٹلی نے مطلع کردیا کہ اگر ترکی طرابلس سے ہاتھ اٹھالے گا تو اس کا معاوضہ اٹلی پیش کردے گا،

اور طرابلس پر ترکی کی دینی سیادت و قیادت کو اٹلی باقی رکھے گا، اس صورت حال سے عالم اسلام میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی، طرابلس میں ترکی کی صرف چار ہزار فوج تھی جب کہ اٹلی نے ایک لاکھ فوج طرابلس اور برقہ پر قبضہ کے لیے اتار دی تھی، عثمانی حکومت نے طرابلس کے غیرت مند مسلمانوں پر اعتماد کر کے جنگ کرنے کا فیصلہ کر لیا، چنانچہ مالی اور فوجی امداد ترکی سے پہنچنے لگی، انور پاشا مصری حدود کے راستے جبل اخضر تک بھیس بدل کر پہنچ گئے، جب کہ علی فتحی تونس ہوتے ہوئے طرابلس اور برقہ پہنچ گئے، تونس اور مصر کے عوام نے ہر طرح سے امداد کا وعدہ کر لیا اور عالم اسلام کے دوسرے خطوں سے بھی مالی امداد آنے لگی، اس صورت حال سے اٹلی پریشان ہو گیا اس نے پہلے اندازہ لگایا تھا کہ پندرہ دن میں طرابلس اور برقہ پر قبضہ کرے گا لیکن مکمل بیس سال تک یہ جنگ طویل ہو گئی اور اسی وقت اطالوی فوج کا قبضہ ہوا، جب مشہور مجاہد عمر مختار شہادت کے خلعت سے سرفراز ہو گئے، اس طویل جنگ میں ایک لاکھ پچاس ہزار اطالوی فوجی مقتول ہوئے، تین سو ملین اسٹرلنگ پونڈ کے اخراجات ہوئے، عمر مختار کی شہادت کے بعد ہی اطالوی فوجوں کا قبضہ پورے لیبیا پر مکمل ہو گیا اور ادریس سنوسی سے اطالوی حکومت نے جو معاہدہ کیا تھا اس کی بھی اس نے خلاف ورزی کی اور بڑے پیمانے پر ایسی قتل و غارت گری اور تباہی پھیلائی کہ انسانیت کا سر شرم سے جھک جائے بلکہ چنگیز کی پیشانی بھی عرق آلود ہو جائے۔

طرابلس پر قبضہ کرتے ہی اطالوی کمانڈر نے پہلے ہی مرحلہ میں بغیر کسی عدالتی کارروائی کے بیس ہزار بے گناہ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، خواتین کی بڑی تعداد کو دس دن تک بغیر کسی لباس کے صحرائی میدان میں رکھا گیا اس کے بعد انھیں بچوں سمیت سولی پر لٹکا دیا گیا، کتنوں کو رسّی سے باندھ کر اجتماعی طور پر سمندر میں ڈال دیا گیا، برقہ کے علاقہ میں جبل اخضر سرسبز و شادابی میں بے نظیر علاقہ تھا وہاں سے ۸۰ ہزار عرب باشندوں کو صحرائے سرت بھیج دیا گیا، جہاں ان کی بڑی تعداد ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئی، بچوں کو عیسائی بنانے کے لیے اٹلی بھیج دیا گیا، نوجوان لڑکیوں کی عصمت دری کر کے ان کو گولی مار دی گئی اور جبل اخضر کی تمام زرخیز زمین اطالوی فوجوں میں تقسیم کر دی گئی۔ ۱۲ر جنوری ۱۹۳۱ء میں اطالوی فوجوں نے واحۃ الکفرہ پر قبضہ کیا تو تین دن تک اطالوی فوجوں کو قتل و غارت گری کی کھلی چھوٹ دے دی گئی، واحۃ الکفرہ کے نوجوانوں کو جبری طور پر فوج میں بھرتی کر دیا گیا جب کہ بوڑھوں اور عاجزوں کے (ہاتھ) پاؤں باندھ کر صحرا میں مرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا، جوان لڑکیوں کی عصمت دری کی گئی بعد میں ان کو بھی قتل کر دیا گیا،

سنوسیوں نے برقہ میں ایک بڑی خانقاہ تاج کے نام سے تعمیر کی تھی، وہاں قرآن مجید کی بے حرمتی کی گئی، مسجد میں شراب کے پیالے لنڈھائے گئے، ان ہی مساجد میں عصمتیں لوٹی گئیں فوائد قبیلہ کے سربراہ شیخ سعد اور دیگر پندرہ آدمیوں کو ہوائی جہاز سے نیچے گرا دیا یہ سب ان کے قبیلہ کے افراد کے سامنے ہوا، ایک دوسرے قبیلہ کے مشہور سردار کو دو جیپوں کے درمیان باندھ کر مخالف سمت میں جیپ چلادی گئی، اس سے ان کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے، ہسپتالوں سے مریضوں اور حاملہ خواتین کو اٹھا کر صحرا میں ڈال دیا گیا، تین دن میں چار ہزار عربوں کو گولیوں سے ختم کیا گیا، شیر خوار بچوں کو ماؤں کے سامنے ذبح کیا گیا، عصمت مآب خواتین کی عزت ان کے گھر والوں کے سامنے لوٹی گئیں، جن گھروں کے متعلق اطلاع ملتی کہ ان میں عرب جمع ہیں یا ان کی عورتیں یا بچے وہاں موجود ہیں ان گھروں کو آگ لگادی جاتی، جو آگ سے گھبرا کر نکلتا اس کو گولی سے بھون دیا جاتا، اطالوی فوجی کمانڈر نے ایک اڑن دستہ مقرر کر دیا تھا جس کا کام یہ تھا کہ دیہاتوں میں جا کر بغیر کسی مقدمہ یا کارروائی کے پوری پوری بستیوں کو جلانے یا ان کے باشندوں کو پھانسی دینے کا فیصلہ کر دیتا۔

یہ وہ حالات تھے جس کی بنا پر سنوسیوں نے ایک عارضی صلح پر رضامندی قبول کر لی تھی۔

صلح کی گفتگو میں یہ شرط رکھی گئی کہ ادریس بن مہدی برقہ اور جبل اخضر شہر پر قابض رہیں گے، مگر نوری اور ترک فوجیوں کو لیبیا سے نکال دیا جائے گا اور سیدی احمد السنوسی کو یہ مشورہ دیا جائے گا کہ اس علاقہ سے نکل کر کسی دوسرے منطقہ میں منتقل ہو جائیں، انگریزوں نے سیدی مہدی سے بھی کہا اگر سیدی احمد جغبوب میں مقیم رہے تو ان پر حملہ کر دیا جائے گا چنانچہ سیدی ادریس نے سیدی احمد کو اس صلح اور اس کے شرائط سے مطلع کر دیا، اس اطلاع کے ملتے ہی سیدی احمد الشریف نے جغبوب کو چھوڑ دیا اور وہاں سے بارہ دن کی مسافت طے کر کے اوجلہ تشریف لے گئے یہ ایسا صحرائی علاقہ ہے جو بے آب و گیاہ ہے، بدقسمتی سے یہ سخت گرمی کا زمانہ بھی تھا، تین ہزار فوجیوں کے ساتھ بغیر پانی کے ایک لمحہ بھی اس علاقے میں رہنا موت کو دعوت دینے کے برابر تھا اس اندیشہ سے کہ سنوسی خاندان میں کسی طرح کا تفرقہ نہ پیدا ہو، اس لیے اوجلہ سے بھی آگے سوگنہ کے علاقہ میں تشریف لے گئے، اس علاقہ کے سنوسیوں نے پوری طرح ان تین ہزار مجاہدین کی خاطر داری کی اور ان کو اپنا مہمان بنائے رکھا۔

دوسری طرف سیدی ادریس نے صورت حال کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ ایک طرف تو اطالوی

فوج سے ان کا واسطہ ہے دوسری طرف انگریزوں نے جبل اخضر اور مصر کے درمیان غذائی رسد کے راستہ کو مسدود کر دیا ہے اس سنگین صورت حال میں وہ صلح پر مجبور ہو گئے، اس صلح کے مطابق برقہ اور جبل اخضر پر ان کی امارت قائم ہو گئی اطالوی حکومت نے سنوسیوں کی فوج کو تنخواہ ادا کرنے کی ذمہ داری لی لیکن اس شرط کو اٹلی نے پورا بھی نہیں کیا بلکہ معاہدۂ صلح کو توڑ دیا، فاشستی وزارت کی تشکیل کے بعد سنوسیوں اور اطالوی فوج کے درمیان جنگ پھر بھڑک اٹھی۔ ادھر نوری اور ترک فوجی برقہ سے نکل کر مصراطہ شہر آئے جہاں رمضان شیتولی آمرانہ حکم چلا رہا تھا، رمضان شیتولی پہلے پہل اطالوی حکومت کا آلۂ کار تھا پھر اس کے خلاف ہو گیا اور اس نے مصراطہ کو بزور طاقت اطالوی فوج کے چنگل سے نکال کر خود اس پر قبضہ کر لیا، یہ ۱۹۱۵ء کی بات ہے، اس شکست فاش میں بارہ ہزار اطالوی فوج پیس کر رکھ دی گئی تھی، صرف پانچ سو فوجی زندہ بچ سکے لیکن وہ بھی صحرا میں بھٹکتے ہوئے مر گئے، اس معرکہ میں اطالوی فوج کا بھاری ساز و سامان عربوں کے ہاتھ لگا، لیکن فاشستی وزارت نے دوبارہ مصراطہ کو لشکر جرار بھیج کر واپس لے لیا، عربوں نے دوبارہ حملہ کر کے اس شہر پر قبضہ کر لیا ان تمام معرکوں میں رمضان شیتولی نے اہم کردار ادا کیا جس کو اس علاقہ میں سواحلی کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا، لیکن رمضان شیتولی کو مطیع و فرمانبردار بنانا بڑا مشکل کام تھا۔ وہ سنوسیوں سے خار کھاتا تھا، جب اسے نوری اور ترک فوجی افسروں کی آمد کا علم ہوا تو رمضان نے ان لوگوں کا پُرجوش خیر مقدم کیا اور نوری کو اپنی فوج کا کمانڈر انچیف بنا دیا، نوری نے ترکی واپس جا کر رمضان کی مالی امداد کی، بعد میں نوری اور عبدالرحمٰن عزام دوبارہ مصراطہ آئے اور انھوں نے رمضان شیتولی اور اورفلہ کے عوام کے درمیان صلح کرا دی اور اس کے بعد واپس ترکی چلے گئے، لیکن رمضان شیتولی نے اورفلہ پر اچانک حملہ کر دیا۔ اس معرکہ میں اورفلہ کے باشندوں نے سب سے پہلے کنوؤں کو بند کر دیا جس کی وجہ سے رمضان شیتولی کی فوج کا بڑا حصّہ پیاس سے مر گیا، خود رمضان شیتولی گرفتار ہوا، اس کے بعد اس کو قتل کر دیا گیا۔ لیکن اس واقعہ سے بھی پہلے کی بات ہے کہ جب سیدی احمد الشریف سنوسی اختلافات سے بچنے کی خاطر برقہ چھوڑ کر سوکنہ آ گئے، تو رمضان شیتولی نے اپنی فوج سنوسیوں سے مقابلہ کے لیے بھیج دی، اس فوج میں نوری اور دیگر ترک فوجی افسران تھے، سیدی احمد الشریف نے شیتولی کی فوج کو شکست دے دی، لیکن غذائی رسد نہ ہونے کی بنا پر پریشانی میں مبتلا ہو گئے، اس لیے کہ انگریزوں نے تجارتی

راستوں کو بند کر رکھا تھا اس صورت حال نے سنوسی فوجیوں کو غیر معمولی سنگین حالات سے دوچار کرا دیا۔ فوجوں نے آخر میں پتوں پر گزر بسر کرنا شروع کر دیا، تین ہزار مجاہدین میں سے بڑی تعداد بھوک پیاس سے مر گئی، سیدی احمد الشریف نے خود مجھ سے بیان کیا کہ میرے سامنے ہمارے بہترین مجاہدین بھوک پیاس سے جانیں دے رہے تھے، جغبوب واپس نہیں جا سکتے تھے کہ عم زاد سے اختلافات مزید بڑھ جانے کا اندیشہ تھا انگریزوں سے بھی بچنا ضروری تھا کہ جغبوب میں موجودگی پر انگریز حملہ کر دیتے مصراطہ جا نہیں سکتے تھے کہ رمضان شتیولی جیسا جانی دشمن موجود ہے مایوسی کے عالم میں انگریزوں سے صلح کا ارادہ کر لیا۔ استخارہ کی نیت سے اس شب لیٹا تو میں نے خواب میں سیدی احمد الریفی کو دیکھا، انھوں نے فرمایا کہ ہم لوگ آپ کا مقصد سمجھ گئے ہیں، انگریزوں سے صلح کو ہم لوگ پسند نہیں کرتے آپ اپنا کام از سر نو شروع کریں۔ نیند سے بیدار ہونے کے بعد میں نے صلح کا خیال ترک کر دیا، اس کے بعد میں نے انور پاشا کو ایک خط لکھا، اس کو ایک قاصد کے ذریعہ نوری کو بھجوا دیا کہ وہ بلا تاخیر اس خط کو انور پاشا تک پہنچا دیں۔ اس خط کا فوری جواب انور نے دیا۔ پھر میں اپنے رفقاء کے ساتھ ترکی روانہ ہو گیا۔

سیدی احمد الشریف نے سلوم کے زمانۂ قیام میں مجھے متعدد خطوط لکھے، ان خطوط میں انھوں نے نوری کے معاملہ میں اپنی ناپسندیدگی بلکہ ناراضگی کا اظہار کیا تھا، میں نے خود انور پاشا سے اس مسئلہ پر گفتگو کی اور کہا کہ آپ کے طرز عمل سے ایسا ظاہر ہوتا ہے جیسے احمد الشریف نے کسی قومی خیانت کا ارتکاب کیا ہے، انور نے کہا حاشا کلا ایسی بات ہرگز نہیں، لیکن یہ ضرور ہے کہ انگریزوں سے وہ دھوکہ کھا جاتے ہیں، میں نے کہا کہ ایسی بات نہیں، انگریزوں سے دل داری اور مدارات کی باتیں کیا کرتے تھے تاکہ ان کے شر سے محفوظ رہیں کہ ان کے پاس بڑی طاقت ہے، اگر ہم ان سے لڑیں گے تو کس بنیاد پر لڑیں گے، میں نے انور پاشا کو شیخ سنوسی کے حوالہ سے انگریزی افواج اور سنوسیوں کے درمیان مرسیٰ مطروح میں معرکہ آرائی کی تفصیلات بتاتے ہوئے کہا کہ ان دنوں شیخ کے پاس بارہ ہزار فوجی تھے ان میں سے پانچ ہزار کو مصری سرحد کی طرف بھیج دیا تھا، اس میں سے بھی اس کی نصف تعداد مرسیٰ مطروح میں نوری کے زیر کمان تعینات کی گئی، باقی ڈھائی ہزار شیخ کی قیادت میں رہی، سب سے پہلے انگریزوں نے جعفر پاشا اور نوری کی قیادت میں موجود فوجیوں پر یورش کی، انگریز فوجیوں کی تعداد پانچ ہزار تھی ان کے ساتھ گھوڑسوار اور پیدل فوج کے علاوہ توپ خانہ بھی تھا، دس گھنٹے تک مسلسل خوں آشام جنگ ہوتی رہی، اس میں انگریزوں کے چار سو فوجی مقتول اور مجروح ہوئے

اس صورت حال کو دیکھ کر انگریز پیچھے ہٹ گئے، نوری پاشا اور جعفر پاشا نے بھی اس موقعہ کو غنیمت سمجھ کر پیچھے ہٹنے میں مصلحت جانا، مجاہدین کی جماعت میں ڈیڑھ سو شہید اور زخمی ہوئے۔

دوسرے معرکہ میں شیخ سنوسی کی فوجوں پر انگریزوں نے حملہ کیا، یہاں بھی ان کی تعداد پانچ ہزار تھی، مرسیٰ مطروح کی اس جنگ میں ستّر مجاہدین شہید ہوئے جب کہ انگریزوں کا جانی نقصان غیر معمولی ہوا، شب میں بارش ہو گئی جس کی وجہ سے انگریزی فوج کا توپ خانہ دلدل میں پھنس کر رہ گیا اور وہ دوبارہ حملہ آور نہ ہو سکے اس طرح بڑی مشکل سے مجاہدین انگریزوں کے حملے سے بچنے میں کامیاب ہوئے۔

(جاری)

اعلان ملکیت و دیگر تفصیلات

فارم ۴ رول ۸

مقام اشاعت: جی ۱/۲۷۸ اوکھلا، پوسٹ جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

مدت اشاعت:	ماہانہ	پبلشر:	طٰہٰ عبداللہ
ایڈیٹر:	خواجہ احمد فاروقی	قومیت	ہندوستانی
قومیت:	ہندوستانی	پتہ:	اوکھلا، جامعہ نگر، نئی دہلی
پتہ:	جامعہ نگر، نئی دہلی	مالک:	طٰہٰ عبداللہ
پرنٹر:	طٰہٰ عبداللہ	قومیت:	ہندوستانی
قومیت:	ہندوستانی	پتہ:	اوکھلا، جامعہ نگر، نئی دہلی
پتہ:	اوکھلا، جامعہ نگر، نئی دہلی		

میں طٰہٰ عبداللہ تصدیق کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا امور میرے علم و یقین سے صحیح ہیں۔

(طٰہٰ عبداللہ)

ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی

قصیدۂ بُردہ

(۵)

وَبَاتَ ایوانُ کِسریٰ وَھُوَ مُنصَدِعٌ   کَشَملِ أصحَابِ کِسریٰ غَیرَ مُلتَئِمِ

[بَاتَ: أمسیٰ۔ شَمل: جمع۔ ملتئم من الالتئام: رأب الصدع]

(ایوان کسریٰ، کسریٰ والوں کے متحدہ گروہ کی طرح ٹوٹ کر بکھر گیا۔ ایسا شکستہ ہوا جوجوڑا نہیں جاسکتا)۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کے وقت جو معجزات سامنے آئے [جیسا کہ بعض لوگوں نے بیان کیا ہے، اور جس کی تاریخی تحقیق نہیں ہے] ان میں یہ بھی ہے کہ اس شب ایوان کسریٰ کے چودہ کنگرے گر گئے تھے۔ اس شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے مگر کنگرے گرنے اور ان کی تعداد کا ذکر نہیں ہے، صرف یہ کہتے ہیں کہ اس رات یہ ایوان اس طرح گر کر بکھر گیا جیسے اہل کسریٰ یا کسریٰ کی فوج جو پہلے ایک مضبوط و متحد محاذ تھا، آپس میں وہ لوگ لڑ کر ایک دوسرے سے جُدا ہو گئے اور متحد ہونے کی صورت میں جو ان کا رعب تھا اور ان کی وہ کیفیت جو ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کے مانند دکھائی دیتی تھی ختم ہوگئی، حضرت بوصیریؒ فرماتے ہیں جس طرح کسری کی فوج تتر بتر ہوگئی اسی طرح آج کی شب شاہ کسریٰ کا ایوان بھی منہدم ہوگیا اور ایسا منہدم ہوا کہ ان کے اجزا آپس میں جوڑ کر پھر سے کھڑے نہیں کیے جاسکتے۔ ایوان فارسی کا وہ لفظ ہے جو عربی میں قبول کر لیا گیا ہے، بارہ دری قسم کا دالان جس کے چاروں طرف یا دو طرف کھلے ہوئے ہوں اور اوپر چھت ہو، عموماً شاہانِ وقت کا تخت ایسی ہی جگہوں پر رکھا جاتا تھا۔ "شَمل" مجموعہ یا گروہ یا افراد کی متحدہ طاقت کو کہتے ہیں۔ حدیث سے

ماخوذ دعائے قنوت میں حملہ آور کفار کے لیے کہا جاتا ہے "اَللّٰھُمَّ شَتِّتْ شَمْلَھُمْ" (اے اللہ ان کی گروہی قوت کو بکھیر دے)۔

والنارُ خامِدَۃُ الْاَنْفَاسِ مِنْ اَسَفٍ عَلَیْہِ والنَّھْرُ ساھِی العَین من سَدَم

(اور اس موقع پر آگ کی سانسیں (انفاس آتش) بہ سبب غم کے رک گئیں، اور نہر رنج والم کے مارے ایک کھلی اور جاگی ہوئی آنکھ کی طرح رہ گیا)۔

کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اس رات مجوسیوں کا آتشکدہ ٹھنڈا پڑ گیا، وہ آتشکدہ جس میں شعلے ہمیشہ بھڑکتے رہتے تھے، اور غم سے نہر (فرات) ایسا خشک ہوا جیسے کسی کی خشک آنکھ پھٹی کی پھٹی رہ جائے کہ یہ کیا ہو گیا؟۔

یہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اس رات آتش مجوسیت ٹھنڈا پڑ گیا اور دریائے ساوہ خشک ہو گیا، الباجوری نے اپنی شرح میں لکھا ہے کہ یہاں نہر سے مراد فرات ہے، اس شعر میں دو استعارے ہیں آگ کے ٹھنڈے پڑنے کے لیے اس کی سانسوں کا رک جانا، اور خشک ہونے کے لیے آنکھوں کا خشک ہو کر کھلا رہنا، عربی میں خمد کے معنی ہیں شعلوں کی بھڑک کا ختم ہو جانا، بالکل بجھ جانے کے لیے ھمد بولتے ہیں۔ مگر یہاں پر شاعر حضرت بوصیری کی مراد آگ کا بجھ جانا ہی ہے، سَدم (ھَمٌّ مع الندم) حسرت وغم۔

وسَاءَ سَاوَۃَ اَنْ غَاضَتْ بُحَیْرَتُھَا وَرُدَّ وَارِدُھَا بِالْغَیْظِ حِیْنَ ظَمِیْ

(ساوہ کے لوگوں کو ان کی نہر کا خشک ہو جانا بہت سخت محسوس ہوا، جب کہ پانی پینے، پلانے والے غم وغصہ میں بھرے (نامراد) واپس گئے)۔

"ساوہ" ایک بستی کا نام ہے جو ہمدان اور رَے کے درمیان واقع ہے، یہاں کے لوگ جس دریا سے پانی پیتے تھے وہ اس رات خشک ہو گیا تھا، لہٰذا کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ساوہ نامی بستی کی نہر بھی خشک ہو گئی، اور وہاں کے باشندوں نے جب اپنی نہر کو خشک پایا تو بہت غضب ناک ہو گئے، یہ وہی ساوہ ہے جس کو اردو میں دریائے 'سادہ' (دال کے ساتھ) لکھا گیا ہے، ممکن ہے (و) اور (د) کے درمیان تشابہ ہو گیا ہو، قلمی کتابوں میں تصحیف[1] بہت ہوتی ہے، مگر باجوری کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حرف واؤ ہے

---

[1] کتابت میں بعض حروف غلط لکھ جاتے ہیں۔ قلمی کتابوں میں اس طرح کی غلطیوں کو تصحیف کہتے ہیں۔

نہ کہ واہل۔ عربی ترکیب کے لحاظ سے سَاءَ (ماضی) کا فاعل "أَنْ غَاضَتْ بُحَيْرَتُهَا" ہے اور مفعول مقدم سَاوَةَ ہے جو ایک بستی کا نام ہے مگر مقصود اہل بستی ہیں جیسے قرآن کریم میں ہے" واسأل القریۃ التی کنا فیھا" (اس گاؤں سے پوچھ لیجیے جہاں ہم تھے)۔ یعنی گاؤں والوں سے معلوم کر لیجیے۔ یہاں بھی یہی کہنا ہے کہ بستی ساوہ کو نہیں بلکہ اس بستی میں رہنے والوں کو بُرا لگا۔

كَأَنَّ بِالنَّارِ مَا بِالْمَاءِ مِنْ بَلَلٍ حُزْنًا، وَبِالْمَاءِ مَا بِالنَّارِ مِنْ ضَرَمٍ

(غم سے گویا آگ میں وہ بات ہے جو پانی کی تری میں ہے، اور پانی میں وہ کیفیت ہے جو آگ میں گرمی کی ہے)۔

کہنا یہ چاہتے ہیں کہ آتش مجوسیت ایسا سرد ہوا کہ گویا اس میں پانی کی خاصیت آگئی، اور دریائے ساوہ ایسا خشک ہوا کہ جیسے آگ کا تنور بن گیا۔

غم سے مراد یہ ہے کہ جب دریا سے اس کی روانی اور آتش سے اس کی گرمی چھین لی گئی تو اس کو اپنی قلب ماہیت کا صدمہ ہوا۔

(نحوی اعتبار سے کَأَنَّ کا اسم ما (موصول) بالماء مؤخر ہے، اور بالنار خبر مقدم ہے۔ من بلل/من ضرم بیانیہ ہے)۔

شارح باجوری نے قدماء کی عادت کے مطابق یہ طے کر لیا ہے کہ ہر لفظ بہت ناپ تول کر اور تمام معنوی خصائص اور شرعی رعایتوں کے ساتھ نظم کیا گیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ شاعر نے پانی کی صفت بَلَل (تری) لکھا اور 'برد' (ٹھنڈک) نہیں لکھا کیونکہ تری۔ یا تر ہونا بھیگنا آگ کو اس کی حقیقت سے نکالتا ہے۔ بخلاف 'بَرد' کے جو آگ باقی رہتے ہوئے بھی ممکن ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں آیا ہے "یا نار کونی بردًا وسلامًا" (اے آگ ٹھنڈک اور سلامتی بن جا)۔ اسی طرح پانی کو اس کی خاصیت آبی سے نکالنے والی شے اضطرام (بھڑکنا) ہے، حرارت نہیں ہے، پانی جو گرم ہو جاتا ہے اس کو مَاءٌ حَارٌّ بولتے ہیں، ماء مضطرم نہیں کہتے، کیونکہ اس کا مطلب ہوتا کہ پانی شعلہ بن گیا۔ اسی طرح قدماء کا ایک طریقۂ تفہیم یہ بھی ہے کہ خود ایک اعتراض قائم کرتے ہیں اور اس کا جواب دیتے ہیں تاکہ اگر کسی کے ذہن میں اس طرح کی بات آئے تو اس کو جواب مل جائے، اگر بغیر اعتراض نقل کیے ہوئے جواب دے دیا جائے تو اس کے لیے دفع دخل کہتے ہیں۔ چنانچہ اوپر "بلل" اور "ضرم" کے

ضمن میں جو کہا گیا وہ " دفع دخل " تھا۔ اب ایک اعتراض سنیے :

پانی اور آگ تو جمادات کی قسم میں ہیں، ان کو غم یا خوشی ہونا کیا معنی، یا قانون تکوینی کے پابند ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے " وان من شیٔ الا یسبح بحمدہ " ہر شے اللہ کے حمد کی تسبیح پڑھتی ہے) اور موقع تو یہ تھا کہ پانی اور آگ کو خوشی ہوتی نہ کہ غم۔

جواب : آگ اس لیے غم گین ہے کہ اس کے مزاج کی آتشیت سے اس کو محروم کر دیا گیا اور پانی اس لیے رنجیدہ ہے کہ اس کی صفت آبی جاتی رہی، اور رنج و غم سے مراد ان کی ماہیت کا تبدیل ہو جانا ہے، جو غم کے مشابہ ہے، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ' آگ کے غم ' سے مراد آگ والوں مجوسیوں کا غم ہے، پانی کے رنج سے مقصود دریا پرست قوم کا رنج ہے۔

یہ شرح اس لیے نقل کر دی گئی کہ ہمارے قدیم بزرگوں کا انداز شرح معلوم ہو، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ یہ دور از کار باتیں ایسی ہیں جو خود شاعر حضرت بوصیریؒ کے ذہن میں نہ ہوں گی۔

وَالْجِنُّ تَهْتِفُ وَالْاَنْوَارُ سَاطِعَةٌ وَالْحَقُّ يَظْهَرُ مِنْ مَعْنًى وَمِنْ كَلِمِ

"(ولادت باسعادت کی خوشی میں) اور جن آواز دینے لگے، روشنیاں کھل کر سامنے آگئیں، حق لفظ و معنی سے آشکار ہو گیا۔"

قرآن کریم سے جن کا ایمان لانا، قرآن سننا، اور اس کی تعلیمات کو اپنے ساتھیوں میں بیان کرنا ثابت ہے :

" قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا "

(اے پیغمبر ! لوگوں سے کہہ دو کہ میرے پاس وحی آئی ہے کہ جنوں کی ایک جماعت نے اس کتاب کو سنا، تو کہنے لگے ہم نے ایک عجیب قرآن سنا)۔

اور چند آیت کے بعد اسی سورت میں ہے :

" وَاَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰى اٰمَنَّا بِهٖ "

(اور ہم نے جب ہدایت کی کتاب سنی اس پر ایمان لے آئے)

لہٰذا کائنات کی مسرت عام کے موقع پر اگر وہ بھی فرحاں و شاداں ہوں اور ان کی مسرت سے آواز

گونج رہی ہو تو کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ اور ہر طرف نور ہی نور کا عالم ہونا، اور لفظ و معنی سے صداقت آشکار ہونا، نفاق و کذب کا تاراج ہونا، یہ سب اگرچہ شاعرانہ تخیل ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک پر جن کی نظر ہے اور اس سیرت کے اثرات جو دنیا پر مرتب ہوئے ان کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دنیا میں صداقت کا نور جتنی قوت کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد چمکا اس سے پہلے کبھی نہیں ظاہر ہوا تھا۔

عَمُوْا وَصَمُّوْا فَاِعْلَانُ الْبَشَائِرِ لَمْ ۔۔۔ تُسْمَعْ، وَبَارِقَةُ الْاِنْذَارِ لَمْ تُشَمِ

مِنْ بَعْدِ مَا اَخْبَرَ الْاَقْوَامَ كَاهِنُهُمْ ۔۔۔ بِاَنَّ دِيْنَهُمُ الْمُعْوَجَّ لَمْ يَقُمِ

"(دشمنانِ دین) اندھے اور بہرے ہو گئے اس لیے خوش خبریاں نہیں سنی گئیں اور انجام سے آگاہ کرنے والی بجلی کی چمک نظر نہیں آئی۔ اور جب کہ لوگوں کو ان کے کاہنوں (آئندہ کی خبر دینے والوں) نے بتادیا تھا کہ ان کا غلط مذہب اب قائم نہ رہ سکے گا۔"

ان دونوں اشعار میں "دفع دخل" ہے کہ جب یہ کہا جارہا ہے کہ ولادت باسعادت سے سارا عالم روشن ہو گیا تو پھر کفار مکہ نے کیوں اس روشنی سے فائدہ نہیں اٹھایا، اور کفر و گمراہی پر کیوں لوگ مُصر رہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ روشنی تو بے شک موجود تھی مگر دشمنانِ دین کی نگاہوں کو قلب کی ظلمتوں نے اندھا کر دیا تھا کہ وہ دیکھ نہیں سکتے تھے، اور بشارتوں کے اعلان سننے کی ان میں طاقت نہ تھی۔

لم تشم کا مادہ شام یشیم شیما، جس کے معنی ہیں بجلی کی چمک دیکھنا، اس شعر میں لف و نشر معکوس ہے، عَمُوْا (اندھے ہوگئے) اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آگاہی دینے والی بجلی نہ دیکھ سکے، اور صَمُّوْا (بہرے ہو گئے) کا نتیجہ یہ ہے کہ اعلان بشارت نہ سُن سکے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے پہلے آپؐ کی بعثت کی خبر ان کی آسمانی کتابوں میں موجود تھی اور ان کے علمائے دین اور کاہنوں (جو آئندہ کی خبریں دیا کرتے تھے) نے بتادیا تھا کہ نورِ محمدی اس دنیا میں ظاہر ہو چکا ہے، اب باطل ادیان کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہ گیا ہے، مگر ان ظالموں نے ان سب کو فراموش کر دیا۔[1]

---

[1] آنحضرتؐ کی بعثت کی خبر پچھلی آسمانی کتابوں میں موجود ہے جس کو متعصب راہبوں نے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

وَبَعْدَ مَا عَايَنُوا فِي الْأُفْقِ مِنْ شُهُبٍ ۔۔۔ مُنْقَضَّةٍ وَفْقَ مَا فِي الْأَرْضِ مِنْ صَنَمٍ

حَتّٰى غَدَا عَنْ طَرِيْقِ الْوَحْيِ مُنْهَزِمٌ ۔۔۔ مِنَ الشَّيَاطِيْنِ يَقْفُوْا إِثْرَ مُنْهَزِمٍ

گزشتہ شعر من بعد ما عاینوا... الخ سے لفظاً و معنیً یہ اشعار مربوط ہیں۔

ترجمہ: "اس کے بعد بھی وہ اپنے کفر پر قائم رہے جب کہ انھوں نے افق پر تاروں کا ٹوٹ ٹوٹ کر گرنا دیکھ لیا، اور جس طرح اصنام ارضی ٹوٹ کر گرے اسی طرح اجسام سماوی بھی ریزہ ریزہ ہو گئے۔ اور وہ راستہ جو وحی کے آنے کا ہے اس راہ سے ایک شکست خوردہ دوسرے شکست خوردہ شیطانوں کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔"

ان دونوں شعروں میں قرآن کریم کی آیات کریمہ کی طرف اشارہ ہے شیاطین جو آگ سے بنے ہیں اور ان کو ہوا میں اڑنے اور پلکوں میں لاکھوں میل کی مسافت طے کرنے کی صلاحیت بخشی گئی ہے وہ سمار دنیا تک پہنچ جایا کرتے تھے اور فرشتوں کے درمیان ہونے والے چرچے سُنا کرتے اور اہلِ زمین کو رنگ آمیزیوں کے ساتھ بتایا کرتے ہیں۔

چھپ کر بات سننے کو 'استراق السمع' کہتے ہیں۔ یہ اس طرح کی بات ہے جس کے لیے آجکل مشینی دور میں EAVES DROPPING کی اصطلاح ہے، یعنی چھپ کر کسی کی بات براہ راست یا بذریعہ مشینوں کے سننا، شیاطین (جنوں) کا معمول تھا کہ وہ آسمانی خبریں سُن کر عوام میں غلط سلط بڑھا کر پھیلایا کرتے ان کو اس رات اس کام سے روک دیا گیا اور جو بھی اس کی کوشش کرتے ہوئے دیکھا گیا اس کو ایک شعلہ کے ذریعہ جلا کر خاک کر دیا گیا۔

ایک روایت یہ بھی الباجوری نے نقل کی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ہوئی تو تین اوپر کے آسمانوں سے ان کو نکال دیا گیا اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش ہوئی تو کل

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ):

نے مسخ کر دیا ہے اور وہ حصے حذف کر دیے ہیں جس میں قرآنی تعلیمات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے آگاہ کیا گیا تھا، "انجیل برنابا" کا مقدمہ جو اس کے عربی ترجمہ پر سید رشید رضا نے لکھا ہے اس میں تفصیل موجود ہے۔

آسمانوں سے ان کو باہر کر دیا گیا۔

دوسرے شعر میں جو لفظ ہے عن طریق الوحی کہ وہ اس راستے سے ہٹا دیے گئے جس سے وحی آیا کرتی تھی، 'حتی غدا' کے معنی ہیں 'حتی أصبح' اس کی خبر یقفوا ہے، یعنی ایک کا دوسرے کے پیچھے لگ جانا، (غدا منہزم یقفوا)

کأنَّھُمْ ھَرَبًا ابطالُ أبْرَھَۃٍ　　أوْعَسْکَرٌ بِالحصٰی مِنْ رَاحِتَیْہِ رُمِی

نَبْذًا بہٖ، بعدتَسْبِیْحٍ بِبَطْنِھِما　　نَبْذَ المُسَبِّح من أحشاءِ مُلْتَقِمٖ

[عربی داں حضرات کے لیے ضروری اشارات: کأنَّ کا اسم ضمیر ھُم (شیاطین)، خبر ابطال ابرھۃ۔ ھربا حال، عسکر معطوف علی ابطال۔ حصٰی جمع حصاۃ کنکریاں، راحۃ ہتھیلی ضمیر راجع: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم۔ رمی مجہول ماضی، ابرھۃ غیر منصرف ہے مگر ضرورت شعری کی وجہ سے منصرف کر دیا گیا۔ مسبح سے مراد حضرت یونس علیہ السلام، ملتقم جس نے حلق سے نیچے اُتار لیا ہو]

ترجمہ: "وہ نہ ماننے والے اس طرح بھاگے جیسے ابرہہ کی فوج کے بہادر سپاہیوں پر جب کنکریوں کی مار پڑتی تھی اس وقت بھاگے تھے یا اس فوج کی طرح تتر بتر ہو گئے جن پر غزوۂ بدر کے موقع پر (حسب روایت بخاری) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کنکریاں ماری تھیں، اور ان میں سے کوئی ایسا نہیں بچا جس کی آنکھ میں خاک نہ پڑی ہو۔ گویا وہ لوگ دستِ رسول پاکؐ کے اندر تسبیح پڑھنے والے کنکروں سے نابینا کر دیے گئے جس طرح حضرت یونسؑ نگل لینے والی (مچھلی) کے جوف سے نکال دیے گئے تھے جب کہ اس نے ان کو نگل لیا تھا۔"

ان دو شعروں کا تعلق اوپر کے دو شعروں سے ہے کہ آنحضرتؐ کی دعوت حق سے روگردانی کرنے والے وہ لوگ ہیں جنھوں نے نبوت کی نشانیاں دیکھیں مگر شیطانوں کی طرح بھاگ کھڑے ہوئے اور ایسے بھاگے جیسے ابرہہ کی فوج کے سورما اور رسول اللہؐ کے گھر کا گھیراؤ کرنے والے کفار بھاگے تھے اور وہ کنکر جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک سے جس طرح نکلے تھے یا جس طرح حضرت یونسؑ مچھلی کے پیٹ سے نکلے تھے۔

شیخ حمد الجاسر | ترجمہ: ضیاء عبد اللہ (جدہ)

علاّمہ عبد السّلام الدّرعی النّاصری کا
سفرنامۂ حج

(۱۰)

(آخری قسط)

عرفات:

سرِشام ہی منیٰ سے آٹھویں تاریخ کو ہم لوگ ناچار اور باحسرت و یاس، عرفات کی طرف روانہ ہو گئے تھے، اپنے وجود پر شرم آرہی تھی کہ ایک سنت قیامِ منیٰ کی چھوٹ گئی جو مدۃ العمر میں ایک ہی مرتبہ حاصل ہوتی ہے مگر بدامنی اور خوف و دہشت کا جو سماں تھا وہ بیان سے باہر ہے۔ ہم اہلِ مغرب کی ایک مختصر سی جماعت تھی، اور ہر قدم پر خطرہ تھا کہ کس پہاڑی کے کس موڑ سے لٹیرے بدّوؤں کا قافلہ اترے اور ہم سب کا کام تمام کر دے، چلتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے، گلوگیر آواز سے حمد و ثنا اور تکبیر پڑھتے جاتے تھے، اگر فریضۂ حج کی ادائیگی کے بعد یہ صورت حال پیش آتی تو جان کی پرواہ نہ کرتے، مگر لاچار تھے، فرض ارکانِ حج باقی تھے انہیں کی خیر منا رہے تھے، معلم صاحب (شیخ مصطفیٰ سنبل) نے پانی اور کھانے کی چیزیں ساتھ کر دی تھیں، خدا خدا کر کے اس پہاڑی پر پہنچ گئے جس کے نیچے عرفات کا میدان ہے، وہاں چند اشخاص نظر آئے اور آگ جلنے کے آثار دیکھ کر اطمینان ہوا، مگر دل مُرجھایا ہوا تھا۔ اگر عرفات کی حاضری منیٰ سے نماز فجر پڑھنے کے بعد ہوتی تو یہ ملال نہ رہ جاتا، بہرحال اللہ کی مرضی سے یہاں آئے ہیں اور اسی کے حکم کے مطابق چل رہے ہیں، نہ کہیں ٹھہرنا اپنے اختیار میں ہے نہ قیام کرنا، الحمد للہ کہ عرفات کے میدان ایسے وقت پہنچ گئے کہ رات کے دو پہر باقی تھے، عشا کی نماز ادا کی اور جس جگہ ٹھہرے وہ بارونق تھی، چند دوکانیں بھی

تھیں، اور پانی فروخت کرنے والے سقے بھی تھے، فجر کی نماز اطمینان سے ادا کی اور ظہر کی نماز عرفات کی مسجد نمرہ میں ادا نہیں کر سکے کیونکہ امام حنفی تھے جو ظہر و عصر جمع مقدّم نہیں پڑھا رہے تھے، بلکہ ہر نماز اپنے وقت پر پڑھایا کرتے تھے اور ہم اہلِ مغرب مالکیہ مذہب کے پیرو ہیں ہمارے یہاں عرفات کی خصوصیت یہ ہے کہ ظہر و عصر ایک ساتھ یکے بادیگرے ہوگی اور مغرب کی نماز بھی اس میدان میں نہیں پڑھی جائے گی۔ — نماز کے بعد امام نے حاضرین کو مسائل عرفات بتائے، امام صاحب کافی معمّر ہیں، اللہ ان کی عمر میں برکت دے اور معلوم ہوتا ہے کہ جزئیات فقہ پر ان کی نظر ہے مگر صرف اپنے ہی مسلک کے مسائل بیان کرتے ہیں۔

ہم لوگ ظہر و عصر کی نماز باجماعت ادا کر کے موقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف چل پڑے اور جبلِ رحمت کے نیچے آکر کھڑے ہو گئے، یہاں پر بھی چند دوکانیں ہیں، اور سقہ پانی فروخت کر رہے تھے، یہاں پر مصری، شامی، حجازی اور مغربی حجاج سب جمع تھے، سب کی تعداد دو ہزار سے اوپر ہی ہو گی، کچھ لوگ پہاڑ کے اوپر چڑھ گئے تھے، ان کو یاد دلایا کہ سنت اس پہاڑ کے نیچے کھڑا ہونا ہے مگر وہ ہماری باتیں سننے کے لیے تیار نہ تھے، یہاں بھی مسجد نمرہ کے امام موجود تھے، باوجود ضعیف العمر ہونے کے مسلسل وعظ کر رہے تھے اور درمیان میں تلبیہ بھی پڑھاتے اور جب تلبیہ پڑھنا چاہتے تو اپنے رومال کو اپنے سر سے اونچا کر کے اشارہ کرتے، لوگوں نے یہ سمجھا کہ تلبیہ کے وقت دامن یا رومال کو اوپر اُٹھانا سنت یا شعائر حج میں داخل ہے، لوگوں نے بدعات کے معاملہ میں بہت توسّع کو روا رکھا ہے۔

شیخ حمد الجاسر نے عرفات کا مختصر ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:

> "ہمارے سفرنامہ نگار (عبدالسلام الدرعی) موقف عرفات کا ذکر کرتے ہیں اس کے بعد مزدلفہ جانے اور وہاں رات گزارنے کا وصف بیان کرتے ہیں، پھر رمی جمرات، حلق، ذبح، طواف افاضہ کی داستان سناتے ہیں، اور یہ بتانا نہیں بھولتے کہ آپ کو طوافِ افاضہ کے بعد بخار آگیا تھا، صفرا کا زور تھا، اور سر و سینہ نزلہ سے بھر گئے تھے اور ان تکلیفوں سے ان کو کئی روز کے بعد نجات ملی، صفحہ ۲۴۹ سے ۲۵۱ تک یہی تفصیل ہے۔"

[دراصل مرتب سفرنامہ شیخ حمد الجاسر کے پیش نظر صرف جغرافیہ سے متعلق بیانات ہیں حاجی کے ذوق و وجدانیات کو نقل کرنا عبث سمجھتے ہیں، اس لیے ان تین صفحات کا ترجمہ اصل سفرنامے سے نقل کیا جا رہا ہے، مگر وہ مغربی رسم الخط میں ہے اس لیے بعض الفاظ صحیح نہیں پڑھے جاسکے]

صاحبِ سفرنامہ لکھتے ہیں:

ہم لوگ یوں تو راستہ بھر تلخ و شیریں، سخت و نرم حالات میں بھی اشعار کہتے آئے اور دوسروں کے کہے ہوئے اشعار دہراتے آئے مگر عرفات کے میدان میں کوئی شعر نہیں کہا کیونکہ جو وقت ملا اس کو ابتہالات و مناجات میں گزارنا مناسب سمجھا، دھوپ سخت تھی اور ہوا بھی گرم تھی، اور ہم لوگ احرام کی حالت میں تھے، سر پر کوئی سایہ نہ تھا، لیکن ساتھیوں کا حال یہ تھا کہ جیسے آنکھوں سے سیل رواں جاری تھا، جسم کپکپا رہے تھے، ہر ایک کی آواز بھرّائی ہوئی، اور آنکھیں سُرخ تھیں، یہ وہ لمحات تھے کہ ہم لوگ قطعاً بھول گئے تھے کہ یہاں کوئی جان و مال کو خطرہ ہے، اگرچہ وہاں سے نکلنے کے بعد احساس ہوا کہ خطرات ہمارے چاروں طرف منڈلا رہے تھے، تجدید وضو اور قضائے حاجت کے لیے بھی کوئی اپنی جگہ سے جاتا تو چار پانچ آدمیوں کی ٹولی ساتھ ہوتی اور اس کے دائیں بائیں، آگے پیچھے حصار بنا کر کھڑے ہو جاتے، خواتین کے لیے یہ دشواری زیادہ تھی کیونکہ وہ اگرچہ ٹولی بنا کر نکلتی ہیں مگر عورت کمزور ذات کی ہوتی ہے اگر خدانخواستہ ڈاکوؤں نے ان پر حملہ کیا تو وہ مدافعت نہیں کر سکتی تھیں، اس لیے ان کے محرم بھی ساتھ تھوڑے فاصلے سے کھڑے رہتے ہیں، میدانِ عرفات ہموار نہیں ہے، بلکہ اونچے نیچے ٹیلے ہیں، اور راستے اونٹوں کے نقش پا سے متعین کیے جاتے ہیں، ہم لوگ غروب آفتاب تک اسی طرح کھڑے رہے۔ دعائیں امام صاحب بھی کرا رہے تھے اور خود بھی کر رہے تھے، غروب سے پہلے ہی امام صاحب کا عمامہ ایک جگہ کھول کر ڈال دیا گیا جس پر لوگوں نے حسب توفیق سِکّے ڈال دیے، کسی نے گیہوں، آٹا، شکر اور پھل بھی ڈال دیے، امام صاحب چونکہ تنخواہ دار ملازم نہیں ہیں، اس لیے ان کی معاونت ضروری تھی اور سال میں ایک ہی موقع ملتا ہے کہ ان کی خدمت کی جائے اس لیے ہر حاجی اپنی حیثیت کے مطابق کچھ نہ کچھ خدمت کرتا ہے، امام صاحب ملک افغانستان کے رہنے والے ہیں، اور عرصہ سے مکہ مکرمہ میں رہتے ہیں، مکہ سے عرفات تک کی مسافت میں نماز قصر واجب نہیں ہوتی اس لیے ظہر اور عصر کی نمازیں انھوں نے علیحدہ علیحدہ اپنے وقت پر پڑھائیں، اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت دے

ہم لوگوں نے ان کے لیے برکت عمر کی دعا کی اور دعا کی کہ ان کو احادیث نبویہ کا علم حاصل ہو۔ ان کے تشدد کی وجہ سے ہم لوگ سنت جمع و قصر یا جماعت سے محروم رہے، مگر دل میں ان کی طرف سے کوئی بُرائی نہیں آئی، عرفات کے لیے دعائیں ہماری بیاض میں موجود تھیں، ان کا ایک ختم کیا مگر زیادہ تر لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہ یحیی و یمیت وھو علیٰ کل شئ قدیر اور شہادتین، اور تلبیہ پڑھتے رہے۔ دعائیں اپنے اموات کے لیے دل کھول کر مانگیں، خاص طور پر اپنی والدہ اور والد کی مغفرت کی دعائیں کیں، حرمین میں امن و امان قائم ہونے کی دعا کی، اور یہ دعا کی اے اللہ! اپنے شعائر کو باقی رکھنے کا فیصلہ فرمادے، جو حالات گزر رہے ہیں ان سے خطرہ ہے کہ حج میں آنا اور ندائے ابراہیمی پر لبیک کہنے کا رواج ماضی کی داستان نہ بن جائے، مگر اللہ ہر بات پر قادر ہے۔

بعد غروب ہم لوگ جبل عرفات (جبل رحمت) سے نیچے وادی میں اترے، اور مزدلفہ کی طرف کوچ کیا، چار گھنٹوں میں ہم لوگ مزدلفہ بخیر و عافیت پہنچ گئے، اب ہوا کی گرمی ختم ہو گئی، یہ دو متوازی پہاڑوں کے درمیان کی وادی ہے، اور ناہموار پتھروں سے گھری ہوئی ایک مسجد ہے جس میں کوئی محراب نہیں ہے، زمین پر بجری اور ریت بچھی ہوئی ہے، جو لوگ پہلے آگئے انھوں نے اپنی سواریوں کو اس چہار دیواری کے عقب میں کھڑا کیا اور ان کو چارہ دیا، اور مسجد میں اپنی جگہیں بنا لیں، بقیہ لوگ اس چہار دیواری کے باہر اپنے کمبل بچھا کر بیٹھ گئے۔ جن لوگوں کا وضو تھا انھوں نے آتے ہی مغرب و عشاء کی نمازیں ادا کیں، الحمد للہ کہ اس معاملہ میں حنفی بھی ہم سب کے ساتھ تھے، اور انھوں نے بھی مغرب عرفات میں نہیں ادا کی بلکہ جمہور مسلمین کے ساتھ مزدلفہ میں آکر پڑھی، اور عشاء کے ساتھ جمع کیا، اللہ کا شکر ہے کہ تمام حجاج ایک ہی جگہ جمع تھے اور وسط میں لکڑیوں کو جلا کر روشنی کر لی تھی اس لیے حملہ آور دل کا خطرہ نہ تھا، کھانا ہر ایک قافلہ کے ساتھ تھا، بحر ہند کے وسط میں سقوطرہ کے حجاج بھی تھے جو شہد اور خشک مچھلی کھا رہے تھے، مصری تو خشک نان پسند ہی کرتے ہیں، ہم مغاربہ اُبلے ہوئے چاول اور اُبلے ہوئے انڈے لے کر آئے تھے، جب مختلف انواع کے لوگ اپنے مختلف انواع کے کھانے لے کر ساتھ کھانے لگے تو اتحاد و یگانگت کا خوشنما منظر سامنے آگیا اور سب کی زبانوں پر اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ اللہ اکبر اللہ اکبر و للہ الحمد کا ورد تھا، لیکن احناف ابھی بھی تلبیہ پڑھ رہے تھے، ان کے یہاں تلبیہ رمی جمار کے ساتھ ختم ہوگا۔ ہم لوگوں کے یہاں مکہ مکرمہ میں

داخل ہوتے ہی ختم ہوجاتا ہے، اور عرفات میں بھی مسنون سمجھا جاتا ہے۔ بہرحال سب شعائرِ حج اور ندائے ابراہیمی کے پابند تھے، اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو توفیق دی وہ دعا و مناجات میں مشغول رہے اور کچھ لوگ سو گئے، کچھ لوگ پہرہ دیتے رہے، مقامی حکومت کی پولیس کا لوگوں کو قطعاً اعتبار نہیں ہے، یہ لوگ خود لٹیروں سے مل جاتے ہیں اور ان کو راستہ بتاتے ہیں۔

منیٰ سے واپسی:

مزدلفہ سے ہمارے قافلہ والوں نے سات کنکریاں چُن لی تھیں، دوسرے حجاج مجموعہ جمرات کے لیے کنکریاں یہاں سے تھیلیاں بنا کر لے آئے ہیں۔ نماز فجر کے بعد مزدلفہ سے سب ساتھ ہی نکلے، کیونکہ ایک آدمی کا بھی پیچھے رہ جانا یا علیحدہ نکل جانا موت کو دعوت دینا تھا۔ ڈھائی گھنٹوں میں پیدل چلنے والے جمرۂ اولیٰ پر پہنچ گئے، مگر اونٹ، خچر اور خواتین جن کے ساتھ تھیں وہ ظہر سے پہلے رمی کے لیے پہنچے، مگر آج وہ منیٰ نہیں تھا جو عرفات سے پہلے آٹھویں کو تھا، اُس روز تو ہُو کا عالم تھا، اور آج پُر رونق بازار ہے، کھانے پینے کی چیزیں وافر موجود ہیں، ٹھیلوں میں سفرجل کثرت سے تھے، خشک میوے، اخروٹ، کشمش، مُنقّیٰ، انجیر، بادام تھے، کچھ لوگ تمر ہندی بھی خرید رہے تھے جو انتہائی ترش پھل ہے، الحمد للہ سب ساتھ تھے اس لیے خطرات نہیں تھے، اطمینان سے رمی کی اور رمی کے بعد دیر تک دعائیں کرتے رہے اور حلق کر کے حلال ہو گئے۔ بہت سے حجاج جو قِران یا تمتع کیے ہوئے تھے انھوں نے جانور ذبح کیے، یہاں ایک متوسط درجے کے اونٹ کی قیمت ساٹھ دینار مصری ہے، اور دُنبہ تین دینار کا ملا، بکریوں کی قربانی صرف اہلِ مکہ کرتے ہیں اور اس کو چاول میں پکا کر کھاتے کھلاتے ہیں مگر ان کو کوئی ضرر نہیں پہنچتا، اہلِ مکہ کافی تعداد میں تھے، اور وہ لوگ تھے جو عرفات یا مزدلفہ میں نظر نہیں آئے تھے۔ بعض حضرات اپنے ساتھ طبل (ڈھول) بھی لیے ہوئے تھے، اونٹوں کے سر پر ڈالنے کے لیے کلغیاں فروخت ہو رہی تھیں، مصری حجاج کثرت سے خرید رہے تھے، وہ لوگ جب اپنے ملک واپس جائیں گے تو مصر پہنچتے وقت یہ کلغیاں اونٹوں کے سروں پر لگا دیں گے تو لوگوں کو معلوم ہوگا کہ یہ اونٹ منیٰ سے ہو کر آئے ہیں، پھر لوگ دودھ اور دہی کے مٹکے ہدیۃً پیش کریں گے۔
مسجد خیف میں نمازیں ہم لوگوں نے پنج وقتہ ادا کیں، گیارہ تاریخ کی ظہر کی نماز پڑھ کر ہم لوگ

طواف افاضہ کے لیے مکہ مکرمہ روانہ ہوئے، اونٹوں سے جانے کے بجائے مقامی خچر کرایہ پر لیے گئے، اور اپنے اونٹوں کو یہیں چھوڑ دیا گیا، طواف افاضہ کے لیے عصر کے اول وقت پہنچ گئے مگر خچر پر دونوں ٹانگیں گرا کر بیٹھنے کی وجہ سے ان میں سوجن ہو گئی، طواف میں کافی بھیڑ تھی، حجر اسود کا صرف ایک مرتبہ تقبیل کر سکے اور دوسرے پھیروں میں صرف استلام پر اکتفا کرنا پڑی، مگر مصری حجاج ہر پھیرے میں تقبیل پر مصر ہوتے تھے اس کی وجہ سے جگہ تنگ ہو جاتی ہے، مجھ کو حرارت شروع ہو گئی تھی، اور سر میں سخت درد ہو گیا شیخ مصطفیٰ اسنبل کے گھر پر آرام ملا لیکن بخار تیز ہو گیا، اسی حال میں رات کو وہ یہیں منیٰ لے گئے، اور بارہویں کی رمی کے بعد جب مکہ مکرمہ واپس آئے تو نزلہ سے سر بھاری اور بخار تیز تھا۔ شیخ مصطفیٰ نے ایک حکیم ہندی کو بلایا جنھوں نے چند حشائش وعقاقیر کو پانی میں اُبال کر پلایا، شیخ مصطفیٰ کے پڑوس میں مرزوق حجام تھے جو پنچ لگا کر خون رگوں سے نکالنے کا فن جانتے ہیں، اس علاج کا ذکر احادیث میں موجود ہے، اور لوگوں کو فائدہ بھی ہوتا ہے، مکہ مکرمہ میں متعدد حجام ہیں اور سب اپنے کام میں ماہر ہیں، مگر میں نے یہ علاج نہیں کیا، ایک مرتبہ صرف اس خیال سے ارادہ کیا کہ احادیث میں وارد ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ علاج کرایا ہے، لہذا ایک سنّت کی ادائیگی ہو جائے، مگر بخار کی شدت میں اس کا فیصلہ نہ کر سکا اور ۱۸ ذی الحجہ کو بخار ٹوٹ گیا۔

[اس کے بعد شیخ محمد الجاسر کے مرتب کردہ سفرنامہ کا ترجمہ ہے]

مکہ مکرمہ کے حالات اور اس کا نقشہ :

سفرنامہ کے مصنّف اپنے سفرنامہ کا آخری باب لکھتے ہیں جس کا عنوان ہے "خاتمۃ تشتمل علی المحتاج الیہ من اخبار مکۃ والبیت والمسجد وماحواہ" یعنی مکہ مکرمہ سے متعلق ضروری معلومات اور بیت اللہ، مسجد حرام اور اس کے متعلق عمارتوں کا ذکر، اس سلسلہ میں انھوں نے چند شخصیات کا ذکر کیا ہے جن سے وہ ملے، مکہ مکرمہ کے اسماء، اس کا جغرافیہ، حدود بیان کیا ہے اور الفاسی کی شفاء الغرام سے عبارتیں نقل کی ہیں اور کہیں پر قطبی کی الاعلام کا حوالہ دیا ہے، چنانچہ مکہ مکرمہ کے عمومی حدود کے بارے میں لکھتے ہیں کہ مکہ مکرمہ پہاڑوں کے درمیان ایک وادی ہے جو اسی وقت نظر آتی ہے جب آنے والا اس کے اندر داخل ہو جائے، باہر سے نظر نہیں آتی، یہ وسیع مستطیل

شہر ہے، جس میں پہاڑی راستے (شعاب) بکثرت ہیں، اور ان کی شکل مستطیل ہے۔ اس شہر کے دو شروع اور آخر کی سرحدیں ہیں (مبتداء و منتہیٰ) داخل ہونے کی سرحد مُعلّاۃ ہے، اور آخری باہر نکلنے کی سرحد جدّہ کی جانب مشبیکہ ہے، اور یمن کی جانب مولد ابوبکر رضی اللہ عنہ اس کی انتہائی حد ہے، اس کا عرض (چوڑائی) یوں ہے کہ ایک طرف جبل جزّل ہے (ج کو کسرہ۔ ز کو تشدید کے ساتھ فتحہ) اس کا نام جزل اس لیے ہے کہ یہاں بہت سے حبشی آباد ہیں، انھوں نے اس کا نام یہی رکھ چھوڑا ہے۔ یہ لوگ یہاں طبل (ڈھولک) بجایا کرتے ہیں، اور عرض میں دوسری طرف جبل ابوقبیس کا نصف حصہ ہے، ان پہاڑی گلیوں (شعاب) اور وادی میں بہ کثرت لوگ آباد ہیں، اور موسم حج میں تو اس قدر بڑھ جاتے ہیں کہ ان کی گنتی سوائے خدا کے کسی کو معلوم نہیں ہوتی، مکہ کا کوئی شہر پناہ دیواروں سے بنا ہوا باقی نہیں ہے، البتہ پہاڑوں سے چاروں طرف سے گھرا ہوا ہے، اور یہی اس کے قدرتی شہر پناہ (سور) ہیں۔ ص ۲۵۱ - ۲۵۲)

مکہ مکرمہ میں پانی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہاں بہت کافی تعداد میں کنوئیں ہیں، لیکن اکثر ایسے ہیں جن کی تہ میں ریت ہے اس لیے پانی گدلا ہوتا ہے اور چھان کر استعمال کیا جاسکتا ہے، اس کے علاوہ چند چشموں کا پانی بھی مکہ میں آتا ہے جس میں مشہور نہر زبیدہ ہے جس کو ہارون الرشید کی بیوی نے اپنے صَرف خاص سے بنوایا تھا مگر وہ عرصۂ دراز سے معطّل تھی، اس کو دوبارہ الامیر (شاہزادہ) سرور نے ٹھیک کرایا ہے اس وقت سے پانی کی تکلیف نہیں ہوتی ہے۔ جزاہ اللہ خیرًا۔ لیکن اس کے باوجود حج کے موسم میں پانی خریدنا پڑتا ہے، بلکہ یہاں کے رہنے والوں نے بتایا کہ سوائے چند احباش (حبشہ کے باشندے) کے جو کنوئیں سے نکال کر پانی استعمال کرتے ہیں ہر ایک کو سال بھر پانی خرید کر کام چلانا پڑتا ہے۔

مکّہ کی حکومت:

امارۃ مکّہ کے حدود سے آجکل جدّہ، طائف اور مُرّ الظہران باہر ہیں اور عملاً مکہ کا حاکم صرف مکہ مکرمہ کا حاکم ہے، اور حجاز کے اعراب کو احکام شرعیہ امیر مکہ اور والی الحرمین کے ذریعہ نہیں پہنچتے، لیکن از روئے قانون و نظام امیر مکہ کے حدود حکومت میں جدّہ، طائف، مرّ الظہران اور مدینہ منورہ

[illegible] نے اس کی حکومت تسلیم نہیں کی، امیر مکہ ایک فوج لے کر مدینہ منورہ گیا اور مدینہ منورہ کے قلعہ پر قبضہ کر لیا اور اس دوران وہاں بہت سے لوگ قتل ہوئے، اور لوٹ مار مچائی گئی، اور فتنہ بڑھ رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے سلطان عبدالحمید عثمانی کو توفیق دی اور وہ خود آئے اور فتنہ کو ختم کر دیا اور شامی قافلہ کے امیر کے لڑکے کو مدینہ منورہ کا گورنر بنا کر بھیجا اس وقت سے امیر مکہ مدینہ منورہ کی حکومت سے سبکدوش ہو گئے۔

مکہ مکرمہ میں قیام پذیر ہونے اور وہاں کے مکانات کو فروخت کرنے یا کرایہ پر دینے کے احکام:

مصنف نے تفصیل سے علماء کے اختلاف کا ذکر کیا ہے، جس کا تعلق وہاں کی اراضی اور مکانات کو کرایہ پر دینے یا فروخت کرنے سے ہے۔ حدود حرم کے متعلق انھوں نے لکھا ہے کہ مدینہ منورہ کے رخ پر چار یا پانچ میل تنعیم کے راستے سے ہے عراق کی جانب آٹھ میل تک انتہا ہے، عرفہ سے نو میل تک حدود حرم ہیں، اور اگر حدیبیہ کی طرف سے جدہ جائے تو حدود حرم چھ میل تک ہے، اور علامت یہ بتائی ہے کہ حرم کا سیلاب انہی حدود تک آکر رک جاتا ہے، پھر مصنف نے ان روایات پر تنقید کی ہے، اس کے بعد شفاء الغرام سے حدود حرم کے متعلق مختلف علماء کے آراء نقل کیے ہیں، اور یہ لکھا ہے کہ پہلے کس نے یہ حدود قائم کیے۔

کہ مکرمہ آکر بس جانے کے متعلق لکھا ہے کہ بعض علماء اس کو مکروہ سمجھتے ہیں، اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ وہ حج کے بعد اعلان کیا کرتے تھے "یا أهل اليمن يمنكم، ويا اهل الشام شامكم، ويا اهل العراق عراقكم فانه أبقى لحرمة حرم ربكم في قلوبكم" (اے اہل یمن! اپنے ملک یمن واپس جاؤ اور وہیں رہو، اے شام والو! تمہارے لیے تمہارا ملک شام ہے، اور اے عراق کے باشندو! تمہارے رہنے کی جگہ تمہارا ملک عراق ہے، تاکہ تمہارے دلوں میں تمہارے رب کے حرم کی عزت و حرمت اور اس کی طرف شوق باقی رہے، مصنف نے مزید لکھا ہے کہ بہت سے خراسان کے رہنے والے بیت اللہ سے زیادہ قریب ہیں بہ نسبت ان لوگوں کے جو کعبہ کا طواف کر رہے ہیں، جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے:

وكم من بعيدِ الدار نال مرادَهُ ... وكم من قريب الدار مات كئيبا

(اور کتنے ایسے لوگ ہیں جن کے وطن بیت اللہ سے دور ہیں مگر وہ اپنی مراد پا لیتے ہیں، اور کتنے قریب رہنے والے ہیں جو نامراد مر جاتے ہیں)۔

مسجدِ حرام کی عمارت:

مختلف زمانوں میں حرم شریف کی عمارتوں میں جو تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں، ان کا تفصیلی بیان الأزرقی اور القطبی نے ذکر کیا ہے، اس سفرنامہ کے مؤلف نے انہی بیانات کو اپنے سفرنامہ میں نقل کر دیا ہے، اس سلسلہ میں مَسْعیٰ کے بارے میں ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ سلطان قایتبائی المحمودی نے ترکی سے ایک تاجر مسمی محمد بن عمر بن الزمن الخواجا کو مکہ بھیجا کہ وہ اس کا تجارتی کاروبار مکہ میں کرے، اور اس کو حرم کی عمارت میں ایک مدرسہ بنانے کی اجازت دی تھی اور مطاف میں ایک جگہ مخصوص طور پر محفوظ کرنے کے لیے ہدایت دی، اس شخص نے میلین اخضرین کے درمیان ایک وضو وطہارت کی جو جگہ تھی اس کو منہدم کر دیا، یہ میضاۃ (وضو وطہارت کی جگہ) سلطان شعبان بن الناصر بن حسن القلاوون نے تعمیر کی تھی جو باب علی کے سامنے تھی اس کے مشرق کی جانب لوگوں کے مکانات تھے، اور مغرب کی جانب مَسعیٰ تھا، جنوب کی طرف ایک جگہ تھی جس کو فقیروں اور لاوارث لوگوں کی رہائش کے لیے تعمیر کیا گیا تھا اس کو "رباط" کہا جاتا ہے، اور اس کے شمال کی جانب حضرت سیدنا العباس رضی اللہ عنہ کا مکان تھا، خواجا نے اس طہارت گاہ اور وضو خانہ کو منہدم کر دیا اور مسعیٰ کے حدود میں تین گز زیادہ زمین لے کر اپنی ناموری کے لیے ایک رباط بنانے کا ارادہ کیا، جب اساس کے لیے زمین کھودی گئی تو قاضی القضاۃ[1] نے اعتراض کیا کہ مشاعر حرم پر تصرّف جائز نہیں ہے، مگر وہ شخص یعنی خواجا سلطان قایتبائی کا ایجنٹ تھا، اس نے قاضی کا حکم نہیں قبول کیا، اس پر قاضی نے چاروں مذاہب فقہیہ کے علماء کو جمع کر کے شرع کے احکام معلوم کیے، ان سب نے بالاتفاق کہا کہ مسعیٰ مشاعر حج میں ہے اس کی ایک انچ زمین بھی دوسرے کام میں استعمال نہیں ہو سکتی۔

---

[1] قاضی القضاۃ اللہ تعالیٰ ہے، کسی انسان کے لیے یہ لقب ناجائز ہے۔ (حمد الجاسر)

علمائے مکہ اور فقہائے مذاہب اربعہ کے حکم و فتویٰ کو بھی الخواجا نے تسلیم نہیں کیا، تو لوگوں نے سلطان عثمانی کی خدمت میں اپیل کی، اہل مکہ کا ایک وفد ترکی گیا، مگر قایتبائی نے اپنے ایجنٹ کو منع نہیں کیا بلکہ اس کو حکم بھیج دیا کہ اپنا کام جاری رکھے، اور اس نے ایک رباط تعمیر کی، اس کے بازو میں ایک مطبخ بنوایا جس سے فقیروں کو روٹیاں دی جاتی تھیں، اور ایک وضوخانہ و طہارت گاہ بھی تعمیر کیا، مگر مسعیٰ کے اصل حدود میں سے تین گز زمین پر ناجائز قبضہ ہو گیا، اگرچہ اس نے کارِ خیر کی نیت سے کام کیا اور اس مطبخ کو چلانے کے لیے مکہ مکرمہ کے چند مکانات وقف کیے اور مصر میں چند مزارع (باغات وغیرہ) وقف کر دیے تھے، اور قایتبائی کے اندر دینی جذبہ تھا اور اس کے ایجنٹ نے بھی خیر کا کام کیا مگر علما سخت نالاں اور بیزار تھے، یہ صورت حال عرصہ دراز تک قائم رہی یہاں تک کہ یہ مکانات اور جگہیں فروخت ہو گئیں، اور مسعیٰ کے حدود شرعی پھر سے قائم ہو گئے۔

مصنّف نے اس کے بعد مسجد حرام کے دروازوں کے نام اور ان کی ساخت بیان کی ہے، اور تفصیل سے بیت اللہ، مقام ابراہیم، زمزم، قبۃ الشراب اور ائمہ اربعہ کے مُصلّات (نماز و جماعت کی جگہ) کا ذکر کیا ہے، اس کے بعد کعبہ مشرفہ کے اندر داخلہ اور اس وقت جو ہنگامہ سا ہو جاتا ہے اس کی تفصیل اس طرح لکھی ہے:

اور تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ غیر موسم حج میں جب کعبہ مشرفہ کا دروازہ کھلتا ہے تو ایک سیڑھی لگا دی جاتی ہے، میرے قیام کے زمانہ میں متعدد بار کعبہ کا دروازہ کھولا گیا مگر بھیڑ کی وجہ سے سیڑھی نہیں لگائی گئی، لوگوں نے یہ ترکیب کی ایک اکڑوں بیٹھ جاتا اس کی پیٹھ پر دوسرا کھڑا ہو جاتا، اس کے کاندھوں کا سہارا لے کر تیسرا باب کعبہ میں داخل ہو جاتا، پھر باری باری لوگ ایک دوسرے کو سہارا دیتے، اگرچہ کعبہ کے کلید بردار رات کے وسط میں بغیر کسی اعلان کے اپنے خاص الخاص حجاج کو لے کر آتے اور سیڑھی لگا کر ان کو داخل کر لیتے اور سیڑھی ہٹا دیتے، مگر حجاج بھی اس کی تاک میں رہتے، لیکن اس اژدحام اور بے ترتیبی کی وجہ سے حرم شریف اور کعبہ مشرفہ کی بے حرمتی ہوتی ہے خصوصاً جب ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے باہم لڑ پڑتے، اور ایک دوسرے کو ڈھکیلنے کی کوشش کرتے ہیں، یہاں تک کہ خواتین بھی زد میں آ جاتیں اور مجمع میں پس جاتیں، یہی نہیں بلکہ بسا اوقات کچھ لوگ مجروح بھی ہو جاتے ہیں اور خون بھی نکل آتا ہے، یہی حال حجر اسود کو بوسے دینے میں دیکھا جاتا ہے،

مصری حجاج اور ان کی خواتین اس کی پرواہ نہیں کرتیں کہ وہ مردوں کے اوپر چڑھ جائیں یا مرد ان پر گر جائیں، یہ بھی دیکھا گیا کہ تنگ جگہ میں اس اژدحام کی وجہ سے بدبوسی محسوس ہوتی، العبدری کے کے زمانہ میں بھی اسی طرح کی حرکتیں ہوتی تھیں چنانچہ اس نے لکھا ہے کہ افسوس کہ حجاج حرمت بیت اللہ کا لحاظ نہیں رکھتے اس لیے بجائے اجر کے عتاب کے مستحق ہو جاتے ہیں۔

حرم شریف کی صفائی:

مصنف نے حرم شریف کے اندر صفائی کے انتظامات کی تعریف کی ہے، اور العبدری کے اس قول کی تردید کی ہے کہ حرم شریف میں خاص طور پر باب الندوہ میں انتہائی گندگی دیکھی، لوگ مچھر مارنے اور تھوکنے سے بھی گریز نہیں کرتے، لیکن میں نے اس کے برعکس حرم شریف کے اندر صفائی اور طہارت کا بہترین انتظام دیکھا، خصوصًا مطاف کو حبشی غلام جن کو اغوات کہا جاتا ہے بہت ہی اہتمام سے پاک صاف رکھتے ہیں، اور ان اغوات کے اندر بہت سکینت و وقار محسوس کیا، حجاج کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے ہیں اور خاموشی سے اپنا فرض انجام دیتے ہیں۔

زمزم اور مقام ابراہیم:

مصنف نے بہت وسعت کے ساتھ الازرقی سے چاہ زمزم کے بارے میں نقل کرنے کے بعد اپنا مشاہدہ یہ لکھا ہے کہ، حجاج اس کنوئیں کی منڈیروں کے پاس جمع ہو کر غسل کرنا اور اپنے کپڑے پاک کرنا چاہتے ہیں، یہ ایک تنور کی شکل کا منڈیر ہے جس پر لوہے کی آدھے گز کی آہنی جالی ہے اس کے اوپر پانی نکالنے والوں کا ایک گروہ ہوتا ہے جو حاجیوں سے پیسے لے کر ان پر ایک ڈول یا دو ڈول اپنی اجرت کے بقدر پانی ڈال دیتا ہے، کچھ لوگ صبر نہیں کر سکتے تو کنوئیں سے ڈول نکلتے ہی جھپٹ پڑتے ہیں اور اس کے ہاتھ سے چھین کر اپنے سر پر ڈال لیتے ہیں، جس سے جسم اور کپڑے سب بھیگ جاتے ہیں اور اسی طرح تر بتر پانی ٹپکاتے مطاف میں آتے ہیں جس سے خاصی گندگی ہو جاتی ہے، یہ کام مسجد شریف کے وسط میں ہوتا ہے، اور وہ بھی مسجد کون؟ سب مسجدوں سے افضل ترین مسجد، اور روئے زمین پر سب سے زیادہ مقدس و محترم مقام، حالانکہ عام مساجد کے لیے یہ حکم ہے کہ اس کا احترام ملحوظ رکھا جائے،

Dr. Zakir Husain Library

قرآن کریم میں ہے

"فی بیوت اذن اللہ ان ترفع و یذکر فیھا اسمہٗ" (سورۂ نور ۳۶)

(اُن گھروں میں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ بلند کیے جائیں اور وہاں خدا کے نام کا ذکر کیا جائے)۔

حافظ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ جب عبدالمطلب نے چاہ زمزم کو برآمد کیا اور کھودا تو کہا، انی لا اُحلّھا المغتسل وھی لشارب حِلٌّ و بِلٌّ، یعنی میں نہانے اور دھونے والوں کے لیے اس کو جائز نہیں قرار دیتا ہوں، پینے والوں کے لیے یہ حلال اور مباح ہے (بلٌّ قبیلہ حِمیَر کی لغت میں مباح کو کہتے ہیں) اسی لیے انھوں نے اس کے دو حوض بنا دیے تھے، ایک پانی پینے والوں کے لیے اور دوسرا وضو کرنے والوں کے لیے۔ چاہ زمزم کے متعلق العبدری نے لکھا ہے کہ لوگوں نے بے سروپا باتیں بھی منسوب کر دی ہیں، مثلاً یہ کہ شبِ جمعہ کو اس کا پانی بڑھ جاتا ہے، میں نے اس کا تجربہ کرنے کے لیے ایک مرتبہ نہیں کئی مرتبہ شبِ جمعہ وہیں بسر کی اور پانی کی حد کو ناپا مگر کوئی فرق نہیں پایا، لیکن حجاج کو بدستور چاہ زمزم پر جنگ وجدال کرتے اور شور مچاتے دیکھا، اگر اللہ کوئی محتسب پیدا کر دیتا تو ان کو سزائیں دیتا، اور حرم پاک کا احترام سکھاتا۔

مسجد حرام کے اندر کی عمارتیں:

حرم شریف کے اندر ایک گنبد چاہِ زمزم پر ہے، دوسرا گنبد سقایۃ الحاج (حاجیوں کو پانی پلانے) کا ہے جس کو قبۃ الشراب کہتے ہیں، اور رمضان میں اسی سے پانی فراہم کیا جاتا ہے، چاہ زمزم سے ایک نالہ نکال دیا گیا ہے جس کے ذریعہ اس عمارت کے اندر جو حوض ہے اس میں پانی بھر جاتا ہے، اس کے مقابل ایک کمرہ ہے جس میں کعبہ کے شمعدان، جھاڑو وغیرہ رکھے جاتے ہیں جس کو مخزن کعبہ کہتے ہیں، مسجد حرام میں اس کے علاوہ کوئی عمارت نہیں ہے۔ العبدری نے بھی یہی لکھا ہے، لیکن العبدری کا یہ بیان صحیح نہیں ہے کیونکہ مطاف میں چاروں اماموں کے مصلّے بھی ہیں، اور العبدری نے حج ۶۸۸ھ میں ادا کیا ہے، اور یہ مصلّے امام ابن حاجب کے وقت میں بنائے گئے تھے اور ابن الحاجب نے بیان کیا ہے کہ ان مصلّوں کا وجود کیونکر عمل میں آیا، بات یہ ہوئی کہ چاروں مذاہب کے علماء آپس

میں جنگ وجدال پر اتر آئے تھے، ہر شخص چاہتا تھا کہ حرم میں نمازیں اس کے مسلک اور وقت کے مطابق ہوں، چنانچہ ابن الحاجب لکھتے ہیں کہ مجھ سے اسکندریہ میں ایک وفد استفسار لے کر آیا، میں نے کہا زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر مذہب کے مطابق مصلیٰ مخصوص کرنے کی حالت میں ایک مسجد کے اندر چند مسجدیں بن جائیں گی اور تعدد مساجد ایک مسجد کے اندر بہ سبب اختلاف جماعت کے مالکیہ کے یہاں جائز نہیں ہے، لیکن رفع نزاع اور ہنگاموں کو دور کرنے کی خاطر علمائے مالکیہ بھی راضی ہوگئے اور یہ طے کیا گیا کہ سب کے مصلّے علیحدہ ہوں اور لوگ اپنے اپنے وقت پر نمازیں ادا کریں[1]

ان مخصوص مقامات کے علاوہ ایک چوبی محراب چاہ زمزم کے بائیں جانب ہے جس کو باب بنی شیبہ قدیم کہا جاتا ہے، اور مسجد حرام میں رات کو چاروں ارکان پر ایک ایک قندیل روشن کی جاتی ہے جو مغرب کے بعد روشن ہوتی ہے اور عشار کی نماز آخری امام کی امامت میں جب ختم ہوتی ہے تو گل کر دی جاتی ہے، صفا و مروہ کے بارے میں مصنف نے لکھا ہے کہ مروہ کے اوپر چند سیڑھیاں ہیں، اور اس کے وسط میں ایک دکان ہے، وہیں پر حلق کرنے والے (حجام) بیٹھے رہتے ہیں، اور حلق کے بال وہیں پر گرتے ہیں اور لوگ دکان پر خرید و فروخت کرتے ہیں، اور پورے بازار میں دکانداروں کا شور و غل رہتا ہے، گندگی، کوڑے کرکٹ جمع رہتے ہیں، اور صفائی دکان دار صرف اپنی دکانوں کے سامنے کی جگہ کی کرتے ہیں اور رات دن میں کبھی یہ بازار خالی نہیں رہتا۔

مشاعر مقدسہ کے حدود:

مصنف سفرنامہ "فِيْ ذِكْرِ مَحَالِ الْمَنَاسِكِ خَارِجَ مَكَّةَ" میں فرماتے ہیں کہ مکہ مکرمہ سے عرفہ کا راستہ پہاڑوں اور ان کی پہاڑیوں کے دامنوں سے گزرتا ہے۔ مکانات کا سلسلہ ختم ہوجائے تو سب سے پہلے حجون نظر آئے گا، اس کے بعد ہی محصّب ہے، وہاں سے ابطح ہے، ابطح سے جبل حراء صاف نظر آتا ہے، منیٰ جانے والے کے لیے یہ پہاڑ بائیں جانب پڑے گا، اس وادی سے گزریے تو سامنے مسلزب پہاڑ نظر آئے گا، جیسے ہی آپ نے اس کو

---

[1] الحمد للہ ہماری حکومت رشیدہ نے اس بدعت کو ختم کردیا اور ہنگامہ ختم ہوگیا۔ (محمد الجاسر)

پار کیا منیٰ کی بستی میں داخل ہو گئے، اور منیٰ سے مزدلفہ اور مزدلفہ سے عرفہ کا راستہ پیچیدہ نہیں ہے، البتہ پہاڑی راستے ہونے کی وجہ سے بعض حاجیوں کو دائیں بائیں کا فرق محسوس نہیں ہوتا اور کچھ لوگ تھوڑی دیر کے لیے راستہ بھول جاتے ہیں، اور ایک دو میل ان کو زیادہ چلنا پڑتا ہے، مکہ سے عرفہ تک کی مسافت بارہ میل ہے، نہ کم نہ زیادہ۔ الازرقی نے لکھا ہے اور جس کو مشارقہ (علمائے حجاز و یمن) نے تسلیم کیا ہے کہ اگر مکہ سے کوئی معتدل چال سے چلے تو چھ گھنٹوں میں عرفات پہنچ جائے گا۔

مزدلفہ زیادہ وسیع اور ہموار نظر آیا، برخلاف منیٰ اور عرفہ کے، یہاں ٹیلے ہیں، دو طرف پہاڑ ہیں، زمین ناہموار ہے، جا بجا مٹی کے تودے رکھے ہیں، گزشتہ سال حج کو ذبح کی ہوئی بکریوں اور دُنبوں یا اونٹ گائے کی ہڈیوں کے ڈھانچے جا بجا نظر آتے ہیں، بلکہ بعض جگہ عفونت کا بھی احساس ہوا۔ مزدلفہ کے حدود یہ ہیں کہ منیٰ سے چلیے تو پہلے وادی محسر پڑے گا، یہ چھوٹی سی وادی ہے جس کے ایک کنارے سے آپ ڈھیلا پھینکیں تو دوسرے کنارے تک آسانی سے چلا جائے گا۔ شیخ ابو سالم نے لکھا ہے کہ مزدلفہ پہنچنے کی علامت یہ ہے کہ اگر آپ اونٹوں کا راستہ چھوڑ کر پیدل جانے والے قافلوں میں ہیں تو آپ کے دائیں جانب ایک ویران اور خالی تالاب ملے گا، اور زمین کی سطح وہاں اونچی ہونا شروع ہو جائے گی۔

علمائے علم مناسک نے اس طرح مزدلفہ کا تعین کیا ہے۔ عرفہ اور منیٰ کے حدود بھی ان علاقوں کے ساتھ العبدری نے ذکر کیے ہیں، جس میں کنوئیں اور مزارات ہیں، مگر مشکل یہ ہے کہ بہت سی قبریں ہم لوگوں کو نہ مل سکیں، کہتے ہیں کہ محسر سے مسجد مزدلفہ تک ایک میل کی مسافت ہے اور مسجد مزدلفہ سے مسجد نمرہ تک چار میل ہیں عرفہ کی مسجد منیٰ کی مسجد سے بڑی ہے، مزدلفہ کی مسجد تو صرف اینٹوں سے گھری ہوئی ایک جگہ ہے، قبلہ کا رُخ بھی بتانے والا کوئی نہیں ہے، البتہ چند پُرانے حجاج اور قہوہ فروخت کرنے والے بتا دیتے ہیں۔

سفر نامہ حصّہ اوّل تمام ہوا

مولانا عبید اللہ کوٹی ندوی
رفیق دار المصنفین اعظم گڑھ

تنقیدی ادب کے اسلامی اقدار

یہ مقالہ رابطہ ادب اسلامی کے سمینار منعقدہ ۶، ۷ جنوری ۱۹۸۶ء کو ندوہ لکھنؤ کی اس نشست میں پڑھا گیا جس کی صدارت بزم شبلی کے سرخیل سید صباح الدین عبدالرحمٰنؒ کر رہے تھے۔ آج یہ مقالہ اس وقت شائع ہو رہا ہے جب آں قدح بشکست و آں ساقی نماند۔

ادب زندگی کا آئینہ ہے، اور زندگی آموز بھی ہے، ادب معاشرہ کے خط وخال نمایاں کرتا ہے اور اس کے زلف وگیسو بھی سنوارتا ہے، اس سے تعمیری، تخریبی دونوں کام لیے گئے ہیں، اس نے قوموں کو ابھارا بھی ہے اور سلایا بھی ہے، ادب تندرست بھی ہوتا ہے اور اپاہج بھی، دوسروں کے لیے زندگی بخش، صحت بخش ہونے کے ساتھ عزم وارادہ کو ہمیشہ جوان رکھنے میں مددگار بھی بنتا ہے اور دوسری طرف اس کو بھی ادب ہی کہا جاتا ہے جو نوجوانوں سے ان کی جوانمری چھین کر خنثیٰ مشکل کی صورت میں بزدل اور ناکارہ بنا دیتا ہے۔ ایک باحمیت صاحب قلم شیخ مصطفیٰ صادق الرافعی کا یہ تبصرہ سخت ضرور ہے مگر واقعہ کے عین مطابق ہے کہ بعض ادب اس طرح کے ہیں جن "تأنث بہ الرجل واسترجلت بہ المراۃ و تخنث بہ الشباب" (اس ادب کو پڑھ کر مرد میں زنانہ پن آگیا، عورت نے مردانہ وضع اختیار کرلیا اور جوان مخنّث بن گئے)۔

عربی کی قدیم شاعری جس کو آج جاہلی ادب یا جاہلی شعراء کا کلام کہا جاتا ہے اس میں الفاظ کے استعمال میں چابکدستی ضرور ملتی ہے، لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ان کی شاعری صرف الفاظ کا گورکھ دھندا تھی کیونکہ اس زمانہ میں بھی مردانگی، فتوت، شجاعت، سخاوت اور مروّت کے وہ خصائل تھے جس کی طرف شاعر اپنے ابنائے وطن کو دعوت دیا کرتا تھا، ہاں مدحیہ قصیدہ میں اور خاص طور پر جب علاقہ وجاہ

کے شاہانِ وقت کا قصیدہ ان کو کہنا پڑتا تو اس میں ایسا مبالغہ کرنے پر مجبور ہوتے جس پر خود ان کا ضمیر ان کو ملامت کرتا۔ العمدۃ میں ابن رشیق نے کسی کا قول نقل کیا ہے، اکذب الشعر اعذبہ جو شعر صداقت سے جس قدر دور ہوگا اسی قدر اس میں دل آویزی ہوگی۔ لیکن یہ عمومی مزاج شاعریؔ کا نہیں تھا، انسانی ہمدردی کا عنصر کبھی تمام سفلی جذبات پر غالب آجاتا اور شجاعت وسخاوت کے ساتھ 'انسان دوستی' کا یہ منظر بھی دیکھنے میں آتا کہ ایک شعر و شراب، نگار و بربط کا شیدائی، جب کسی مصیبت زدہ کو کراہتے یا مدد کے لیے آواز دیتے سنتا تو اپنی عیش کوشیوں کو چھوڑ کر اس کی طرف مائل ہوجاتا۔ سبعہ معلقہ کا دوسرا شاعر' طرفۃ بن العبد' کہتا ہے ؛

ولولا ثلاثٌ هن من عيشة الفتى . . . . .

ترجمہ: ایک نوجوان کی زندگی کا لطف تین چیزوں میں ہے، اگر ان میں کمی ہو تو ہمیں مرنے کا غم کبھی نہ ہو،

ایک شراب صبح گاہی، جھاگ دیتی ہوئی، سیاہی مائل سرخ۔

دوسرے کسی مصیبت زدہ کی آواز سُن کر گھوڑے کی لگام اس رُخ پر موڑ دینا۔

تیسرے ایک لالہ رخ کا ساتھ، برسات کا دن۔

یہاں اخلاقی عنصر ناپید نہیں تھے، اسلام نے ان کو جلا دی، ان کے چہرے سے گرد و غبار دور کیے، خواہشات کو کارآمد بنایا، ان پر اخلاق کا پہرہ مقرر کر دیا مگر ختم نہیں کیا۔ کیونکہ اسلام عین فطرت کی تعلیم دیتا ہے، خلاف فطرت مجاہدات کا مذہب نہیں ہے، اور یہی مقصدیت اسلامی ادب اور اس کے تنقیدی ادب کو سمجھنے کی کلید ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح زندگی کے دوسرے گوشوں میں رہنمائی فرمائی ہے اسی طرح آپ نے ادبی مسائل پر بھی توجہ دی ہے۔ جو قرآن مجید آپ پر خدائے تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا وہ اپنی فصاحت و بلاغت اور اعجاز بیانی میں اپنی مثال آپ ہے۔ خود احادیث نبویؐ جو انسان کے ادبی کمال کا نقطۂ عروج ہیں نثر کے مختلف اصناف پر مشتمل ہیں۔ خطبات نبوی، آپ کے مکاتیب، مواعظ (کلماتِ حکمت و دانش)، دعائیں، بیانِ واقعات و قصص، اخلاقی نصائح، قانونی ہدایات، خواص اور عوام میں مختلف طبقوں سے تخاطب، زندگی کی مختلف حقیقتوں کا اظہار، اور زندگی بعد موت کے بارے میں

آپ کے مربوط اور مسلسل بیانات غرض ادب نبوی میں نثر کے مختلف نمونے موجود ہیں، اس کے علاوہ آپ نے شعر و ادب کے مختلف اصناف پر تفصیل سے اظہار خیال فرمایا ہے اور دور جاہلیت کے کلام کو سن کر، اس کے پسندیدہ پہلوؤں کی نشان دہی اور ناپسندیدہ عناصر پر گرفت فرمائی ہے۔ جیسے آپ نے لبید کے اس شعر کی تعریف کی ہے:

أَلا کل شیئ ما خلا اللہ باطل　　　وکل نعیم لا محالۃ زائل

سنو! اللہ کے علاوہ ہر شے کو فنا ہے، ہر قسم کی خوش حالی ایک نہ ایک دن مٹ کر رہے گی۔

اسی طرح دورِ جاہلیت کے بعد جس ادب کی آپ نے اساس رکھی اس میں ادب کے معیار و مقصد اور اسلامی ادب کی تنقیدی روایات کا تعین بھی کیا گیا ہے۔

آپ نے ادب کے بارے میں محدود تصورات کے بجائے آفاقی نظریات عطا فرمائے جس کی وجہ سے ادب جاہلیت کا بھی تحفظ ہوا، دور جاہلیت کے ممتاز شعراء کے بارے میں اپنے خیالات کا بھی اظہار فرمایا، آپ کے سامنے مختلف ادبی اصناف پیش کیے گئے جن کو آپ نے دلچسپی سے سُنا، کہیں لفظی اور کہیں معنوی اصلاح تو فرمائی مگر اصناف ادب وغیرہ امور میں، ذوق و خیال کو پوری آزادی بھی دی کوئی بندش نہیں لگائی البتہ ادب صالح کے حدود کا تعین فرمایا تاکہ ادب تعمیر سے ہٹ کر تخریب کی سرحدوں میں داخل نہ ہو جائے۔

انسان کو خدا کی طرف سے جو صلاحیتیں ودیعت ہوئی ہیں انھیں میں ایک صلاحیت وہ ہے جسے قوت گویائی یا نطق کہا جاتا ہے۔ اور اسی وجہ سے انسان کو منطق کی بول چال میں حیوان ناطق کہا گیا ہے۔ یہی نطق، تربیت اور تعلیم سے آراستہ ہو کر ادب بن جاتا ہے، ادب کو قرآن مجید نے "بیان" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

خلق الانسان علّمہ البیان (سورۂ رحمٰن) ادب یا قوت بیان کو ان خاص نعمتوں میں شمار کیا گیا ہے جو انسان کو خدا کی طرف سے عنایت کی گئی ہیں۔ یہ قوت گویائی یا بیان اپنے کمال کے اعتبار سے جادو کی سی تاثیر رکھتا ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان من البیان لسحرا (بعض بیان میں سحر کی تاثیر ہوتی ہے)۔

یہاں اس ارشاد نبوی کو نقل کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے ادب کی حقیقت پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ قرآن مجید میں سحر یا جادو کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ:

"یخیل الیھم من سحرھم انھا تسعیٰ"

جادو کی وجہ سے ان کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوجاتا تھا کہ یہ لاٹھیاں (سانپ بن کر) دوڑنے لگی ہیں۔

جادو کا یہ اثر ہوا کہ زمین پر پڑی ہوئی لاٹھیوں کے بارے میں سانپ کی طرح دوڑنے کا خیال پیدا ہوگیا، کسی خیال کا ذہن میں پیدا کردینا تخئیل ہے اور زور بیان سے اس خیال کے مطابق منظر کشی محاکات ہے۔ گویا تخئیل اور محاکات جو جادو کے منتروں سے وجود میں آکر ناظرین پر اثرانداز ہوجاتے ہیں یہی تخئیل و محاکات، ادب کی بھی حقیقت قرار دیے گئے ہیں،

خیال آرائی اور منظر کشی کا عنصر ہی عام انسانی گفتگو سے ادب کو ممتاز کرتا ہے۔ اور یہ دونوں عنصر جنہیں ایک لفظ تخئیل سے ادا کیا جاسکتا ہے سامعین پر اثرانداز ہوتے ہیں۔

کسی بھی ادب کی ترکیب میں الفاظ و معانی دونوں کا وجود ضروری ہے۔ الفاظ ظاہر ہیں اور معانی ان کا باطن، یا الفاظ، ادب کا خارجی ظہور ہیں اور معانی اس کا داخلی وجود، اس لیے ادب میں دونوں کی یکساں اہمیت ہے۔ لفظ و معنی کے باہمی رشتہ پر بھی ادبی حلقوں میں اکثر بحثیں ہوتی رہتی ہیں، ان دونوں میں کب کس کا تناسب کس قدر ہو اس کا تعین، دراصل ضرورت اور موقع و محل کے لحاظ سے کیا جاتا ہے گا۔ مگر یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے۔

ادب منثور ہو یا منظوم، دونوں میں لفظ و معنی کا صحیح تناسب نہ ہو تو دو طرح سے خلل پیدا ہوسکتا ہے۔ الفاظ کم یا بے ربط استعمال کیے گئے ہوں تو تعقید پیدا ہوجائے گی اور معنوی قلت ہو تو ادب کی قدر و قیمت پر حرف آئے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن رواحہ کو اپنے شعروں میں بھی بے معنی الفاظ کی گرہ بندی اور بازی گری سے منع فرمایا (ایاک والسجع یا ابن رواحۃ) اس دور کے بعض کاہنوں کے منثور کلام کو اسی سجع کی پابندی اور زیادتی نے معنوی افلاس کی آخری حدوں تک پہنچا دیا تھا۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ نے "سجع" یا قوافی کو بالکل ناقابل توجہ سمجھا ہو، اگر یہ اپنی جگہ پر اور ضرورت کے مطابق ہو تو کہیں جائز ہے اور کہیں مستحسن بھی ہے، مثلاً آپ کی خدمت میں جو قبائل عرب کے وفود آتے تھے آپ نے ان سے انھیں کے انداز بیان میں گفتگو فرمائی، جیسا کہ ابن الاثیر نے الطوال الغرائب میں صحیح احادیث سے وہ خطابات نقل کیے ہیں جن میں قوافی اور نامانوس الفاظ (غریب) کی کثرت ہے۔ صحابۂ کرامؓ نے اس کا سبب دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ اگر ان وفود سے جو قبائل عرب سے آتے ہیں ان کے لہجہ میں بات نہ کی جائے تو اثر قبول نہیں کریں گے۔

خطیبانہ نثر میں بھی حد سے زیادہ سجع کی پابندی اور اشعار کی طرح منظوم، موزوں اور پُرتکلف زبان کے استعمال کرنے والوں پر آپؐ نے لعنت فرمائی، (لعن الله الذین یشققون الخطب تشقیق الشعر) لفظ و معنی کے باہمی رشتہ پر مزید بحثوں کو چھوڑ کر یہاں صرف اس قدر اشارہ کرنا کافی ہوگا کہ قرآن مجید نے تخریبی ادب کی یہ خصوصیت بتلائی ہے کہ "زخرف القول غرورا" (وہ حسین لفظوں کا گورکھ دھندا اور فریب ہے)۔

غرور (فریب) کا تعلق معنوی کج ادائیوں سے ہے اور زخرف القول کا تعلق الفاظ کے درو بست اور لفظوں کی بازی گری سے۔

الفاظ، خیال و معنی کے اظہار کا ایک وسیلہ ہیں، کسی مفہوم کو بیان کرنے کے لیے لفظوں کا سہارا لینا ہی پڑتا ہے اس بارے میں لفظوں کی قلت و کثرت، ان کا انتخاب اور پھر ترکیب الفاظ میں بندش کی چستی، موقع و محل کا لحاظ، اور طرز ادا میں سلیقہ ہو تو بیان میں حسن اور اسلوب میں جمال پیدا ہو جاتا ہے۔ عہد قدیم میں شعر و ادب کو پرکھنے کا یہ تنہا معیار نقد تھا، اسلام نے اس کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بار سوال کیا گیا "حسن و جمال کی اصل جگہ کہاں ہے؟" آپؐ نے فرمایا: "اسے زبان یعنی ادب میں ظاہر ہونا چاہیے"۔

"فیما الجمال ؟ قال فی اللسان یرید البیان"

(العمدۃ: ابن رشیق)

(پوچھا گیا کہ حُسن کا موقع و محل کیا ہے؟ فرمایا: کہ اسے زبان و ادب میں پایا جانا چاہیے)۔

زبان وادب کا بھی حسن، مسرت اور انبساط کا سبب بنتا ہے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوئے دیکھا کہ مجلس میں قرآن کے پہلو بہ پہلو شعر وسخن کا شغل بھی جاری ہے، تعجب سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! (صلی اللہ علیہ وسلم) قرآن بھی اور شعر وسخن بھی؟ فرمایا:

"رَوِّحوا القلوب ساعةً فساعة"۔ (ابو داؤد)

(کبھی کبھی دلوں میں نشاط و سرور بھی پیدا کر لیا کرو)۔

ادب اپنے حسن کی وجہ سے زندگی میں تازگی، طبیعتوں میں انبساط اور دلوں میں مسرت اور شادمانی کی جو لہر پیدا کر دیتا ہے وہ خود، تشنہ لبوں کے لیے آبِ زلال اور افسردہ طبیعتوں کے لیے مہر و محبت کا پیام ہے جس کی اہمیت یا ضرورت پر، یا شعر و ادب سے اس کی یافت پر مہرِ نبوت ثبت ہو چکی ہے۔

زبان وادب کی تنقیدی قدروں پر اسلامی نقطۂ نظر سے بحث کرتے ہوئے یہاں اس بات کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ زبانِ نبوتؐ سے ادب کی ایک صنف شعر وسخن کے بارے میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ:

"تَعَلَّمُوا الشعرَ فانّه يُعْرِبُ اَلْسِنَتَكُمْ"۔ (الجامع الصغیر)

(شعر وسخن کی تعلیم لو اس لیے کہ اس سے تمھاری زبان شستہ اور پاکیزہ ہو جائے گی)

اس ارشادِ نبویؐ کی روشنی میں ادب اور خصوصاً شعر وسخن سے شغل، زبان میں شستگی اور پاکیزگی کا سبب ہے، گویا دوسرے لفظوں میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ادب کو ادب آموزی کے لیے مطالعہ میں رکھنا اسلامی نقطۂ نظر سے کوئی بے مقصد عمل نہیں بلکہ کارآمد اور بامقصد چیز ہے۔ اور جب ادب سیکھنے کا حکم دیا گیا تو ہماری درس گاہوں میں شعبۂ ادب اور ادب کی تعلیم و تعلّم کا جو شغل ہے اسے دینی نقطۂ نظر سے بھی اپنے قیام و بقا کی ایک سند تو ہاتھ آ ہی گئی۔

سید شہاب الدین دسنوی

توحید اور سائنسی فکر

دُنیا میں جتنے بھی مذاہب آئے ان کی تعلیمات دو حصّوں پر مبنی رہیں : ایک عقائد اور دوسرا عمل۔ عقائد کے معاملے میں مسلمان اللہ پر ایمان رکھتا ہے، اس کے بھیجے ہوئے انبیاء پر اور ان پر نازل کی ہوئی کتابوں پر، آخرت پر اور ملائکہ پر۔ ان میں اللہ پر ایمان، سب سے اہم اور مشکل مسئلہ ہے۔ کیونکہ بہ قول اقبال:

خوگر پیکر محسوس تھی انساں کی نظر — مانتا پھر کوئی ان دیکھے خدا کو کیونکر

مگر اس دشواری کو اس طرح دور کیا جاتا ہے کہ زبان سے اقرار کر لیا جائے اور دل کو سمجھا لیا جائے کہ اللہ ایک ہے، نماز میں "اللہ اکبر" بار بار کہہ کر اس کی کبریائی بیان کر لی جائے ۔۔۔ لیکن کبریائی پر یقین کیسے آئے؟

تلاوت کرتے ہوئے ہر قاری نے دیکھا ہوگا کہ قرآن مجید میں آسمان، زمین، چاند، ستاروں، سمندر، پہاڑ کا ذکر بار بار آتا ہے۔ چمکتے ہوئے اجرام فلکی ہم سے بہت دور واقع ہوئے ہیں۔ اتنی دور کہ بہ قول قرآن ہماری نگاہ وہاں تک جاتی ہے تو تھک کر لوٹ آتی ہے! دنیا کی بڑی بڑی دوربینوں اور فلکیات کے اصولوں کی مدد سے پتہ چلتا ہے کہ ہم سے قریب ترین سیارہ ۹ کروڑ ۱۰ لاکھ کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے اور ستاروں میں سب سے نزدیک وہ ستارہ ہے جس کی روشنی ہماری زمین تک پہنچنے میں سوا چار سال لگ جاتے ہیں، اور جو ستارے بہت دور ہیں ان سے جو روشنی وہاں سے ۵۰۰ ملین سال پہلے چلی تھی وہ اب پہنچتی ہے، کچھ ستارے ایسے بھی ہیں جہاں سے نکلی ہوئی روشنی اب تک ہماری زمین تک پہنچی ہی نہیں۔ ان اعداد کی مدد سے سماوات کے فاصلے اور کائنات کی وسعت

کا تصور تو کیا لایا جائے تصور ہی میں یہ سمجھ لینا کافی ہوگا کہ روشنی کی رفتار فی سیکنڈ تین لاکھ کلومیٹر ہے تو قریب ترین ستارے سے چلی ہوئی روشنی سوا چار سال میں ۳۰۰,۰۰۰ × ۵۱۸۴۰ کلومیٹر ایک دن اور اس کا ۱۵ گنا فاصلہ سوا چار سال میں طے کر کے زمین تک پہنچتی ہے۔ پھر ایک ایسے کہکشاں کا تصور کیا جائے جس میں کروڑوں ستارے تیر رہے ہیں اور ایسے ہی کتنے کہکشاں اور بھی ہیں۔ مشاہدات اور ریاضی کے اصولوں سے جب یہ علم ہوتا ہے تب "اللہ اکبر" کا اقرار واقعی زبان سے اور دل سے ہوتا ہے اور یہی ایمان محکم ہوتا ہے۔ امریکن خلاباز جیمس اروِن وہ آخری انسان تھا جس کے قدم چاند پر پڑے۔ اپنی ایک کتاب میں اس سفر کے بارے میں وہ لکھتا ہے کہ سفر سے پہلے وہ کوئی مذہبی آدمی نہیں تھا، لیکن خلا میں پرواز کے دوران جب وہ اجرام سماوی کے درمیان سے گزر رہا تھا تو انھیں جس صفائی اور نفاست سے محوخرام اور ایک دوسرے سے بچ کر نکلتے دیکھا تو اسے ایمان لانا پڑا ایک ایسی قادر مطلق ہستی پر جو فہم و ادراک سے بالا تر ہے اور جس نے ایک اکمل نظام قائم کر رکھا ہے۔ جیمس اروِن کے اس بیان سے بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہم نماز میں "سبحان ربّی العظیم" اور "سبحان ربّی الاعلیٰ" کیوں پڑھتے ہیں۔

مسئلہ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود سے قطع نظر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا یہ منشا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو اس کی قدرت سے پہچانا جائے۔ ایسی تلاش میں ہم حق سے قریب اور توہماتی شرک سے دور رہ سکیں گے۔

اپنے پیغمبر کو اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے:

"قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" (سورۂ یونس)

کہہ دو کہ آسمان اور زمین پر جو کچھ ہے اس پر نظر ڈالو۔

سورۂ الجاثیہ میں ارشاد ہوتا ہے:

"اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ"

بے شک آسمان اور زمین میں مومنوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

سورۂ آل عمران میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ

وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ"

ان (ہوشمند) لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو اُٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے
ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی ساخت پر غور کرتے ہیں۔

ان صاف اور واضح ہدایات کے باوجود جب انسان اللہ کی قدرت اور حکمت کی نشانیوں پر غور کیے بغیر گزر جاتا ہے تو اُسے تنبیہ کی جاتی ہے:

"وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ۔" (سورۂ یوسف: ۱۰۵)

اور دیکھو، آسمانوں اور زمین میں کتنی نشانیاں ہیں جن سے لوگ منہ موڑ کر گزر جاتے ہیں۔

تنبیہ کے ساتھ یہ بھی جتا دیا جاتا ہے کہ یاد رکھو:

"وَمَا يَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ"

اندھے اور دیکھنے والے برابر نہیں ہوتے۔

اس تلقین کے باوجود اگر ایسے لوگ بھی ہیں جو آیات اللہ (اللہ کی نشانیوں) کا انکار کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انھیں خالقِ کُل اور قادرِ مطلق اور اس کی نشانیوں سے تعلق نظر نہیں آتا ہے اور وہ ان نشانیوں کو جھٹلاتے ہیں، ان ہی کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

"فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ۔" (سورہ انعام: ۲۰)

اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جس نے اللہ کی نشانیوں کو جھٹلایا۔

"آیت" کے معنی "چھپی ہوئی نشانی" ہے۔ اللہ کی طرف سے بندوں کو ہدایت دی جا رہی ہے کہ وہ اُن چھپی ہوئی نشانیوں کو معلوم کریں اور سمجھیں۔ یہ چھپی ہوئی نشانیاں کہاں کہاں ہیں، اس کا جواب قرآن میں جا بجا ملتا ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ روم کی ان آیتوں پر غور کیجیے:

"وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ۔"

اس کی نشانی میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر تم بشر ہوکر (زمین پر) پھیلتے چلے جا رہے ہو۔

"وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ "

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اُس نے تمھارے لیے تمھاری ہی جنس سے جوڑے بنائے تاکہ ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمھارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کردی ان میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔

" وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ "

اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور تمھاری زبانوں، تمھارے رنگوں کا اختلاف ہے، اور یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں دانشمند لوگوں کے لیے۔

" وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ "

اور اس کی نشانیوں میں تمھارا رات کو سونا اور دن کو تمھارا اُس کے فضل کو تلاش کرنا ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو (غور سے) سنتے ہیں۔

" وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْیٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۔

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ تمھیں بجلی کی چمک دکھاتا ہے، خوف کے ساتھ اور طمع کے ساتھ اور آسمان سے پانی برساتا ہے، پھر اس کے ذریعہ سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے، یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

" وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ۔

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں۔

جن نشانیوں کا ان آیات میں ذکر ہے ان سے ہر آدمی، ہر ملک اور ہر زمانے میں دوچار ہوتا رہا ہے، ان کا فہم و ادراک اس کے علم و تجربے کے مطابق ہوتا ہے۔ انسان کی تخلیق، اس کا روئے زمین

کے مختلف خطوں پر پھیل جانا۔ اس طرح کہ موسمی اور جغرافیائی حالات سے اس کے حیات کی مطابقت بھی ہو۔ قطب شمالی اور قطب جنوبی کے اسکیمو اور افریقہ کے خطِ استوا پر زندگی گزارنے والے حبشی دونوں انسان ہیں، لیکن ان کی طبعی تخلیق کی بنا پر ان کے منتشر ہو جانے کا التزام قابلِ غور ہے، اسی سے اللہ کی نشانی کا پتہ بھی چلتا ہے۔ زوجین کا ایک دوسرے کے لیے سکون اور راحت کا باعث بننا "تنازع البقا" میں ایک دوسرے کا ممد ہونا، نفسیات کے وہ اہم پہلو ہیں جن میں قدرت الٰہی کارفرما ہے، ارض وسماوات کی تخلیق، دنیا کے باشندوں کی زبانوں، نسل، رنگت، سیاہ، سفید، زرد، گندمی، اونچی ناک، چپٹی ناک، چھوٹا قد، اونچی قامت ــــ ان سب میں سمجھنے والوں، عقل والوں اور غور وفکر کرنے والوں کے لیے چھپی ہوئی نشانیاں ہیں۔

کلام پاک میں جہاں جہاں قدرت الٰہی کے مظاہر کا ذکر آتا ہے وہاں آیت کے خاتمے پر عموماً لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ، لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ یا لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ جیسے الفاظ کی ترکیب آتی ہے۔ گویا قاری کو دعوتِ فکر دی جاتی ہے کہ وہ ماسبق آیت کے مطابق اللہ کی نشانیاں علم اور تجربے کی مدد سے تلاش کرے۔ مثال کے طور پر ان آیتوں پر غور کیجیے:

"اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ۔"

(حقیقت کو پہچاننے کے لیے اگر کوئی نشانی درکار ہے تو) جو لوگ عقل سے کام لیتے ہیں ان کے لیے آسمانوں اور زمین کی ساخت میں، رات اور دن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں، ان کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں، بارش کے اس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے، پھر اس کے ذریعے سے زندگی بخشتا ہے اور اپنے اسی نظام کی بدولت زمین میں ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے، ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں جو آسمان اور

زمین کے درمیان تابع فرمان رکھے گئے ہیں، بے شمار نشانیاں ہیں۔

یہاں ذکر ہے زمین آسمان کی تخلیق کا، دن اور رات، ہواؤں کے رُخ کا، بارش، نباتات اور حیوانات کا، اور انسان کے ان سب سے مستفید ہونے کا۔ سورۂ النحل میں آیت ۷ سے ۲۱ تک یہی مضمون زیادہ شرح و بسط سے آیا ہے:

"حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب بڑا ہی شفیق اور مہربان ہے، اس نے گھوڑے اور خچر اور گدھے پیدا کیے کہ تم ان پر سوار ہو اور وہ تمہاری زندگی کی رونق بنیں۔ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ وہ اور بھی بہت سی چیزیں تمہارے فائدے کے لیے پیدا کرتا ہے جن کا تمہیں علم نہیں ہے۔ اور اللہ ہی کے ذمّے ہے سیدھا راستہ بتانا جب کہ راستے ٹیڑھے بھی موجود ہیں۔ اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا۔ وہی ہے جس نے آسمان سے تمہارے لیے پانی برسایا، جس سے تم خود بھی سیراب ہوتے ہو اور تمہارے جانوروں کے لیے بھی چارہ پیدا ہوتا ہے۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (اس میں بہت سی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں) اور بہت سی رنگ برنگ کی چیزیں اس نے تمہارے لیے زمین میں پیدا کر رکھی ہیں۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ (اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو سبق حاصل کرنے والے ہیں۔"

قرآن جن نشانیوں پر متوجہ کرتا ہے، ان کے اسباب و علل پر غور کیا جانا مقصود ہے۔ دل کا دھڑکنا زندگی کی علامت ہے، دل کی حرکت بند ہو جانے سے موت واقع ہوتی ہے، یہ بھی اللہ کی نشانی ہے۔ اسی نشانی پر جب طبّی انداز سے غور کیا گیا تو معلوم ہوا کہ دل کی حرکت فی منٹ ستّر بار ہوتی ہے، گویا ایک دن میں دل ایک لاکھ بار دھڑکتا ہے جس کی وجہ سے ½۴ ہزار سے ۹ ہزار کلوگرام خون شریانوں سے ہو کر گزرتا ہے۔ کسی کی عمر ۵۰ سال ہو تو اس کا دل ۴ ۲ کروڑ بار دھڑک چکا ہے، لیکن اس بات کا اسے مطلق احساس بھی نہیں ہوتا کہ اس کے جسم کے اندر ایسی کوئی بات ہو رہی ہے۔

قرآن مجید میں وضع قانون سے متعلق کل ۲۰۵ آیتیں آئی ہیں لیکن ۷۵۰ آیتیں ایسی ہیں جن میں مومنوں کو قدرت کے کارخانے پر غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے، عقل و فراست سے کام لینے کی تلقین

کی گئی ہے، اور اس طرح سائنسی فکر کو زندگی کا جز بنانے کی طرف صاف اور واضح اشارے دیے گئے ہیں۔ یہ ۷۵۰ آیتیں پورے کلام پاک کا آٹھواں حصہ ہیں۔ مذاہب عالم کی کوئی ایسی دوسری کتاب نہیں جس میں اس حد تک قدرت کے مشاہدے اور ان پر غور کرنے کی دعوت دی گئی ہو۔ علامہ سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں: "کفر انھیں کے دلوں میں پرورش پاتا ہے جو ان آیات الٰہی پر غور و فکر نہیں کرتے اور ان کی جلوہ گری سے حقیقی جلوہ آرا ہستی کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔" (سیرۃ النبی ج ۴ ص ۲۱۹) دوسرے لفظوں میں اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ توہمات اور شرک کے شائبے سے نکل کر توحید کی بنیادی تعلیم تک پہنچنے کے لیے قرآن مجید کی دعوت فکر کو سمجھنا ضروری ہے۔ سورج ہو یا چاند، ہمالیہ پہاڑ ہو یا دریائے گنگا، حیوانات ہوں یا نباتات، ان میں اپنے وجود کی کوئی ہستی نہیں سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کا ایک منظم قانون ان سب میں کارفرما ہے، اور ایسا منظم قانون وہی بنا سکتا ہے جو قادرِ مطلق ہے۔ ملائکہ کے بارے میں ہمارا ایمان ہے کہ وہ ایک خاص نوعیت کی مخلوق ہیں جو تفویض کیے ہوئے فرائض یا یوں کہیے کہ اللہ کے بتائے ہوئے اصولوں کے تحت بلا کم و کاست انجام دے رہے ہیں۔ اس کے سوا اور ان کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے ہیں۔ ہر جگہ قرآن میں یہی ارشاد ہوتا ہے کہ جو کچھ نظر آتا ہے، بارش کا ہونا، ہوا کا چلنا، بجلی کا چمکنا، نباتات کا اُگنا، ان سب میں کوئی فرشتہ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر رہا ہے، بلکہ وہ اللہ ہی ہے جو پانی برساتا ہے، جو ہواؤں کے چلنے کا حکم دیتا ہے وغیرہ۔ یہ تعلیم اس لیے ضروری تھی کہ اللہ کے تصوّر کے ساتھ کہیں فرشتے کی شرکت کا خیال بھی شامل نہ ہو جائے۔

توحید کے تصوّر کو خالص اور مستحکم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے کئی موقعوں پر نبی کریمؐ کی بشریت کے پہلو پر زور دیا ہے: "قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (کہہ دو میں تو ایک بشر ہوں تم جیسا)۔

ایمان کے اجزا میں یہ بھی ہے کہ تمام انبیاء کرام اور نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، سارے آسمانی صحیفوں اور آخری کتاب قرآن مجید پر ایمان لایا جائے۔ ۲۳ سال کی مدت میں جستہ جستہ قرآن کی آیتیں کس طرح نازل ہوتی رہیں، پھر حضرت عثمانؓ کے عہد میں ان سب کو مصحف کی صورت میں کیسے منضبط کیا گیا، یہ باتیں سب جانتے ہیں۔ جتنے لوگوں نے کلام پاک کو پڑھنے، سمجھنے کی کوشش کی ہے ان کی تعداد کا اندازہ لگانا ناممکن ہے۔ اس کلامِ ربانی کی حکمت، اعجاز بیان، فصاحت و بلاغت اور پیام کے مطالب پر ہر زمانے میں کتابیں لکھی گئی ہیں اور آئندہ بھی لکھی جاتی رہیں گی۔ علم میں اضافے کے ساتھ

ساتھ یہ سلسلہ جاری رہے گا، جیسے جیسے نشانیاں کھلتی جائیں گی، حقائق بے نقاب ہوتے جائیں گے، مطالب اور زیادہ واضح ہوتے رہیں گے۔ قرآن مجید کا پیغام ابدی ہے۔ اس میں بنیادی حقیقتیں ہیں جن کو سمجھانے کی خاطر ہر زمانے میں تفسیریں اور تشریحات لکھی جاتی رہی ہیں۔ انس بن مالک، ابن عباس، سعید بن جبیر، عکرمہ سے زمخشری، اور اردو زبان میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ان سب نے قرآن سمجھنے میں ہمیں روشنی عطا کی ہے جس کی بدولت ایسے مسائل جو ہماری فہم سے باہر تھے علوم اور تحقیقات کی مدد سے ان میں سے بہت سی باتیں واضح ہو گئی ہیں۔

قرآن کی سب سے پہلی پانچ آیتیں سورۂ علق کی ہیں: "اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ یہ پیغام اولیں ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے سامنے لے کر آئے۔ یہ پانچ آیتیں ایک طرح سے آنے والے پیغامات اور احکامات کی ابتدائیہ (Preamble) ہیں۔ پہلا لفظ اِقْرَأْ (پڑھ) ہے۔ پھر پڑھنے کا حکم دیا گیا۔ کیا پڑھنے کا حکم دیا گیا وہ ہے اپنے رب کا نام یعنی اس کی صفت۔ اللہ کا یہ حکم ایک ایسی جماعت کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے جو بد ترین قسم کے شرک اور توہمات میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ان کے نزدیک "رب" کا تصور لات و عُزّیٰ کی صورت میں تھا، وہ لوگ ہُبل اور منات میں شان ربوبیت دیکھتے تھے۔ اس باطل تصور کو توڑنے کے لیے ضروری تھا کہ انھیں بتایا جائے کہ اس رب کے نام کے ساتھ پڑھا جائے جس نے انسان کو جمے ہوئے خون کے لوتھڑے سے تخلیق کیا۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ عالم کون و مکاں میں متجلّی آفتاب، ضیا رپاش ماہتاب، عریض سمندر، بلند قامت کوہ، درخشندہ ستارے اور چیونٹی جیسی حقیر شے سے وھیل جیسی عظیم الجثہ جاندار کی موجودگی میں اللہ تعالیٰ نے پیغام اول میں انسان ہی کی تخلیق کا ذکر کیوں کیا؟ یوں تو پورے عالم کی ہر ذی روح کی تخلیق کا عمل بالخصوص رحم مادر میں گزرنے والے مراحل خداوند قدوس کی عجیب ترین صناعی اور اس کی قدرت کا مظہر ہوتا ہے لیکن تخلیق انسانی کا عمل سب سے زیادہ حیرت انگیز ہے۔ یہاں نہ صرف جسمانی ساخت کی تدریجی منزلیں عجیب و غریب ہوتی ہیں بلکہ پیدا ہونے والے بچے میں جین (Gene) کی اہمیت، جس سے آگے چل کر عقل، تمیز اور شعور کی خصوصیات پیدا ہوتی ہیں، اس کی صلاحیتیں اور نفسیات کی تشکیل پاتی ہیں، قدرت کا ایسا کرشمہ ہے جو انسانی فہم سے بالاتر ہوتا ہے۔ پورے نظام فطرت میں اس کی جیسی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ

نے اسی بات کو لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ میں واضح کر دیا ہے۔ کبھی یہی "بہترین ساخت" کا انسان اپنی بداعمالیوں اور صلاحیتوں کے غلط استعمال کی وجہ سے اَسْفَلَ السّافِلِیْن بن جاتا ہے۔ یہی وہ خصوصیت ہے جو انسان کو دوسرے تمام جانداروں سے ممیز کرتی ہے۔ پہلی وحی اسی بنیادی خصوصیت کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ اس کے بعد "قلم" کی بات آتی ہے، جو نہ صرف علم کے حصول کا آلہ ہے بلکہ علم کی علامت بھی بن جاتا ہے، اسی کے ذریعے انسان نے وہ سب کچھ جانا جو وہ نہیں جانتا تھا۔ جس علم پر انسان ناز کرتا ہے وہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا فیضانِ رحمت ہے۔ خلائی سفر ہو یا کمپیوٹر کے محیرالعقول کرشمے، ایٹمی طاقت کی دریافت ہو یا سمندر کی عمیق گہرائیوں کی تحقیق۔ یہ سارا علم اسی ذات باری کا کرم ہے جسے "رحمٰن" اور "رحیم" کہا جاتا ہے۔

ان معروضات سے شاید یہ خیال گزرے کہ یہ سب توحید کی تاویلات مادی پہلو سے ہوئیں، روحانی طریقوں کو نظر انداز کر دیا گیا۔ یہ صحیح ہے کہ حق شناسی اور راہ سلوک کی منزلیں دوسرے انداز سے طے کی جا سکتی ہیں، لیکن جو کچھ اب تک کہا گیا وہ ان سے بہت جدا بھی نہیں۔ مشہور صوفی بزرگ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کا واقعہ ہے کہ ایک روز کوئی شخص حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر مسئلہ توحید دریافت کرنے لگا۔ اپنا مرض ظاہر کرتے ہوئے اس نے کہا "حضرت! دل جمتا نہیں کہ خدا ہے" حضرت نے بڑے زور سے چیخ ماری کہ "گو میں ان کو نہیں دیکھتا ہوں مگر ان کی قدرت کو ضرور دیکھتا ہوں"۔

ایمان کا ایک جز یہ بھی ہے کہ پچھلے انبیاء کرام اور ان پر نازل کیے ہوئے صحیفوں پر بھی ایمان لایا جائے۔ کوئی یہ پوچھ سکتا ہے کہ جب کہ قرآن ہمارے سامنے صحائف آسمانی کے آخری ایڈیشن کی صورت میں موجود ہے تو پھر پچھلے انبیاء اور ان کے صحیفوں پر ایمان لانے کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے؟ جب کہ پچھلی کتابوں میں اتنی تحریف ہو چکی ہے کہ موجودہ شکل میں انھیں آسمانی کتاب کہنا ہی مشکوک ہو گیا ہے۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ اگر رسول اللہ سے پہلے آنے والے نبیوں کی بات نہ ہوتی اور صرف محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لانا کافی ہوتا تو یہ عین ممکن تھا کہ اہل اسلام رسول کے بجائے محمدؐ کو الوہیت کے مقام پر پہنچا دیتے اور توحید کا تصوّر ہی زائل ہو جاتا۔ لوگ اسلام کو ایک نیا دین ماننے لگتے اور زمان و مکان کے لحاظ سے احکام الٰہی کی جو تدریجی صورت انبیاء کرام کے سلسلے سے پیدا ہوئی وہ نہ ہوتی۔ قرآن کریم میں انبیاء کرام اور ان کی بنیادی تعلیم کا جس طرح ذکر آیا ہے وہ اسی سلسلے کی نشان دہی کرتا ہے۔

ترتیب: مولانا شفیق الرحمٰن ندوی

عالم اسلام کی علمی و ثقافتی سرگرمیاں

ہفت روزہ المجتمع کویت کے مطابق عالمی اسلامی رفاہی ادارہ " الھیئۃ الخیرۃ الاسلامیۃ العالمیۃ " کے صدر شیخ یوسف جاسم الحجی نے اپنے ایک بیان میں ادارہ کی خدمات اور اس کی کارگزاریوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا ہے کہ اپنے قیام کی مختصر مدت میں ادارہ نے تیرہ ملکوں پر مشتمل ۹۵ منصوبوں کے لیے سرمایہ فراہم کیا ہے، ان منصوبوں میں مساجد کی تعمیر، مدارس، قرآن مجید اور دیگر اسلامی علوم کے لیے کالج کا قیام، ٹیوب ویل، طبی مراکز، اسلامی اکیڈمیاں اور دیگر پروگرام شامل ہیں۔ مجموعی طور سے اب تک ۸۰ لاکھ ۵۹ ہزار ۲۹۱ ڈالر کی رقم صرف کی جا چکی ہے۔ اس رقم سے فیضیاب ہونے والوں میں مسلم ممالک بھی ہیں اور غیر مسلم ممالک بھی ہیں اور غیر مسلم ممالک میں آباد مسلم اقلیتیں بھی ہیں۔

الھیئۃ الخیریۃ الاسلامیۃ العالمیۃ ایک نومولود ادارہ ہے، اس کے قیام پر ابھی چند برس گزرے ہیں، عالم عرب کے مشہور دانشور اور عالم ڈاکٹر یوسف القرضاوی کی دعوت پر، ۱۸ رمضان ۱۴۰۳ھ مطابق جون ۱۹۸۳ء کو کویت میں عالم عرب اور دیگر مسلم ممالک کے ۵۰ ممتاز افراد جمع ہوئے اور اس ادارہ کی داغ بیل ڈالی، نیز طے ہوا کہ اس کا صدر مقام کویت میں ہو، اور دوسرے ممالک میں اس کی شاخیں قائم کی جائیں، کویت کی حکومت سے منظوری حاصل کرنے کے لیے اس کی باضابطہ درخواست دی گئی تاکہ کام میں رکاوٹ پیش نہ آئے۔ ۱۵ شوال ۱۴۰۶ھ میں ادارے کے قیام کا قانون پاس ہوا اور ۴ جمادی الآخرۃ ۱۴۰۷ھ میں ایک شاہی فرمان کے ذریعہ اس کا اعلان ہوا۔ اس طرح اس رفاہی ادارے کو کویت میں اپنا صدر دفتر قائم کرنے اور کام کرنے کا قانونی جواز حاصل ہو گیا۔

بنیادی ارکان نے اپنے اندر سے اکیس افراد پر مشتمل ایک انتظامی کونسل قائم کی ہے۔ شیخ یوسف جاسم الحجی اس کے صدر، شیخ صالح عبدالرحمٰن الحصین نائب صدر، شیخ عیسیٰ عبداللہ آل خلیفہ سکریٹری اور شیخ احمد بزیغ الیاسین خازن منتخب ہوئے ہیں، دیگر ممتاز ارکان میں رابطہ عالم اسلامی کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف، شریعت کالج قطر کے پرنسپل ڈاکٹر یوسف القرضاوی، اردن کے سابق وزیر اوقاف ڈاکٹر اسحق الفرحان، اور پاکستان کے دانشور پروفیسر خورشید احمد شامل ہیں۔

ہفت روزہ 'البلاغ' کویت کے مطابق اس رفاہی ادارہ کے اغراض و مقاصد یہ ہیں :

۱۔ بھوکے کو کھانا، ننگے کو لباس، اور مریض کو علاج کی سہولتیں بہم پہنچانا، یتیموں کی خبر گیری کرنا، ظلم و تشدد کا نشانہ بنا کر بے گھر کیے گئے لوگوں کے لیے ٹھکانہ فراہم کرنا۔

۲۔ قحط سالی، وباؤں اور حوادث کا شکار ہونے والوں کو بروقت امداد بہم پہنچانا۔

۳۔ بے روزگار لوگوں کو باروزگار بنانا، کام کرنے والوں کو تربیت دلا کر معاشرے کے لیے مفید بنانا، سرمایہ کاری کے پروگراموں میں شرکت کر کے کمزور مسلم ممالک کے ساتھ تعاون کرنا۔

۴۔ قرآن و سنت کے نفاذ کے لیے اسلامی شعور عام کرنا۔

۵۔ حکمت و دانش اور موعظۂ حسنہ کے ذریعہ اسلام کا پیغام غیر مسلموں تک پہنچانا، حق کی وضاحت اور اس پر پڑے ہوئے گمراہیوں اور دجل و فریب کے پردے کو چاک کرنا۔

۶۔ ناخواندگی دور کرنے اور قرآن و سنت کی تعلیمات کو عام کرنے کے کاموں میں حصہ لینا۔

اس فلاحی ادارہ کا ایک بڑا وصف اس کا انٹرنیشنل ہونا ہے، یہ تمام مسلمانوں کا ادارہ ہے، خواہ وہ عالم اسلام میں رہتے ہوں یا عالم اسلام سے باہر کسی ملک میں بحیثیت اقلیت رہتے ہوں، اس کے بنیادی ارکان اور انتظامی کونسل سے لے کر سرمایہ کی فراہمی اور سرمایہ کاری، غرض ہر سطح پر یہ ایک عالمی رفاہی ادارہ ہے، اس کے تعاون سے مستفید ہونے والے ممالک میں افریقہ اور ایشیا کے ممالک سر فہرست ہیں، چنانچہ جن ممالک میں طبی مراکز قائم کیے گئے ہیں ان میں صومال اور بنگلہ دیش خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

اس عالمی اسلامی ادارے کے قیام کے پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے ہفت روزہ 'البلاغ' نے لکھا ہے، افلاس، ناخواندگی، امراض اور دیگر آفات کے سبب متعدد مسلم ممالک اور مسلم اقلیتیں مصائب و آلام کی شکار ہیں اور اقتصادی و معاشرتی دباؤ کے تحت زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ اقوام متحدہ، عالمی بنک اور

دیگر بین اقوامی تنظیموں کی طرف سے فراہم کردہ اعداد و شمار کے مطابق ۴۲ ممالک غربت و افلاس کی سطح سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں، ان میں ۲۵ ممالک افریقہ میں واقع ہیں اور آٹھ ممالک ایشیا میں واقع ہیں، ان کی بیشتر تعداد مسلم ممالک سے تعلق رکھتی ہے یا مسلمان وہاں اقلیت کی حیثیت سے رہ رہے ہیں، غربت و افلاس کے سبب ناخواندگی عام ہے، طبی سہولتیں نایاب ہیں، ان حالات سے عیسائی مشنریاں فائدہ اٹھاتی ہیں اور مالی تعاون، تعلیم اور علاج کے نام پر مسلمانوں کے دین و ایمان پر شب خون مارتی ہیں، دیگر اسلام مخالف تحریکیں بھی مسلمانوں کا استحصال کرتی ہیں۔ شدت سے اس امر کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ مسلمانوں کا کوئی ایسا ادارہ وجود میں آئے جو اس خلار کو پُر کرے، اسی احساس نے اخوانی دانشور ڈاکٹر یوسف قرضاوی کو مضطرب کیا، چنانچہ ان ہی کی اپیل اور کوششوں کے نتیجے میں یہ ادارہ قائم ہوا ہے۔ شیخ یوسف جاسم الحجی کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ عالم اسلام کی طرف سے اس ادارہ کی پذیرائی ہوئی ہے اور سال دو سال کے مختصر عرصہ میں ادارہ ۵۹ منصوبوں کو شروع کرنے اور پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب ہوا۔ بلاشبہ یہ ایک مبارک اقدام ہے اس کے ذریعہ عیسائیت اور قادیانیت کے خلاف بھرپور مزاحمت کی جاسکتی ہے۔

پیکنگ میں اسلامی سمپوزیم:

گزشتہ دنوں عوامی جمہوریہ چین کے صدر مقام پیکنگ میں ایک اسلامی سمپوزیم ہوا جس کے پروگرام مسلسل پانچ روز جاری رہے، اس سمپوزیم کا انتظام چین کے مسلمانوں کی مرکزی تنظیم نے رابطہ عالم اسلامی کے تعاون سے کیا تھا، اس پروگرام میں چینی مسلمانوں کے علاوہ بڑی تعداد میں بیرونی علمار و مفکرین نے بھی شرکت کی۔

چین میں کمیونسٹ حکومت ہے، کمیونسٹ اسلام کو اپنا دشمن نمبر ایک سمجھتے ہیں اور اس کو مٹانے میں ہر حربہ استعمال کرتے ہیں، لیکن مسلمان بڑے سخت جان واقع ہوئے ہیں، جان و مال کی قربانیاں پیش کرتے ہیں لیکن دین سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہوتے، اپنا تشخص برقرار رکھنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں، روس میں اسٹالن مسلمانوں کے لیے قہر بن کر نازل ہوا، سرزمین روس سے اسلام کی آواز مٹانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ لیکن اسلام اسٹالن کے زمانے میں بھی زندہ رہا، خروشچوف

کے زمانے میں بھی باقی رہا اور آج بھی زندہ اور باقی ہے۔

چین میں بھی وہی سبق دُہرایا گیا، ماوزی تنگ کے ثقافتی انقلاب کا خاص نشانہ مسلمان تھے ہزاروں مسجدیں مسمار کردی گئیں، لاکھوں مسلمان ابتلاء و آزمائش کا نشانہ بنے لیکن اسلام ان کے دلوں سے نہ نکلا بجان ومال کی قربانیاں دیں، لیکن دین قربان کرنے کے لیے روادار نہ ہوئے، چین میں کیونسٹ انقلاب ۱۹۴۹ء میں آیا، اس وقت سے مسلمانوں پر مسلسل دباؤ پڑ رہا ہے، اگر کوئی دوسرا دین ہوتا تو کب کا قصۂ پارینہ بن چکا ہوتا، لیکن ۴۲ سال کے جبر و تشدد کے باوجود مسلمانوں کے سر سے اسلام کا سودا نہیں نکلا۔

سمپوزیم سے واپس آنے والوں کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ چین کی کیونسٹ حکومت نے چولا بدلا ہے، مسلمانوں کے بارے میں پالیسی نرم کی ہے، مسلمان اس نرمی سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، پرانی مسجدوں کی مرمت ہو رہی ہے، بعض نئی مسجدیں بھی تعمیر ہو رہی ہیں، دینی مدارس کے قیام کی بات بھی سوچی جا رہی ہے، شریعت کے مطابق زندگی گزارنے کی محدود سہولت ملی ہے تو مسلمانوں میں اس کے اثرات ظاہر ہونا شروع ہوئے ہیں، مسلمان مرد ٹوپیاں استعمال کرنے لگے ہیں جو انھیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہیں، عورتوں میں حجاب کا رواج بڑھا ہے، باجماعت نماز پڑھنے والوں کی تعداد روز افزوں ہے، ان کے بچے دن میں سرکاری اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں لیکن شام کو مساجد اور مکاتب میں دینی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے تئیں چینی حکومت کی پالیسی یکسر بدل گئی ہے لیکن موجودہ نرمی سے یہ فائدہ ضرور ہوا ہے کہ باہر کے مسلمانوں سے ان کا رابطہ پچاس برس بعد قائم ہوا ہے۔ حالیہ سمپوزیم اس کی ایک کڑی ہے، رابطہ عالم اسلامی نے اس موقع سے بروقت فائدہ اٹھایا ہے۔ پیکنگ میں پنج روزہ سمپوزیم کے دوررس نتائج برآمد ہوں گے اس کے ذریعہ چینی مسلمانوں کے اندر امت مسلمہ کی ایک اکائی ہونے کا احساس بیدار ہوا ہوگا، اور ان کے دلوں کو حرارتِ ایمانی سے گرمانے کا سبب بنا ہوگا۔

مالدیپ میں دعوت اسلامی کانفرنس:

عرب اخبارات کے بموجب جزائر مالدیپ کے پایۂ تخت مالیہ میں ۷ رتا ۱۲ر دسمبر ۱۹۸۵ء دعوت اسلامی کی بین اقوامی کونسل کا اجلاس ہوا۔ جس میں کثیر تعداد میں مختلف ممالک تنظیموں اور جماعات کے نمائندے شریک ہوئے، قبل ازیں اس کے تین اجلاس مغرب کے شہر طرابلس، الدار البیضاء اور افریقی ملک مالی کے

دارا[illegible] باکو ما میں ہو چکے ہیں، یہ اس کا چوتھا اجلاس تھا۔

کانفرنس کا افتتاح مالدیپ کے صدر مامون عبدالقیوم نے کیا جو جامعہ ازہر کے فارغ ہیں۔ اس کانفرنس میں شریک ہونے والوں میں ایک اہم شخصیت مؤتمر عالم اسلامی کے جنرل سکریٹری شریف الدین پیرزادہ کی تھی، جنھوں نے افتتاحی جلسہ میں ایک اہم تقریر کی۔ افریقہ کے مشہور داعی اور عالم شیخ احمد دیدات بھی شریک جلسہ تھے اور کانفرنس کی نشستوں میں سرگرم حصہ لیا، کانفرنس میں جو اہم موضوعات زیر بحث آئے ان میں چند یہ ہیں :

١۔ دعوت اسلامی کے عالمی فنڈ کمیٹی کی رپورٹ۔

٢۔ افریقی ممالک میں عیسائیت کا جائزہ لینے والی کمیٹی کی رپورٹ۔

٣۔ عالم اسلام کے مسائل و مشکلات اور ان کے حل کی کوششیں۔

٤۔ مسلم اقلیتوں کے حالات و مسائل اور ان کے ساتھ تعاون کرنے کی صورتیں۔

٥۔ دعوتی کاموں میں مسلمان عورت کا کردار۔

کانفرنس میں لبنان، افغانستان، عراق ایران جنگ اور فلپائن میں تحریک آزادی کے حالات پر خاص طور سے غور ہوا، ایک قرارداد کے ذریعہ حرمین شریفین کو سیاسی اغراض کے لیے استعمال کرنے کی مخالفت کی گئی، اور ان کے تقدس کی حفاظت پر زور دیا گیا۔

مالدیپ ہندوستان کے جنوب مغرب میں بحر ہند میں واقع چھوٹے چھوٹے ١٢٨٦ جزیروں پر مشتمل ہے، ان میں سے بعض جزیرے ہنوز غیر آباد ہیں اور بعض جزیرے سیاحت کے لیے مخصوص ہیں، یہاں پر سیاح ہر قسم کی حرکتیں کرتے ہیں اس لیے جزیروں میں مقامی آبادی کا داخلہ ممنوع ہے تاکہ سیاحوں کے میل جول سے ان کے اندر برائیاں پیدا نہ ہوں۔

ملک کی آبادی کل ایک لاکھ تیس ہزار ہے جو سو فیصدی مسلم آبادی ہے، اس کے صدر مامون عبدالقیوم اور بعض دوسرے وزرا جامع ازہر کے تعلیم یافتہ ہیں۔ مقامی زبان کے علاوہ عربی وہاں کی متداول زبان ہے۔ توقع ہے کہ دعوت اسلامی کانفرنس کے مقامی آبادی پر مثبت اثرات مرتب ہوئے ہوں گے اور عالم اسلام کے ساتھ مربوط ہونے کا احساس قوی ہوا ہوگا۔

---

(۲) حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی کی اصلاحی ودعوتی تقریروں کا دوسرا سیٹ (۲)

مجموعۂ اصلاحیات مولانا ابوالحسن علی ندوی:

۶۔ "تحفۂ کشمیر": ان تقریروں وخطبات کا مجموعہ جو اکتوبر ۱۹۸۱ء میں سری نگر کشمیر کے مختلف اجتماعات وتقریبات کے موقعوں پر کئے گئے۔

"..... قرب مکانی، مسائل ومشکلات سے ذاتی واقفیت اور مقرر کی عمر وتجربہ کی پختگی کی بنا پر ان تقریروں میں بعض ایسے حقائق ومضامین آگئے ہیں جو نہ صرف اہل کشمیر بلکہ بیشتر اسلامی ممالک کے اہل فکر ونظر کے لائق توجہ اور مستحق غور وفکر ہیں" (صرف اردو میں دستیاب ہے)

۷۔ "تحفۂ دکن": حیدرآباد واورنگ آباد کے مختلف اجتماعات ومجالس (اکتوبر ۱۹۸۲ء) کی وہ تقریریں جن میں دینی وعلمی رہنمائی، ایک داعیٔ دین اور باخبر وصاحب فکر عالم کے نقطۂ نظر سے حالات حاضرہ کا جائزہ لیا گیا ہے اور ملت اسلامی ہند کے باشعور اور ذمہ دار طبقہ کی ذمہ داریوں اور فرائض کی نشاندہی کی گئی ہے (صرف اردو میں دستیاب ہے)

۸۔ "تحفۂ مشرق": سفر بنگلہ دیش (مارچ ۱۹۸۴ء) کی تاریخی فکر انگیز وایمان افروز تقریریں جن میں بصیرت ایمانی، مطالعۂ قرآنی اور حقیقت پسندی سے کام لیا گیا ہے اور جن میں مسلمان دانشوروں، ذمہ داروں، مسلم معاشرہ کے لئے کس طور پر دعوت فکر وعمل موجود ہے (اردو میں دستیاب ہے)

۹۔ "تحفۂ دین ودانش": دورۂ مالوہ اجین واندور (نومبر ۱۹۸۳ء) کی تقریروں کا مجموعہ جن میں ملک تیزی سے بدلتے ہوئے بگڑتے ہوئے حالات، اخلاقی بحران، مسلم معاشرے کی تشویشناک کمزوریوں اور بیماریوں کی نشاندہی وعلاج بتایا گیا ہے اور دینی تعلیم کی ضرورت واہمیت کا احساس دلایا گیا ہے اور اس کی طرف سے مسلمانوں کی غفلت پر تنبیہ اور تشویشناک نتائج سے آگاہ کیا گیا ہے، یہ عملی دعوت وتبلیغ اور ایک نقشۂ عمل (صرف اردو میں دستیاب ہے)

۱۰۔ "تحفۂ پاکستان": مولانا ندوی کی وہ اہم اور فکر انگیز تقریریں جو دورۂ پاکستان (جولائی ۱۹۷۸ء) کے موقع پر مختلف اجتماعات، جامعات ومدارس کراچی، اسلام آباد، فیصل آباد اور لاہور میں کی گئیں، ان تقریروں نے دماغ کو جھنجھوڑا اور دل کے تاروں کو بھی چھیڑا اور ملک وملت کے مسائل میں از سرنو سوچنے سمجھنے اور عمل کرنے کی ایک تحریک پیدا کردی، جن میں دوسرے علاقوں کے حقیقت پسند، دانشور اور ملک وملت کا درد رکھنے والے حلقوں کے لئے بھی سامان موعظت اور غور کرنے کے لئے ایک اہم مواد ہے (صرف اردو میں)

نوٹ: قیمتیں ہماری فہرست کتب میں ملاحظہ فرمائیے۔

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، پوسٹ بکس ۱۱۹، لکھنؤ
(ندوۃ العلماء)

REGD. NO. D (SE)/53

ZIKR-O-FIKR

Reg. No. 45862/86

Vol. III, Part 5

March-198?

G 1/278, Okhla, P.O. Jamia Nagar New Delhi-110025

① حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی کی اصلاحی و دعوتی تقریروں کا پہلا سیٹ ①

مولانا ندوی نے جن اہم اسلامی ممالک و اہم علاقوں کا ملک و بیرون ملک دورہ فرمایا وہاں انھوں نے وہاں کے مخصوص حالات اور مسائل کو سامنے رکھ کر اپنے تاریخی مطالعہ کا نچوڑ، قرآن سے استفادہ کا لب لباب اور اپنا درد دل رکھا، ان تقریروں اور خطبات میں ایسے حقائق و مشاہدات آگئے ہیں اور ان میں جو دعوت و پیغام اور نقشۂ عمل پایا جاتا ہے وہ نہ صرف اُن علاقوں کے لئے جہاں یہ تقریریں ہوئیں بلکہ وہ بیشتر اسلامی ممالک اور دوسرے علاقوں کے اہل فکر و نظر کے لئے لائق توجہ اور مستحق فکر و نظر ہیں، اس سلسلے کے حسب ذیل مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں جن کی قیمتیں ہماری فہرست کتب سے معلوم ہو سکتی ہیں

مجموعۂ اصلاحیات مولانا ابوالحسن علی ندوی

۱۔ "مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں":۔ جس میں بڑی جرأت کے ساتھ مغربی تہذیب کے نقائص پر نکتہ چینی اور مشرق کے پرستاران مغرب کی غلامانہ ذہنیت اور اندھی تقلید پر صاف صاف تنقید کی گئی ہے اور مشرق و مغرب کی درمیانی خلیج کو پاٹنے اور انسانیت کی صحیح رہنمائی و خدمت کے لئے ایک راہ اعتدال کی نشاندہی کی گئی ہے، (عربی اردو اور انگریزی تینوں زبانوں میں دستیاب ہے)

۲۔ "پیام انسانیت":۔ پبلک جلسوں کی پانچ اہم تقریریں جن میں زندگی کے مسائل پر نئے طرز سے سوچنے اور نئے طریقے پر کوشش کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

(فی الحال اُردو و ہندی دونوں زبانوں میں دستیاب ہے)

۳۔ "مقام انسانیت":۔ مخلوط اجتماعات کی پانچ اہم تقریریں جن میں اغراض و تعصبات، قوم پرستی اور سیاسی مقاصد سے بالاتر اور بالکل آزاد و بے تعلق ہو کر عام انسانوں کے سامنے وہ حقیقتیں رکھی گئی ہیں جن پر انسانیت کی نجات اور سلامتی موقوف ہے اور جن کو نظر انداز کر کے ہمارا یہ پورا تمدن اور پوری انسانی سوسائٹی اس وقت سخت خطرہ سے دوچار ہے۔

(فی الحال صرف اُردو اور ہندی میں دستیاب ہے)

۴۔ "نئی دنیا امریکہ میں صاف صاف باتیں":۔ مولانا ندوی کی ان اہم تقریروں اور خطبات کا فکر انگیز مجموعہ جو انھوں نے امریکہ و کنیڈا میں کی تھیں جن میں مغربی تہذیب و امریکی معاشرہ کا جائزہ، تجزیہ و مطالعہ پیش کیا، اور امریکہ میں مقیم مسلمانوں کے بارے میں مشورے، تجربے اور اندیشے ظاہر کئے ہیں۔ (عربی، اُردو، و انگریزی تینوں زبانوں میں دستیاب ہیں)

۵۔ "پاجا سراغ زندگی":۔ طلبائے علوم نبوت کا منصب و مقام، ملت کی ان سے توقعات، عصر حاضر میں ان کی ذمہ داریاں، طلباء و علماء مدارس کے لئے ایک مفید و اہم تحفہ (صرف اُردو میں)

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام پوسٹ بکس ۱۱۹ لکھنؤ

(ندوۃ العلماء)

Printed at Lahooti Print Aids, Jama Masjid, Delhi-110006
and published by Syed Taha Abdullah, G 1/278, Okhla,
P.O. Jamia Nagar, New Delhi-110025

ایک علمی، دینی اور ادبی ماہنامہ،

ذکر و فکر (دہلی)

مرتبہ

خواجہ احمد فاروقی

مجلس ادارت

خط وکتابت کا پتہ

جی ۱/۲۷۸ اوکھلا، ڈاکخانہ جامعہ نگر، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵

ایڈیٹر : خواجہ احمد فاروقی

منیجر : محمد شبیر ندوی

پرنٹر پبلیشر : ط عبداللہ

مطبع : لاہوتی پرنٹ ایڈس، جامع مسجد دہلی-۶

قیمت : ۵۰/ روپے (سالانہ) فی پرچہ ۵/

غیر ممالک سے ۲۰ ڈالر (یا اس کے بالمقابل سکہ ہندوستانی روپے میں)

تمام پرچے ہوائی ڈاک سے بھیجے جائیں گے اور وی پی نہیں بھیجی جائے گی

نوٹ

رقم، ڈرافٹ یا منی آرڈر کے ذریعہ ہی ارسال فرمائیں۔ اگر چیک سے رقم بھیجنا ہو تو مزید [illegible] روپے مصارف بنک کا اضافہ کرکے بھیجیں۔ نیز ڈرافٹ، منی آرڈر یا چیک مندرجہ ذیل پتہ پر بھیجیں:

ZIKR-O-FIKR (Monthly)
G 1/278, OKHLA JAMIA NAGAR
NEW DELHI 110025

ماهنامہ

ذکر و فکر

دھلی

جلد : ـــــــ (۳) شعبان ـــــــ ۱۴۰۸ھ

شمارہ : ـــــــ (۶) اپریل ـــــــ ۱۹۸۸ء

ترتیب

مُذاکرات

پیشہ تھا اشتہارات کے لیے مضمون تیار کرنا، عرب تاجروں کی برطانیہ میں ترجمانی کرنا، کسی نے یہ سوجھا دیا کہ قرآن کا ترجمہ انگریزی میں کرڈالو، ترجمہ تیار ہوگیا، بڑے بڑے پبلشروں نے ہاتھوں ہاتھ لیا، ایڈیشن پر ایڈیشن نکلنے لگے، زبان رواں جیسے ناول کی ہو، محاورے ایسے جیسے لندن میں کسی تھیٹر کا ڈائلاگ ہو۔

اشتہار نویسی کا ذہن، کوئی نہ کوئی اچھوتا اور سنسنی خیز قسم کا انداز ضروری تھا، لہذا نیا انداز یہ اختیار کیا کہ قرآن کی سورتوں کی ترتیب بدل ڈالی، نہ باعتبار نزول اور نہ باعتبار ترتیب رسول، بلکہ ایک سب سے نئی اور نرالی ترتیب۔ اس سورہ میں نغمہ و ترنّم زیادہ ہے، لہذا یہ پہلے، اس سورہ میں نغمگی کم ہے اس کو بعد میں۔ اس طرح پورا قرآن تختۂ مشق بن گیا۔

اسلام کے قلعہ پر کسی شیش محل سے کوئی سنگ باری کرے وہ انٹلکچول (INTELLECTUAL) ترقی پسند (PROGRESSIVE) وسیع فکر کا مالک (OPEN MINDED) بن ہی جاتا ہے جس کے لیے نہ کسی صلاحیت کی ضرورت ہے نہ علم و تحقیق کی۔ اتنا کافی ہے کہ مذہب کی تحقیر میں کسی طرح نو کا بانی یا کسی بدزبان کا مقلد ہو، اشتہار نویس نے یہی نہیں کیا کہ سورتوں کی ترتیب میں تحریف کی بلکہ بہت سے الفاظ کا ترجمہ بھی نظر انداز بھی کر دیا، حروف تاکید و حصر اِنَّ، اَنَّ، اِنّما کو یکسر فراموش کر دیا، حروف عطف واؤ و فاء کو بے معنی قرار دیا، جملے کی ساخت بدل دی، بہتیرے الفاظ بڑھا دیے، کچھ الفاظ کم کر دیے، تاکہ نغمگی و ترنّم کی فضا قائم رہے۔

اس شخص کا نام 'داؤد' ہے، عراق کا باشندہ ہے، اور مذہبًا اور نسلاً یہودی ہے، اس کا صحیح نام پتہ ۱۹۷۱ء تک کسی کو نہیں معلوم تھا، ڈاکٹر عبدالکریم المہنا، ازہری عالم نے قرآنی ترجموں کا تعارف

کرایا ہے اس میں اس کو 'مجھول الھویۃ'[۱] لکھا تھا۔ ۱۹۸۲ء کے ایڈیشن میں اس کے چہرے سے نقاب اٹھائی گئی، اور بتایا گیا کہ اس کا مبلغ علم کیا ہے، اور یہ کون ہے ؟

یہاں تک تو یہ ناقابلِ برداشت بات مجبوری و لاچاری کی وجہ سے قابل برداشت تھی اب نئی صورت حال یہ پیش آئی ہے کہ ہمارے نئے نئے عرب" انگریزی دانوں" کو یہ ترجمہ بہت پسند آ رہا ہے، صحافتی زبان کا چٹخارہ، ناول اور تھیٹر کے مکالموں کا اسلوب انھیں اس ترجمہ سے قریب اور قرآن سے دور کر رہا ہے۔

اس کا علم اس طرح ہوا کہ گزشتہ تین سال سے لندن میں چند عرب اہلِ قلم، سید قطب شہیدؒ کی مشہور تفسیر فی ظلال القرآن کا انگریزی میں ترجمہ کر رہے ہیں، الظلال کا مطالعہ جن لوگوں نے کیا ہے ان کو معلوم ہے کہ اس کا ترجمہ آسان نہیں ہے۔ خالص لسانیاتی تصورات ایک خاص طرزِ نگارش میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس میں وہ لوگ کہاں تک کامیاب ہیں اس کو ہم بھی جانتے ہیں اور ان کو بھی اعتراف ہے۔ لیکن انھوں نے ظلم یہ کیا ہے کہ قرآن کا انگریزی میں ترجمہ زیادہ تر اسی یہودی کے ترجمے سے بغیر کسی ترمیم کے نقل کر لیا ہے۔ دعویٰ یہ کیا ہے کہ ہمارا ترجمہ مقلدانہ نہیں، مجتہدانہ ہے۔ لیکن اس اجتہاد کی حقیقت یہ ہے کہ ایک آیت کا ترجمہ آربری سے لیا، دوسری تیسری آیتوں کا ترجمہ داؤد سے نقل کیا۔ کہیں کہیں پر کسی فعل، متعلق فعل کو بدل دیا اور ایک نیا، اچھوتا، غیر مقلدانہ اور مجتہدانہ ترجمہ تیار ہو گیا۔

قرآن کریم کے یہ نادان دوست، دانا دشمنوں سے زیادہ ضرر رساں ثابت ہو رہے ہیں۔

---

[۱] راقم نے ۱۳۹۱ھ میں ترجمات معانی القرآن وتطور فہمہ عند الغرب لکھی تھی اس وقت تک اس ترجمہ کا سرسری علم تھا، اس لیے فہرست میں نام دے دیا تھا، بعد میں جب اس کا مطالعہ کیا تو رمضان ۱۴۰۲ھ میں ایک مفصل تبصرہ لکھا جس کو جدہ کے روزنامہ 'المدینۃ' نے شائع کیا۔ ڈاکٹر عبدالکریم المہنا نے اسی موضوع پر ایک کتاب ۱۴۰۲ھ میں شائع کی ہے اس میں داؤد کے بارے میں لکھا ہے کہ کوئی غیر مسلم عرب ہے۔

یورپین دانشورانِ علوم مشرقیہ (جن کو مستشرقین کہا جاتا ہے) نے قرآن کریم کو دجل و تحریف کے ساتھ غلط رنگ دے کر، ایک بدنما اور بھیانک شکل میں پیش کیا تو ان سے توقع بھی یہی تھی۔ جارج سیل کے ترجمۂ قرآن (جو ۱۷۳۴ء میں شائع ہوا تھا) کے مقدمہ نگار سر ڈنسن روز Sir Denison Rose نے یہ اعتراف کیا ہے:

" FOR MANY CENTURIES THE ACQUAINTANCE WHICH THE MAJORITY OF EUROPEANS POSSESSED OF MOHAMMADANISM WAS BASED ALMOST ENTIRILY OF DISTORTED REPORTS OF FANATICAL CHRISTIANS WHICH LED TO DISSEMINATION OF A MALTITUDE OF GROSS CALUMUNIES. WHAT WAS GOOD IN MOHAMMADANISM WAS ENTIRELY IGNORED AND WHAT WAS NOT GOOD IN THE EYES OF EUROPE, WAS EXAGGERATED OR MISINTERPRETED."

"محمدیت (اسلام) کے بارے میں صدیوں سے اہلِ یورپ کی اکثریت جو معلومات رکھتی ہے اس کی بنیاد متعصب عیسائیوں کی تحریف شدہ اطلاعات پر مبنی رہی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلتی رہیں۔ اسلام میں جو خوبیاں ہیں اس کو بالکل فراموش کر دیا گیا اور اہلِ یورپ کی نگاہ میں جو بات اچھی نہیں تھی اس کو خوب مبالغہ سے اُچھالا گیا، یا (جبینہ) غلط بیانی کی گئی۔"

مترجم قرآن پروفیسر آربری (متوفی ۱۹۶۸ء) سابق استاد علوم مشرقیہ کیمبرج یونیورسٹی نے اپنے مقدمہ میں صراحت کی ہے کہ قرآن کا پہلا ترجمہ جو ایک انگریز عربی داں روبرٹ رٹینن نے ۱۱۴۳ء میں کیا تھا، جو چار سو برس تک روم کے خانقاہ ABBEY کے تہ خانہ میں چھپا کر رکھا گیا اور اس کو

بالآخر بیسل BASLE سے ۱۵۴۳ء میں شائع کیا گیا تھا۔

وہ ترجمہ یہی ہے جو بعد کی نسلوں میں آنے والے مترجمین کے لیے 'رہنما ترجمہ' ثابت ہوا۔ یہ ترجمہ غلط بیانیوں اور تحریف کا پلندہ تھا۔ پروفیسر آربری کے الفاظ میں:

"IT ABOUNDS INACCURACIES AND MISSUNDERSTANDINGS.

AND WAS INSPIRED BY HOSTILE INTENTION."

"یہ ترجمہ اغلاط اور غلط بیانیوں کا پلندہ تھا، جو محض معاندانہ ارادوں کے تحت عمل میں آیا تھا۔"

لہذا اگر مستشرقین کے ترجمہ میں قرآنی الفاظ کو توڑ مروڑ کر، غلط معانی پہنا کر اور آیات کریمہ کی صورت مسخ کرنے کا نمونہ ملتا ہے تو ہمیں تعجب نہیں ہے، بلکہ روز اور آربری کے اعترافات کو پڑھ کر غالب کا یہ شعر یاد آتا ہے:

زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسد
وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

لیکن 'الظلال' کے مترجمین سے اس ایذا رسانی کی توقع نہیں تھی، اگر انھوں نے داؤد کے ترجمے اس لیے انتخاب کیے کہ ان پر کم لوگوں کی نظر پڑی ہوگی، اور اس کی بگاڑی ہوئی ترتیب کے ساتھ کسی کا سمجھنا اور سورتوں سے مطابق کرنا بھی ہر ایک کے لیے آسان نہیں ہے، جب کہ اس کے نام نہاد ترجمے کے ساتھ قرآنی متن بھی نہیں ہے تو یہ بات افسوسناک ہے کہ پڑھے لکھے لوگ بھی تن آسانی اور دعوائے ہمہ دانی کے لیے اس طرح کی حرکتیں کرتے ہیں، اور اگر اس کے ناول نگاری کے اسلوب سے متاثر ہو کر ایسا کیا ہے تو زیادہ افسوس کی بات ہے، کیوں کہ قرآن کا جلال و جمال، اس کی عظمت کا تقاضہ ہے کہ کم از کم وہ اسلوب تو اختیار کیا جاتا جو 'عہد قدیم و عہد جدید' کے ترجموں میں ملحوظ رکھا گیا ہے۔

ڈاکٹر عبدالباسط بدر
استاذ ادب عربی، جامعہ اسلامیہ، مدینہ منورہ
رکن رابطۂ ادب اسلامی

اسلامی ادب کے معیاری نمونے

[ڈاکٹر عبدالباسط بدر ایک عرب نژاد، عربی زبان و ادب کے ادیب، ناقد اور صاحب قلم ہیں اور اس کے ساتھ ہی رابطۂ ادب اسلامی کی عالمی برادری کے رکن تاسیسی بھی ہیں، رابطۂ ادب اسلامی کی مجلس نے اپنے اراکین سے درخواست کی ہے کہ وہ اپنی کوئی تازہ تصنیف رابطہ کو بطور ہدیہ دیں جس کو وہ اپنے اہتمام سے شائع کرے، اس عالمی تنظیم کے سربراہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ، ہیں، آپ نے بھی اپنی ایک کتاب "نظرات فی الأدب" اس تنظیم کو مرحمت فرمائی ہے، عرب حلقہ کے ایک فعال اور سرگرم رکن ڈاکٹر عبدالباسط بدر کے حصے میں اس کتاب پر پیش لفظ لکھنے کی سعادت آئی۔ مصنف نے ایک باخبر اور وسیع النظر عالم و ادیب ہونے کے باوجود اس اعزاز کو بڑے فخر و مسرت کے ساتھ قبول کیا کہ وہ عالم اسلام کی عظیم المرتبت شخصیت کی کتاب پر پیش لفظ لکھیں۔ عربوں کو اللہ تعالیٰ نے یوں بھی دوسروں کے علم و فضل کا اعتراف کرنے کا جوہر عطا کیا ہے اور وہ اس معاملہ میں وسیع النظر ہونے کے ساتھ وسیع القلب بھی ہیں۔

ذیل میں ہم اسی پیش لفظ کا خلاصہ پیش کر رہے ہیں، اس میں سے وہ عبارتیں حذف کر دی ہیں جن میں مقدمہ نگار نے مؤلف کتاب سے اپنی دلی وابستگی اور عقیدت مندی کا ذکر اور بلند الفاظ میں مولانا کی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔

ہندوستان یا برصغیر (ہند و پاک) کے علماء و ادباء کی خدمات کا تعارف عرب ممالک

یں کس وسعت کے ساتھ مولانا نے کرایا ہے اس کا اندازہ کم لوگوں کو ہوگا۔ اس پیش لفظ سے معلوم ہوگا کہ عرب ممالک کے چوٹی کے دانشوروں اور ادبا کو یہاں کے علماء و ادباء کی خدمات کا صحیح اندازہ نہیں تھا۔ اس مقدمہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا سید ابوالحسن علی الحسنی مدظلہ کا عربی ادب میں کیا مقام ہے، اور عربی ادب میں ان کا کیا واقعی حصہ یا CONTRIBUTION ہے۔ امید ہے کہ برصغیر میں عربی ادب کی تاریخ پر کام کرنے والوں کو اس مضمون میں کار آمد جائزہ ملے گا، مذکورہ مقدمہ کے اس خلاصہ کا عنوان 'ذکر و فکر' کا تجویز کردہ ہے۔ (ادارہ)

عربی زبان و ادب پر فنی حیثیت سے جو کتابیں اب تک لکھی گئی ہیں یا لکھی جا رہی ہیں ان میں مولانا سید ابوالحسن علی الحسنی الندوی مدظلہ کی کتاب ایک سنگ میل ہے جس سے فکر کی نئی شاہراہیں کھلتی ہیں۔ یہ کتاب اسلامی ادب کے معیاری نمونوں سے ہمیں آگاہ کرتی ہے۔ اور اس کے حدود اربعہ متعین کرنے اور قاعدہ و نظام وضع کرنے میں مدد دیتی ہے۔

اس کتاب کے مضامین کے لحاظ سے تین محور ہیں، یا ان کو تین باب کہہ لیجیے۔

پہلا باب چار ابتدائی فصلوں پر مشتمل ہے، جس میں پہلی فصل کا عنوان قدیم ادب عربی کا نئے زاویہ سے مطالعہ، اس فصل میں مولانا نے یہ واضح کیا ہے جس میں وہ حق بجانب ہیں کہ ادب کوئی رواجی پیشہ نہیں ہے، مولانا اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ ادب مدح خوانی یا وقتی تفریح طبع کا ذریعہ ہے، ان کے نزدیک ادب وہ ہے جو ضمیر کی صحیح ترجمانی کرے اور احساسات پر اثر انداز ہو اور قلب و دماغ کو متحرک کرے، لہذا یہ بات صحیح نہیں ہے کہ ادب کو شعراء کے دیوانوں میں اور سخن سازوں کے بیانات میں محصور سمجھا جائے، ادب کو ان تحریروں میں بھی تلاش کرنا چاہیے، جو ادب کے نام پر نہیں لکھی گئی ہیں، اور جس میں تکلف و تصنع سے کام نہیں لیا گیا ہے جہاں زبان قلم پر وہی بات آئی ہے جس کو دل نے قبول اور فطرت نے تسلیم کیا ہے، مولانا ابوالحسن اپنے اس دعوے کی تائید میں سیرت و مغازی اور حدیث و تاریخ کے حسین ٹکڑے بطور نمونہ کے پیش کرتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ الفاظ کے نبض پر ان کی انگلیاں ہیں، اور وہ دیکھ رہے ہیں کہ اس جملہ میں کتنی حرارت ہے اور اس فقرہ میں کتنا جوش ہے، اپنے تشخیص اور جائزہ کو وہ پورے اعتماد کے ساتھ ا۔ ر دلنشیں انداز میں پیش کرتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ ادب کو جانچنے کا یہ ایک جدید نظریہ ہے، ادب کی تاریخ جو ہم لوگوں نے پڑھی پڑھائی ہے وہ مجموعہ ہے پیشہ ور شعراء کی نازک خیالیوں کا یا سخن ساز مصنفوں کی بیان کردہ حکایات یا انشاء کا، جس میں فکری آفاق کی وہ بلندیاں نہیں ہیں جنھیں مولانا ابوالحسن نے نکھار کر دکھایا ہے، اور نہ ان کے اندر وہ انسانی افکار ہیں جس کو زندگی کی تلاش ہے، مولانا کا یہ نظریہ تاریخ ادب کے مطالعہ کے لیے نیا رُخ متعین کرتا ہے اور ہر زمانہ کے ادب کو جانچنے کا قانون اور ضابطہ وضع کرتا ہے اور عصر حاضر کے ادبا سے طالب ہے کہ اسلوب کی بلندی یا پستی کا اندازہ نئے اصول پر اور اس نظریہ کے مطابق کیا جائے، مولانا ابوالحسن کی تحریر ادبی بھی ہے اور ادب آموز بھی ہے۔

اس باب کی دوسری فصل دراصل فصل اول ہی کی توضیح ہے، اس میں انھوں نے جو نمونے پیش کیے ہیں وہ ادب کی صحت مند قدروں پر مشتمل ہیں، اگر ادب کے مختلف مدارس فکر اس بات پر متفق ہو جائیں کہ ادب فنّی دل بستگی کے ساتھ ساتھ انسان کو کچھ بخش بھی سکتا ہے اور اس کا تعلق زندگی سے وابستہ ہے اور انسان کی فکر، ذوق اور اخلاق کو نئے سرے سے ڈھالنے میں مدد کر سکتا ہے، اور اس کا دل نشیں اور ساحرانہ پہلو بھی ناقابلِ فراموش ہے تو وہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کی فکر کو قبول کرنے میں کوئی پس و پیش نہیں کریں گے، ــــ کیوں کہ مولانا ادب کو وقت گزاری کا ذریعہ نہیں بلکہ تعمیر انسانیت کا وسیلہ سمجھتے ہیں، مولانا نے اس فصل میں احادیث شریفہ کے نمونے دے کر جس رُخ کی طرف توجہ دلائی ہے اس کو صرف وہی صاحبِ ذوق سمجھ سکتا ہے جس کا سینہ ایمان کے نور سے روشن ہے اور جس کی بصیرت اللہ کا عطیہ اور اس کی قدرت کا نمونہ ہے۔

تیسری اور چوتھی فصل ادب کے متعین فنون کے مآخذ پر مشتمل ہے، یہ فنون وہ ہیں جن کا تعلق سوانحی خاکوں، کتابوں کے مقدمات، اور سفرناموں کی زبان اور اس کی ادبی رعایتوں سے متعلق ہے مولانا سیر حاصل روشنی ڈالتے ہیں، یہ نمونے ایک تنقیدی نظر سے دیکھنے کا بھی کام دیتے ہیں، اور ان فنون کی خصوصیات اور اس کے تقاضے بتلانے کے لیے کافی ہیں، ان اسالیب کا مطالعہ کرنے والے متقدمین نے چند اصول متعین کرنے پر اکتفا کیا ہے اور قواعد و کلیات کی زبان میں اس کے مقاصد اور اجزائے بیان کی تشریح کی ہے، مثلاً سوانحی خاکوں کے اسلوب بیان کے متعلق جو میں نے پڑھا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں چند انفرادی خصوصیات رکھنے والے اشخاص کی زندگی کو اس طرح بیان کیا جائے جس سے ان کا اختصاص نمایاں ہو اور

ان کے حالاتِ زندگی کے چند واقعات، یا اچانک زندگی میں پیش آنے والے حادثات کو نمایاں کیا جائے، مگر مولانا ابوالحسن نے سوانح نگار کے لیے چند شرطیں لازمی قرار دی ہیں، وہ سوانح نگار کے اندر وہ صفت دیکھنا چاہتے ہیں جو اس فن کا تقاضا ہے، لہٰذا صرف صاحب سوانح سے صحیح واقفیت، ناقدانہ نظر اور قوتِ بیان پر قدرت، باریک بینی سے حالات کا جائزہ لینے کی صلاحیت اور مؤرخانہ امانت اور اس کی ذمہ داریوں کا احساس، اگر ایک طرف ضروری ہے تو اس سے کہیں زیادہ اس بات کا طالب ہے کہ سوانح نگار کے اندر اپنے فن کو پیش کرنے کا ایک پاکیزہ مقصد بھی ہو، مولانا ابوالحسن جو کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ فن تاریخ نویسی یا سوانح نگاری صرف علمی بصارت اور وسیع مطالعہ اور حوادث کا جائزہ لینے کی صلاحیت اور ان کو بیان کرنے کی قدرت پر مشتمل نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ دینی بصیرت، بلند مقصد پر نظر، جس پر ایمان و عقیدہ کی چھاپ بھی ہو، لازمی ہے۔

مولانا سوانح نگاروں کو بتانا چاہتے ہیں کہ وہ الفاظ کی قیمت، کیفیت، اور رنگینی کے ساتھ اس کے درجۂ حرارت کو بھی سامنے رکھیں، کس لفظ میں کتنی حرارت یا کس درجہ برودت ہے، اور اس کا صحیح ادراک اور اس کو صحیح جگہ پر استعمال کرنا ایک سوانح نگار کا ہنر ہے، یہ نظریات اس شخصیت کے ہیں جس نے اس فن کو اپنے وجدانی ذوق، علمی بصارت اور دینی بصیرت کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچایا، مولانا ابوالحسن کی شخصیت میں یہ پہلو بہتوں کے لیے نیا ہوگا کہ سوانحی خاکہ اور سوانح نگاری ان کا خاندانی اور موروثی فن ہے، ان کی اس ماحول میں تربیت ہوئی ہے جہاں اس فن کی پرورش ہوئی ہے، ان کے والد علمائے ہند کی سوانحی خاکوں کے ایک انسائیکلوپیڈیا مرتب کرنے والے ہیں، اور ان سے پہلے ان کے جدامجد نے زبان فارسی میں اسی طرح کی ایک خدمت انجام دی ہے۔

سفرناموں کے اسلوب کی اہم خصوصیات پر مولانا نے خصوصی نشان لگائے ہیں، سفرنامے لکھنے والوں کو متنبہ کیا ہے کہ اس کی نگاہ سوسائٹی پر پہلے ہونی چاہیے جو اس ملک میں بستی ہے جہاں کا یہ سفرنامہ ہے، اور اس کا ذہن براہ راست ان احوال و واقعات کا عکاس ہو، جو اپنے صدق احساس، ناقدانہ نگاہ اور مزاج شناس احساس کے ذریعہ ایک نگاہ میں وہ سوسائٹی کے مرکزی خد و خال کو سمجھ سکے، سفرناموں کا اسلوب مولانا کی نظر میں ایسا ہو جو ایک صاحب فکر و ضمیر، اپنی ناقدانہ نگاہ سے حالات و واقعات کو اخذ کرتا ہے، بلکہ انسانی ذہن کا کیمرہ تمام خصائص کا یکساں اور یکبارگی احاطہ کر لیتا ہے، مولانا نے اپنی کتاب "مذکرات سائح فی الشرق العربی"[1] میں اس نظریہ کو عملی طور پر پیش کیا ہے کہ ادیب کا مشاہدات

---

[1] اس کتاب کا اردو ترجمہ "شرق اوسط کی ڈائری" کے نام سے مولانا شمس الحق ندوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء نے کیا ہے۔

بیان کرتے وقت اپنے نظریات اور تنقیدی خیالات کو داخل کرنا ایک جامد اور خشک قصہ نگاری کی سطح سے مضمون کو بلند کر دیتا ہے جس میں فکر و احساسات زندگی کی سانس لیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

اس موضوع کے بعد مولانا اپنے قاری کو اچانک ایک ایسے ماحول میں لے جاتے ہیں جس کا اسے پہلے سے اندازہ نہ تھا، ہم لوگوں نے ادبِ اسلامی کی تاریخ کا وہ حصہ پڑھا ہے جو اندلس سے متعلق ہے، وہاں جو شاعر اور صاحب فکر پیدا ہوئے ان کے نتائج فکر نظم و نثر سے لے کر تمام علمی فنون تک ہماری نظروں کے سامنے ہیں اور اس پر بیسیوں جلدیں تیار ہو چکی ہیں اور بہتیرے لوگ ڈاکٹریٹ اور ایم۔ فل کر چکے ہیں، جس پر اندلس میں یا یوں کہیے کہ اندلس کے دورِ حکومت میں مسلمانوں نے انجام دیا ہے، اسی طرح "مہجر" (شام و لبنان کے وہ مسیحی عرب ادبا جنھوں نے امریکہ میں رہائش اختیار کر لی ہے مگر عربی شعر و ادب سے وابستہ ہیں) کی شاعری اور ادب عربی کی خدمات اور ترقیات سے ہم ناواقف نہیں ہیں، لیکن ایک انکشاف مولانا نے ۱۹۸۱ء میں اس وقت کیا جب کہ ادب اسلامی کا عالمی اجتماع لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا، مولانا نے گویا ہمیں ایک نئے عالم سے واقف کرایا جس کے متعلق ہماری واقفیت وسیع تو کیا محدود بھی نہیں تھی یعنی برصغیر ہند و پاک میں عربی ادب، لغت و بلاغت، نظم و نثر، شروح و حواشی، لغت نویسی اور سوانح نگاری اتنا بڑا ذخیرہ ہے جس کا ہمیں تصور بھی نہیں تھا، مولانا نے اسی تقریر کو اس کتاب کا جزو بنایا ہے، اس لیے نہیں کہ کتاب کا حجم بڑھے بلکہ اس لیے کہ ادب کے ان چمن زاروں سے ہم واقف ہوں، عربی ادب میں ہندوستان کا کردار ایک نیا موضوع ہے جس سے ہمارا ناواقف رہنا افسوس کی بات ہے، مولانا نے اپنی کتاب کی پانچویں فصل میں اس عظیم گوشہ کی رونمائی کی ہے، اس کتاب کو پڑھ کر اپنی نااہلی کا احساس ہوتا ہے کہ ہم عرب مصنفین اس درجہ نابلد کیوں رہے کہ اپنی زبان کے اس درجہ ضخیم باب سے لاعلم ہیں، اور کیا یہ تنہا باب ہے جس سے غافل رہنے پر ہم آج شرمندہ ہیں، کیا ہمارے اسلامی معاشروں میں جو انڈونیشیا کے کنارہ سے لے کر افریقہ کے دور دراز کے مقامات تک پھیلے ہوئے ہیں، کیا وہاں عربی ادب کے چمن زار نہ ہوں گے، اور کیا وہ چمن زار ادبی افکار کے گل و بوٹے سے خالی ہوں گے، مولانا نے ہمیں بتایا کہ اگر ہم تلاش کریں تو ہمیں بے شمار نئی وادیوں اور نئے میدانوں کا سراغ مل سکتا ہے۔

ہم بہت خوش ہوتے ہیں کہ ہمارے ادبا امریکۂ شمالی اور امریکۂ جنوبی میں جب ترک وطن کر کے وہاں قیام پذیر ہوئے، تو ادب عربی کو نیا رنگ دیا، جس پر ہم بہت فخر کرتے ہیں، حالاں کہ وہ سب کارنامے

اگر ان کو کارنامہ کہا جائے، تو ایک صدی کا ہے۔ ایک صدی کے اندر معدودے چند اصحاب ذوق کی شاعرانہ حس قائم رہی، مگر ان کی نظم ونثر کی اتنی اشاعت ہوئی کہ ہمارے ابتدائی مدارس سے لے کر یونیورسٹیوں تک ان کا چرچا ہے، اور ہم نے دل کھول کر اعتراف کیا، اور منہ کھول کر تعریف کی، کہ ان لوگوں نے اپنے جدید خیالات کو جس پر یورپین اور امریکن زندگی کی چھاپ ہے، عربی کے نحو وصرف اور قواعد کی پابندی کرتے ہوئے پیش کیا ہے، لیکن کیا یہ انصاف کی بات ہوگی کہ ایک صدی کے متفرق اور گروہی کاموں کو اتنی اہمیت دی جائے اور جہاں صدیوں سے ٹھوس بنیاد پر صحیح مقصد کے ساتھ اور پورے ادراک وشعور کے ساتھ زبان وادب کی خدمت ہو رہی ہو، اور جس کا سلسلہ آج بھی قائم ہو، اس کو فراموش کرنا یا نظر انداز کرنا عربیت اور ادب سے وفاداری ہے؟ مولانا ابو الحسن ندوی نے ہماری نگاہوں سے پردے اُٹھا دیے، نہیں، بلکہ ہمارے خرمن فکر میں ایک چنگاری ڈال دی تاکہ ہمارے عزائم وارادے جو برف کی تہوں کے اندر جامد سے ہو گئے ہیں اور ان کے اندر جو زندگی کے آثار رہ گئے ہیں، ان کے اندر کچھ حرارت اور زندگی پیدا ہو، تاکہ ہم اپنے بحث وتحقیق کا موضوع علمائے ہند کے ادبی وتاریخی کارناموں کو بنائیں، ان پر تحقیق کریں، سیمینار منعقد کریں اور خود اس ملک (ہندوپاکستان) کے علماء وادباء سے مشورے لیں، ان کی رہنمائی حاصل کریں، اور ادب کے اپنے فردوس مفقود کو از سر نو آراستہ کریں، اور یہ دیکھیں کہ باوجود بے سروسامانیوں کے بلکہ ضائع جانے اور تلف ہو جانے کے مسلسل اسباب وحوادث کے باوجود کس طرح ان لوگوں نے ادب اسلامی کا چراغ آندھیوں کی زد سے بچا کر روشن رکھنے میں کامیابی حاصل کی، اور ہمیں ضرورت ہے کہ ان اسباب وعوامل کو بھی سمجھنے کی کوشش کریں جس نے اس تحتی برّ اعظم کے مصنفین اور علماء کو تقویت پہنچائی، اگر یہ راز ہمیں معلوم ہو جائے تو اس کو ہم پیمانہ بنا سکتے ہیں جس سے معاصر ادبی تحریکات کی زمانی ومکانی قوت کو سمجھا جا سکتا ہے، امید ہے کہ رابطۂ ادب اسلامی جس کو ایک عالمگیر برادری ملی ہے، وہ اس بار کو اپنے ذمہ لے سکتی ہے، اس لیے کہ اس میں ایک مسلسل جدّوجہد اور انتھک کوشش کی ضرورت ہے۔

تیسرا موضوع اس کتاب کا ایک اعلان ہے کہ ادب کسی گوشہ میں محدود نہیں بلکہ اس کے آفاق زمانی اور زمینی دونوں ہیں، اس سے موضوع کو جس میں ادب کی آفاقیت ظاہر ہوتی ہے، اسلامی ادب کا وہی اسکول نمائندہ کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے جو ہند وپاک میں برگ وبار لایا، غیر عربی اسلامی ادب جو اس ملک کی

زبانوں اردو اور فارسی پر مشتمل ہے، وہ اگرچہ لفظ و ترکیب کے لحاظ سے اجنبی لیکن فکر و روح کے اعتبار سے فکر آموز، حیات بخش اور اسلامی مزاج سازی کا کامیاب عنصر ہے۔

اس موضوع پر مولانا کی گفتگو ہمیں باور کراتی ہے کہ ادب اسلامی ایک عالمگیر شناخت کی حامل ہے، جس طرح اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے اسی طرح اسلامی ادب اسلام کے مسلمانوں کے تمام شعوب و قبائل پر حاوی ہے۔

بلاشبہ عربی زبان ادب اسلامی کی پہلی زبان ہے، اور ہر مسلمان کی تمنا ہے کہ عالم اسلام کی زبان ہو، تمام مسلمانوں کی ادبی کاوشیں اسی کے محور پر گردش کریں، لیکن ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ تمنائیں حقائق سے مختلف ہوتی ہیں، اور تمناؤں کی بنیاد پر حقائق کا انکار نہیں کیا جاسکتا، اسلام میں داخل ہونے والے بہت سے بلکہ بے شمار شعوب و قبائل ہیں جنھوں نے عربوں سے عقیدہ اور ایمان تو لیا ہے، لیکن زبان مستقل ناموس فطرت ہے، اور اس کی تبدیلی اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے، لہذا ہم ان کو نظر انداز نہیں کرسکتے، اور اس امید میں کہ وہ اسلام کی اولین زبان کو اپنائیں گے، لہذا جب تک نہ اپنائیں اس وقت تک ان سے بے تعلق رہیں، اور ان کی قبائلی خصوصیات اور فطری صلاحیتوں کو نہ سمجھیں اور اس سے فائدہ نہ اٹھائیں، یہ بڑی غلطی ہوگی، یہ ممکن ہے کہ ان کے وجدانیات اور احساسات ہم عربی میں منتقل کریں، یا دوسری زبانوں میں ان کو پھیلائیں، جیسا کہ علامہ اقبال کے فارسی اور اردو کے کلام کو عربوں نے سمجھنے کی کوشش کی، اسی طرح جہاں بھی حقیقی ادب کا سراغ ملے ہم اس سے بے نیاز نہیں ہوسکتے۔

ادب اسلامی کا ایک اور گوشہ وہ ہے جو اسلامی شعوب کے ادب میں نمایاں ہیں، وہ اگرچہ عرب نہیں ہیں، لیکن ان کی ادبی بخششیں ایسی ہیں جن سے ناواقف رہنا اپنے آپ کو محروم رکھنا ہے، اس وقت دنیا کے مختلف ملکوں اور زبانوں کے ادبی انتاج، طرز فکر اور طرز بیان ایک دوسرے سے منتقل ہو رہے ہیں، ہماری بڑی بڑی سوسائٹیاں، عربی ادب کی اکیڈیمیاں دور دراز ملکوں کی زبانوں سے عوامی گیت، قصے کہانیاں اور وہ تمام صنف سخن جن پر ادب کا اطلاق ہوتا ہے، ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنے کے لیے بڑے انتظامات کرتی ہیں، اور یورپ اور امریکہ کی زبانوں کے ادبی کارناموں کے ترجمے کرنا ثقافت کی خدمت سمجھی جاتی ہے، ادھر ہمارا حال یہ ہے کہ ہمارے مسلمان بھائی کتنی زبانیں بولتے ہیں اور کتنے ادبی رجحانات کے مالک ہیں، ان کے درد و آلام مشترک ہیں، اور تاریخی حقائق کا ایک ہی سرچشمہ ہے، لیکن

ایک دوسرے سے ناواقف، ایک دوسرے سے نابلد، اور جیسا کہ عرض کیا ثقافت کے نام پر اپنے نوجوانوں کے سامنے ہم نے بے شمار ادبی لٹریچر اکٹھا کر دیے ہیں، جو دوسروں کی تہذیبوں کی نمائندگی کرتے ہیں، اور اس کو عام انسانی برادری کے لیے ایک تحفہ سمجھتے ہیں اور ایک کو دوسرے سے قریب کرنے کا ذریعہ، کیا ہمارے لیے اس بات کا جواز ہے کہ وہ ادب جس میں کہیں زیادہ روانی، جدّت، اصلیت، فطرت کی نمائندگی اور صداقت کی پرچھائیں ہے، جو ہمارے کروڑوں مسلمان بھائیوں کی زندگیوں اور ان کے وجدان کا نمائندہ ہے، اس کو نظر انداز کردیں، حالاں کہ جب بھی ان آداب کا کوئی حصّہ دوسری زبانوں میں منتقل ہوا ہے، تو لوگوں نے اس کو سراہا ہے۔

ایک زمانہ میں ہم لوگ ناظم حکمت کو ترکی ادب کا حقیقی نمائندہ سمجھتے تھے، اور خیال تھا کہ ترکی مسلمانوں کے حوصلوں کی زندہ تصویر ان کا کلام ہے، لیکن جب موضوعی مطالعے صحیح رُخ پر ہونے لگے، اور ترکی کے ادبی اسالیب سامنے آئے تو معلوم ہوا کہ ناظم حکمت صرف ایک خاص رنگ اور محدود فکر کے نمائندہ ہیں، اور جیسا کہ اندازہ ہوا کہ فنّی اُپج اور نیاپن اور جدت طرازی ان کے حصہ میں کم آئی ہے پھر ہم نے محمد عاکف کا کلام بھی پڑھا جن کے قصائد کو ترکی عوام اپنے سخت آزمائشی دور میں بطور ترانہ کے پڑھا کرتے تھے اور مُلحدانہ قوتوں کے مقابلہ میں اسلامی عزم کا اظہار ان کے کلام سے ہوتا تھا، سکولر تصورات کا حقیقی جواب محمد عاکف ہی نے دیا، ان کا ترانہ آزادی ترکی کا آج سرکاری ترانہ ہے، اس کے بعد ہم نے نجیب فاضل کا کلام بھی پڑھا جس کی سحر بیانی سے پوری قوم سرشار ہے، تمثیلی نظمیں شاہناموں سے آنکھیں ملاتی ہیں، اسی طرح سیزائی قرہ قوچ، مصطفیٰ عباس اوغلو اور علی نار اور ان کے علاوہ دوسرے ادبار جو صحیح معنوں میں اسلامی ترکیہ کے حقیقی نمائندہ اور شرافت وخود داری کی ضمیر کی آواز ہیں۔

دوسری مسلمان قوموں کے ساتھ بھی یہی صورت حال ہے، اگر علامہ اقبال کی بین الاقوامی شہرت نہ ہوتی جس نے اپنا لوہا منوالیا، اور تحتی برّاعظم کے مسلمانوں کی طرف سے اذان دینے کا فریضہ انجام دیا تو اب تک ہم سمجھتے کہ صرف ٹیگور ہی ایک شاعر ہے جس کو ہندوستان کی زمین نے جنم دیا ہے۔

اسی طرح مولانا ابوالحسن نے ہمارے سامنے ادب اسلامی کے نادیدہ راستے کھول دیے اور مطالعہ کے لیے ایک وسیع دنیا سامنے لاکر رکھ دی، وہ اس میدان سے چُن کر چند کلیاں، کچھ پھول پیش کرتے ہیں چنانچہ جلال الدین رومی کے ادب کا نمونہ جو ہماری تاریخی میراث ہے، مولانا نے بڑی خوبی سے پیش کیا ہے،

یہاں گزشتہ صدی ہجری کے اخیر میں محمد اقبال کا ادب، تاریخ ساز اور فکر ساز اور عقلیت ساز ادب ہے، دونوں نمونے یعنی رومی اور اقبال کے اپنی اپنی جگہ پر ٹھوس اکائیاں ہیں اور رومی انسانی فکر کے بایک نقوش اُجاگر کرتے ہیں، محبت کی بلندی جب کہ وہ ایک روح مجرد بن جائے اور اپنے بلند مستقر پر عالمی احساسات کو سمیٹ لے اور دل کی دنیا جس سے صنعتی دل والے ناواقف ہیں، اور انسان کی قیمت جن کو ڈراموں کے ذریعہ ظاہر نہیں کیا جاسکتا، یہ سب معانی جلال الدین رومی کے عطیات میں سے ہے، ادب اسلامی میں انسان کی قیمت اس درجہ بلند ہوتی ہے کہ اس کا خریدار سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں ہوسکتا، مولانا ابوالحسن نے مولانا جلال الدین رومی کے اشعار شروع میں پیش کرکے عجیب و غریب معنویت سے متعارف کرایا ہے۔

مولانا نے اقبال کے پیغام اور ان کے ادبی مضامین کی تشریح سے ادب اسلامی کے خدوخال کو واضح کیا، اقبال کے یہاں ادب کا سرچشمہ وجدان کی گہرائیوں سے نکلتا ہے، اور احساسات کی آنچ دوسروں کے دلوں کو زندگی کے آثار سے گرم کرتی ہے، اور انھیں اس بات پر اُبھارتی ہے کہ اسلامی پیکر اپنے وجود خاکی سے نکالیں۔ اقبال نے جو کچھ کہا ہے اور جس کو ابوالحسن کے سوز دروں نے جذب کیا، اور حسن بیان نے ہم تک منتقل کیا، وہ درحقیقت ادب اسلامی کے بنیادی اصول ہیں۔

یہ تینوں محور یا مضامین جن پر نظرات کی عمارت قائم ہے، یہ ادب اسلامی کے لیے رہنما اصول ہیں، جو اسلامی معاملات کو سمجھنے اور ادب و نقد میں ان سے استفادہ کی راہ ہموار کرتے ہیں، (۱) ادب کا مفہوم، اس کی روح، اس کے حدود اربعہ، (۲) ادب کے حقیقی سرچشموں کی طرف رہنمائی، (۳) ادب اسلامی کا وسیع آفاق۔

بلاشبہ یہ ملاحظہ (النظرات) نمونہ اور نظیر کا کام دیتے ہیں، جن سے قواعد مرتب کیے جائیں گے اور جن پر قیاس کرکے آگے کام بڑھا جائے گا، اور ادب اسلامی کی راہیں اور نقد کے راستے متعین ہوں گے۔

رہنما اصول اور رہنمائی کرنے والے خطوط عمل جزئیات سے بحث نہیں کرتے، اور ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ حصر اور قصر کا کام کریں، وہ ایک جرأت مندانہ قدم ہوتے ہیں جو نئی زمین پر تخم ریزی کرتے ہیں۔ یہ وہ سطریں ہیں جو صفحات پر نہیں لکھی گئیں، یہ وہ پیش قدمی ہے جو اس دروازہ کو کھولنا

چاہتی ہے جو اب تک بند ہے، اور سب سے زیادہ یہ قدرت کا عطیہ اور اس کی فیضان بخشی ہے۔ ایک وہی صلاحیت ہے، ایک خدا کا عطا کردہ نور ہے، بصیرت کا آئینہ ہے، جو اللہ تعالیٰ نے مولانا ابوالحسن کو عطا کیا ہے۔ انھوں نے ہمارے سامنے ایک دروازہ نہیں متعدد دروازے کھول دیے ہیں، امید ہے کہ ہم ان دروازوں سے داخل ہوں، اور راستے کی ناہمواریاں دور کریں۔

اما بعد!

مولانا ابوالحسن علی نے ثابت کر دیا کہ وہ صرف ایک راہ نہیں، بلکہ متعدد شاہراہوں پر ہمارے لیے رہنما ہیں، عصر حاضر کی زبان میں، دعوت دین کے میدان میں، اسلام پسند ادبار کی پہلی اجتماعی کوشش کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے اور ادب اسلامی کے قواعد کے وضع کرنے کے اعتبار سے اور اس کے سرچشموں کی نشان دہی کرنے کے لحاظ سے ان کی رہنمائی ناقابلِ فراموش ہے۔

اخیر میں مولانا مجھے اجازت دیں کہ ان کو مخاطب کرکے عرض کروں۔

میرے عظیم رہنما! آپ کا گرانقدر تحفہ جو آپ نے ادب اسلامی کو عطا کیا ہے وہ ایک اعلیٰ پیغام ہے جس کو ہم نے سر آنکھوں پر قبول کیا، اس کی ایک ایک سطر کو سمجھا اور پڑھا، اور اس سے بنیادیں تعمیر کیں جس سے متعدد قواعد وضع کیے جائیں گے۔

ہم اللہ سے امید رکھتے ہیں کہ وہ ہمیں توفیق دے گا، کہ ہم ان افکار عالیہ کو، ان رہبر اصولوں کو، اور ادب و دین میں اس قائدانہ کردار کو دوسروں تک منتقل کرنے کی توفیق پائیں گے، یہاں تک کہ "خیر امۃ اخرجت للناس" کا فریضہ ادا ہو۔

اللہ آپ کو اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے داعیوں اور مجاہدین کی طرف سے بہتر جزا عطا فرمائے، آپ کی عمر میں برکت عطا فرمائے، اور آپ کے تمام اعمال کو عمل خیر کے میزان میں گرانقدر بنائے۔

(ترجمہ و تلخیص: ع ع ن)

مولانا ابوالعرفان خانصاحب ندوی
صدر شعبۂ دینیات، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

مسلمانوں میں علوم فلسفیہ کی آمد

کسی قوم و ملّت کے بین الاقوامی طور پر باوزن اور معتبر ہونے کے بہت سے اسباب و ذرائع ہیں ان میں سے سرفہرست یہ سبب ہے کہ وہ علوم عقلیہ اور علوم تجربیہ میں فائق ہو، اور اس کے رجال و افراد میں ایسے ماہر اور باکمال اہل علم ہوں جو ان علوم کی کسی شاخ میں درجۂ مہارت رکھتے ہوں اور ان کا شمار سند کے درجہ میں ہو، علوم عقلیہ اور تجربیہ کسی قوم، کسی ملّت اور کسی ملک کی میراث نہیں ہیں، ہمیں تاریخ بتلاتی ہے کہ ان علوم کا مرکز کسی زمانہ میں ہندوستان بھی رہا ہے، ہندوستان میں ماضی بعید میں علم الاعداد والحساب تھا، صفر جس نے انسانوں کی علمی اور ثقافی، تجارتی اور صنعتی زندگی میں غیر معمولی رول ادا کیا ہے ہندوستان ہی کی دین ہے جس نے نظام اعداد کو منظم اور مرتب کر دیا، اسی طرح علم الطب اور علم العلاج بھی ہندوستان میں بلند درجہ اور مقام پر پہنچ گیا تھا، عباسی خاندان کا دوسرا خلیفہ ابوجعفر منصور ہے اس کو اچھے کھانوں کا ذوق تھا اور پرخور بھی تھا اس لیے اس کو سوء ہضم کی شکایت بھی رہتی تھی، یونانی اطباء نے اس کو مشورہ دیا کہ کھانے کی مقدار کم کرے لیکن بہر حال اس تدبیر سے معدے کے مریض کو نفع نہیں ہوا، برامکہ کی نشان دہی پر اس نے ہندوستانی طبیب سے رجوع کیا اور جوارش و سفوف کے ذریعہ سے اس کا علاج ہوا جس سے اس کو افاقہ ہوا، خلیفہ منصور نے اس طبیب کی بڑی پذیرائی کی اور ہندوستانی طب کی کتابوں کو عربی میں ترجمہ کرنے کی خدمت اس کے سپرد ہوئی، اسی طرح خلیفہ ہارون رشید کے زمانہ میں خلیفہ کا عزیز قریب بیمار ہوا، اطباء نے مرض کو لاعلاج بتایا اور مریض کی طرف سے مایوسی ظاہر کی جعفر برمکی جو ہارون رشید کا وزیر اعظم تھا ہندوستانی طبیب دربار میں لایا اور اس کے علاج سے

وہ مریض تندرست ہوا، خاندان برامکہ عباسی خلافت کی ابتدا ہی سے اس حکومت کے دست و بازو رہے اور ان کے ذریعہ ہندوستانی علوم و فنون کے ماہرین اور فضلا دربار خلافت میں پہنچتے رہے اور اپنے فضل و کمال کا مظاہرہ کرتے رہے، یہ علوم عقلیہ اور تجربیہ درحقیقت انھیں کو فلسفیہ کہا جاتا ہے۔

سائنس کا تعلق علم طبعیات سے ہے، اسی طرح علم الہندسہ اور علم ہیئت اور علم الاعداد والحساب اور علم موسیقی علم ریاضی کی شاخیں ہیں، اور علم ریاضی فلسفہ کی ایک اہم شاخ ہے اور اسی طرح علم طبعیات جسے فزکس کہا جاتا ہے اور کیمسٹری جسے عربی زبان میں علم الکیمیا کہا جاتا ہے اور علم العلاج والطب چاہے وہ حیوانات کے علاج سے متعلق ہو یا وہ انسانوں سے متعلق ہو۔ علوم طبعیہ کی شاخیں ہیں اور علم طبعی فلسفہ کی ایک اہم شاخ ہے۔ ہندوستان جس طرح علم الطب اور علم الاعداد والحساب میں فائق تھا اسی طرح علم ہیئت اور علم نجوم میں بھی یہاں کے ماہرین درجۂ کمال پر تھے، علم ہیئت اور علم نجوم جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں علم ریاضی کی فہرست میں آتے ہیں اسی طرح ہندوستان علم السیاستہ (Political Science) میں بھی اپنا ایک وزن رکھتا ہے۔ عربی زبان کی مشہور کتاب "کلیلہ و دمنہ" اصلاً ہندوستان کی تصنیف ہے، پھر اس کتاب کا ترجمہ سنسکرت زبان سے فارسی زبان میں کیا گیا اور فارسی زبان سے عربی زبان میں ابن المقفع نے کیا علوم عقلیہ اور تجربیہ سنسکرت زبان سے عربی زبان میں منتقل ہوئے، اور جن باکمال ہندو فضلاء نے خود یا اپنی نگرانی میں عربی زبان میں ترجمے کیے ہیں ان کا نام اور کام تاریخ میں محفوظ ہے۔

اسی طرح سے یونانی علوم و فنون یعنی یونانی فلسفہ اپنی تمام شاخوں کے ساتھ اور یونانی منطق ترجمہ کے ذریعہ سے عہد عباسی میں عربی میں منتقل ہوئے ہیں۔ بے شبہ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ علوم عقلیہ اور تجربیہ یعنی فلسفہ و منطق اپنی تمام شاخوں کے ساتھ یونان میں زیادہ مرتب اور منظم طور پر تھے لیکن جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ یہ علوم عقلیہ اور تجربیہ کسی قوم کی میراث نہیں ہوتے ہیں۔

سکندر کی فتوحات نے مصر، شام، ایشیا مائنر، عراق اور ایران میں یونانی علوم و فنون کو در آمد ہونے کا موقعہ دیا، سکندر کی جواں مرگی کے بعد اس کے جنرلوں اور فوجیوں میں سکندر کے مقبوضات تقسیم ہو گئے، اور بطلیموسی خاندان کے حصہ میں مصر کی حکمرانی آئی، اس خاندان نے جو اصلاً یونانی النسل تھا بحر روم کے ساحل پر اسکندریہ کو اپنا دارالسلطنت بنایا جس کو مصر کی فتح کے وقت اسکندر نے اپنے نام پر آباد کیا تھا، بطلیموسی خاندان نے مصر کو یونانی علوم و فنون کا مرکز بنا دیا، کتب خانہ اسکندریہ یا اسکندریہ کی اکاڈمی

یا اسکندریہ کی یونیورسٹی آپ جو بھی کہہ لیجئے بطلیموسی خاندان کی علمی سرپرستی کا بہی نوع انسان کے لیے ایک تاریخی تحفہ ہے، اسکندریہ کی اس اکاڈمی نے انسانی ثقافت اور علوم عقلیہ کو ترقی دینے میں بہت اہم رول ادا کیا ہے اور مصر ایک عرصہ تک یونانی علوم و فنون کا مرکز رہا ہے اور نوع انسانی کے عقلی اور فکری ارتقار میں اس کا کام و نام فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے، اور ایک خاص سیاسی سبب کی وجہ سے قسطنطنیہ کے مقبوضات میں رہنے والے کچھ نسطوری نصاری بلاد جزیرہ میں آکر بس گئے، بلاد جزیرہ سے مراد دریائے دجلہ اور فرات کا وہ دوآبہ ہے جو بغداد سے شمال کے علاقہ میں ہے اس کو دیار بکر و ربیعہ بھی کہتے ہیں اور عراق عرب بھی کہتے ہیں اور ما بین النہرین بھی کہتے ہیں اس جزیرہ کے مشہور شہروں میں رُھا، نصیبین، حران، جندیسابور، رقہ، راس العین ہے۔

پناہ گزین نسطوری نصاری یونانی علوم و فنون سے واقف اور اس کے ماہر تھے، انھوں نے ان علوم کو یونانی زبان سے سریانی زبان میں منتقل کیا، اور جس طرح اسکندریہ ما قبل اسلام یونانی علوم و فنون کا مرکز تھا اسی طرح الجزیرہ کے مذکورہ بالا شہر یونانی علوم و فنون کا مرکز بن گئے، اس علاقہ کے نصاری کی علمی کوششوں اور مساعی سے یونانی زبان کی وہ کتابیں جو علوم عقلیہ میں تھیں ترجمہ کے ذریعہ سریانی زبان میں منتقل ہوئیں، اور ان کے فضلاء اور ان کے اخلاف نے ان علوم پر کچھ کتابیں بھی براہ راست تصنیف کیں۔

جندیسابور شہر کو ساسانی حکومت کے دوسرے فرماں روا سابور بن اردشیر نے آباد کیا تھا، نوشیروان عادل کے زمانہ میں یونانی علم طب کا ایک بہت بڑا کالج یہاں قائم کیا گیا کیوں کہ یہ علاقہ ساسانی حکومت کے مقبوضات میں تھا، اس مدرسۂ طبیّہ سے فن طب کے بڑے ماہر اطبار اور فضلار فارغ ہوئے ہیں، اور یہ مدرسۂ طبیہ عباسی خلافت کے زمانہ تک بدستور قائم رہا ہے۔ یونانی علوم و فنون کی اشاعت میں ان اطبار کا بہت دخل ہے جنھوں نے اس مدرسہ سے طب حاصل کی تھی۔

مسلمانوں میں جو مشہور فلاسفہ گزرے ہیں وہ فن طب کے ماہرین میں تھے مثلاً یعقوب کندی، فارابی، بوعلی سینا کہ یہ لوگ فن طب میں مہارت کے ساتھ ساتھ علم ریاضی، علم ہیئت اور علم الٰہی کے ماہرین میں تھے، عبّاسی خلافت میں باقاعدہ ترجمہ کا کام دوسرے عباسی خلیفہ منصور کے زمانہ سے شروع ہوا ہے۔ انفرادی اور شخصی طور پر تو ترجمہ کا کام سنہ ۶۰ھ کے بعد سے شروع ہو گیا، خالد بن یزید بن معاویہ جو علم الکیمیا

کا شوقین تھا اس نے علم الکیمیا اور بعض دوسرے علوم عقلیہ کی کتابوں کا مصری فضلاء سے ترجمہ کرایا تھا، کیوں کہ دمشق مصر سے قریب ہے، یعقوب الرُّھاوی جو رُھا کا باشندہ تھا اس نے بھی بعض کتابوں کا ترجمہ کیا ہے، لیکن یہ سب انفرادی اور شخصی کوششیں ہیں، حکومت اور خلیفہ کے حکم اور اس کی سرپرستی میں باقاعدہ دارالترجمہ کا قیام جیسا کہ میں نے عرض کیا خاندان عباسی کے دوسرے خلیفہ منصور کے زمانہ میں شروع ہوا ہے ابتداءً جن کتابوں کا ترجمہ ہوا ان میں علم طب اور علم ہیئت کی کتابیں ہیں کیوں کہ یہ دونوں علوم وقت کی ضرورت اور تقاضا تھے۔ علم طب خواص اور عوام سب کی ضرورت تھی۔

بغداد الجزیرہ سے قریب تھا اس لیے اور اس کے بعد ہارون رشید کے زمانہ میں مترجمین کی بڑی تعداد بلاد جزیرہ کے نسطوری عیسائیوں کی تھی، کچھ ترجمے جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ہندوستانی فضلاء و اطباء اور علم الاعداد والحساب کے ماہرین اور علم نجوم کے ماہرین نے کیے ہیں، اور فارسی زبان کی کتابوں کے ترجمے بھی اسی زمانہ میں شروع ہو گئے تھے۔ ابن المقفع نے کلیلہ و دمنہ کا ترجمہ کیا ہے جو کتاب میرے نزدیک پولیٹکل سائنس (Political Science) کی ہے اور ابن المقفع نے ارسطو کی منطق کا بھی ترجمہ کیا ہے۔ بعد کے زمانہ اور صدیوں میں بھی ہم ایرانی مترجمین کو دارالترجمہ میں پاتے ہیں۔ آل نوبخت' حسن بن سہل بھی ایرانی مترجمین میں ہیں، لیکن ان کی بڑی تعداد الجزیرہ کے نسطوری عیسائیوں کی ہے، اور اسی لیے یونانی علوم و فنون کا سرمایہ ابتداءً سریانی زبان سے عربی زبان میں منتقل ہوا ہے۔

ہارون رشید کے جانشین مامون رشید نے جو علوم عقلیہ اور فلسفیہ کا زیادہ دلدادہ تھا ترجمہ کے کام میں زیادہ دلچسپی دکھائی اور بیت الحکمت اور دارالترجمہ کو اپنی توجہ اور فکر و کوشش سے تیسرے مرحلے میں داخل کر دیا۔ اب تک جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ یونانی علوم عربی زبان میں سریانی زبان سے سریانی زبان کے فضلاء کے ذریعہ منتقل ہوئے تھے، یونانی فلسفہ اپنی شاخوں کے ساتھ اصلاً یونانی زبان میں ہے۔ لیکن اب تک براہ راست یونانی زبان کی کتابوں کا ترجمہ نہیں ہوا تھا خوش قسمتی سے مامون کو ایک ایسا فاضل نوجوان مل گیا جو یونانی اور عربی زبان دونوں میں مہارت رکھتا تھا اور وہ بلاد جزیرہ سے متعلق نہیں تھا بلکہ حیرہ کا باشندہ تھا اس کا نام حنین بن اسحاق تھا۔ اگرچہ مامون کے انتقال کے وقت اس کی عمر چوبیس سال تھی اور ظاہر ہے کہ اس کو اپنی صلاحیتوں کو ظاہر کرنے کا مامون کے زمانہ میں زیادہ موقعہ نہیں ملا ہوگا لیکن یہ مامون کا حسن انتخاب ہے کہ اس نے جس نوجوان کو اس کام

کے لیے منتخب کیا وہ اپنے اس ترجمہ کے کام میں اپنے گزرے ہوئے اور اپنے سینیر مترجمین سے اور بعد میں آنے والے مترجمین سے ہر طرح سبقت لے گیا، اس نے اپنے بھانجے حبیش اور بعد میں اپنے لڑکے اسحاق بن حنین کی مدد سے یونانی زبان کی ان کتابوں کا ترجمہ شروع کیا جن کو مامون نے قسطنطنیہ کے دربار سے باقاعدہ سفارت بھیج کر اہتمام کے ساتھ منگوایا تھا۔ ترجمہ کی تاریخ میں یہ تیسرا مرحلہ بہت ہی کامیاب اور مفید رہا، حنین بن اسحاق نے یونانی کتابوں کا براہ راست ترجمہ کیا اور ساتھ ہی ابتک کے تراجم جو ایک طرح سے نقل در نقل تھے اور جن میں خطا کا احتمال تھا ان پر نظر ثانی کی اور ان کی تصحیح و اصلاح کی حنین بن اسحاق کا سن وفات ۲۶۴ھ ہے اور وہ زندگی بھر دار الترجمہ سے متعلق رہا اور جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ وہ اپنے متقدمین اور متأخرین دونوں پر فائق اور برتر رہا، سنسکرت، فارسی، سریانی اور یونانی زبانوں سے تراجم کا جو سلسلہ حکومتی پیمانہ پر اور خلفاء و سلاطین کی سرپرستی میں عباسی خلیفہ منصور کے عہد سے شروع ہوا تھا وہ چوتھی صدی ہجری کے آخر تک قائم رہا۔ آخر عہد کے مترجمین میں زید بن رفاعہ اور یحیٰی بن عدی مشہور مترجمین میں ہیں، یحیٰی بن عدی مشہور فلسفی فارابی کا شاگرد تھا۔ اور جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ منصور سے پہلے شخصی انفرادی طور پر ترجمہ کا کام شروع ہو چکا تھا، اس طرح تقریباً سوا تین سو سال کے مسلسل عمل سے مسلمانوں میں جملہ علوم عقلیہ کی مستند کتابوں کا ترجمہ عربی زبان میں منتقل ہو گیا تھا، یعنی سن عیسوی کے اعتبار سے دسویں صدی عیسوی کے نصف تک سرکاری پیمانہ پر نقل و ترجمہ کا کام ہوتا رہا، اور علوم عقلیہ، تجربیہ اور فلسفیہ سے متعلق جملہ علوم اور ان کی شاخیں عربی زبان میں منتقل ہو گئیں۔ ترجموں کی یہ کتابیں صرف کتب خانوں کی زینت نہیں رہی ہیں بلکہ ان کے نسخے کتب خانوں سے شائق حضرات نے نقل کیے ہیں اور بڑے کتب خانوں میں اس کا اہتمام تھا اور اجازت تھی کہ اگر کوئی شخص کوئی کتاب نقل کرنا چاہے تو اس کو سہولت مہیا کی جائے، چنانچہ یہ کتابیں اہلِ علم کے ہاتھوں میں آئیں اور بازار میں بکنے لگیں، اور اس طرح یہ علوم و فنون کی کتابیں ذریعہ بنی ہیں علوم عقلیہ میں مسلمانوں کی مہارت کا، یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ نویں، دسویں، گیارہویں صدی عیسوی میں علوم عقلیہ اور تجربیہ کا وہ سارا ذخیرہ جو ہزاروں سال کی محنت سے عقل انسانی اور فکر انسانی نے حاصل کیا تھا اُن کے وارث اور متولی صرف مسلمان تھے۔ ان علوم و فنون پر عربی زبان کا یہ بڑا احسان ہے کہ سریانی زبان اور قبل اسلام کی ایرانی زبان اور خود یونانی زبان اپنی زندگی کے آخری مرحلہ میں تھیں، اگر یہ کتابیں عربی زبان میں منتقل

نہ ہوتیں تو پھر ان کتابوں کو پڑھنے پڑھانے والے، سمجھنے سمجھانے والے جو برابر کم ہو رہے تھے ختم ہو گئے ہوتے، اور یہ علوم جو ہزاروں سال کی انسانی کوششوں کے نتیجہ ہیں تاریخ کے گم شدہ اوراق ہو جاتے، اور فکر انسانی کے تسلسل کی وہ تاریخ جو آج محفوظ ہے صفحۂ قرطاس سے غائب ہو جاتی۔ مسلمانوں کی علمی و فکری تاریخ میں جو مختلف علوم کے ماہرین اور فضلا گزرے ہیں اور جن کی حیثیت صرف اتنی نہیں ہے کہ وہ ایک فرقہ اور ایک جماعت کے افراد ہیں بلکہ ان کی عالمی حیثیت ہے۔ ان میں ابوبکر زکریا رازی، ابن ہیثم، بنو شاکر، یعقوب کندی، فارابی، ابن مسکویہ، بوعلی سینا، ابوریحان بیرونی، عمر خیام، شریف ادریسی اور نصیر الدین طوسی ہیں۔ یہ لوگ انھیں ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی وجہ سے آج فکر انسانی کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں، اور بہت سے دوسرے نام ہیں جن کا شمار طویل صفحات چاہتا ہے۔

قرون وسطیٰ میں مسلمانوں کے اندر ان علوم کے آنے کی یہ تاریخ ہے جو میں نے بہت مختصر طور پر آپ حضرات کے سامنے عرض کر دی، قفطی کی تاریخ الحکماء، ابن ابی اصیبعہ کی تاریخ الاطبا، ابن الندیم کی الفہرست اور حاجی خلیفہ کی کشف الظنون میں ان علوم کے فضلاء اور ان کے ماہرین کے اسماء گرامی محفوظ ہیں، یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کا یہ عہد دنیا کی تاریخ میں عہد زریں کہا جاتا ہے، کیوں کہ اس وقت مسلمانوں کے پاس سیاست و حکومت بھی تھی اور علوم عقلیہ بھی تھے اور جب کسی قوم کے پاس یہ دونوں چیزیں جمع ہو جاتی ہیں تو اس کا عالمی وقار اور وزن بڑھ جاتا ہے، مسلمانوں کے پاس جب یہ علوم عقلیہ اپنے تمام اقسام کے ساتھ آئے ہیں تو مسلمان صرف اس کے محافظ اور ان کو جوں توں محفوظ رکھنے والے نہیں تھے، بلکہ انھوں نے ان علوم پر اضافہ بھی کیا ہے اور ان کے فضلاء نے علوم طبعیہ اور تجربیہ کو آگے بڑھایا ہے اس کے لیے اس موضوع پر عربی اور انگریزی میں جو کتابیں ہیں انھیں دیکھنے کی ضرورت ہے، کیمسٹری، علم طب اور فزکس میں ان کے اضافے آج بھی اہل علم کی زبانوں پر ہیں۔

حضرات! میں نے پہلے یہ عرض کیا تھا کہ علوم عقلیہ اور علوم فلسفیہ کسی قوم و ملک کی میراث نہیں ہیں۔ اس لیے جس طرح ان علوم کو مسلمانوں نے ترجمہ کے ذریعہ درآمد کیا ہے، اسی طرح وہ زمانہ بھی آ گیا جب مسلمانوں نے ان علوم کو برآمد کیا ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یورپ میں یہ علوم عقلیہ فتح قسطنطنیہ

کے بعد یعنی ۱۴۵۳ء کے بعد پہنچے ہیں، مگر یہ واقعہ تاریخی طور پر غلط ہے، یورپ میں علوم عقلیہ کی یونیورسٹیوں کے قیام کی تاریخ فتح قسطنطنیہ سے بہت پہلے کی ہے، مسلمانوں نے قسطنطنیہ فتح کیا ہے ۱۴۵۳ء میں یعنی پندرہویں صدی کے آخر نصف میں، کہنے والے کہتے ہیں کہ فتح قسطنطنیہ کے وقت قسطنطنیہ اور اس سے متعلق دیگر رومن مقبوضات میں یونانی علوم و فنون کے جو فضلاء تھے انھوں نے اپنی کتابوں اور اپنے علوم کے ساتھ یورپ کی طرف ہجرت کی ہے، اور پھر اس کے بعد یورپ میں علوم عقلیہ اور نشاۃ ثانیہ کا دور آیا، لیکن جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا کہ اٹلی میں اور یورپ میں اور دوسری بعض جگہوں پر علوم عقلیہ کی تعلیم کے لیے یونیورسٹیوں کا قیام فتح قسطنطنیہ سے بہت پہلے ہو چکا تھا، اسی طرح بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ علوم عقلیہ اور تجربیہ جو مسلمانوں کے پاس تھے وہ صلیبی جنگوں کے موقعوں پر جو گیارہویں صدی کے آخیر سے شروع ہو کر تیرہویں صدی تک قائم رہی ہیں مسلمانوں سے منتقل ہو کر یورپ پہنچے ہیں لیکن یہ واقعہ بھی تاریخی طور پر صحیح نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ صلیبی جنگوں میں جو لوگ مشرق میں آئے وہ علمی اور فکری لوگ نہیں تھے بلکہ وہ سپاہی اور سیاسی لوگ تھے اور جیسا کہ آپ حضرات بہتر سمجھتے ہیں کہ ہر کام کے لیے الگ الگ مخصوص لوگ ہوتے ہیں سپاہی اور سیاسی لوگوں نے نہ تو علمی اور فکری دنیا سے اشتغال رکھا ہے اور نہ وہ خود علمی اور فکری لوگ ہوتے ہیں کہ تہذیبوں اور ثقافتوں کو جنم دیں، صلیبی سپاہیوں اور جنرلوں نے ایشیا کی مصنوعات اور تمدّنی لوازمات کو حیرت و استعجاب کے ساتھ اور قدر کی نگاہ سے دیکھا اور بہت سے زیبائش و آرائش کے سامان خرید کر یورپ لے گئے، جس طرح آج یورپ و امریکا جانے والا ہندوستانی وہاں سے سامان آسائش خرید کر لاتا ہے، لیکن علمی اور فکری اقدار کی منتقلی کا ذریعہ جنگ کا میدان اور اضطراب و انتشار کا زمانہ نہیں ہوتا ہے علوم و فنون اور تہذیبوں کا سفر اور علمی و فکری آراء و نظریات کی منتقلی پرسکون ماحول میں اور امن کے زمانہ میں ہوا کرتی ہے اور یہ لین دین ان مقامات پر ہوتا ہے جہاں علماء و فضلاء کی بڑی تعداد موجود ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ صلیبی جنگوں کے میدان میں سپاہی اور جنرل موجود ہوتے ہیں، علماء اور فضلاء کی بڑی تعداد موجود نہیں ہوتی ہے۔ دراصل ایک تاریخی اور سیاسی واقعہ ان علوم عقلیہ کے یورپ منتقل ہونے کا سبب بنا ہے۔

مسلمانوں میں یہ علوم مکمل طور پر اور اپنی آخری شکل میں تین سو سال کی مکمل سرکاری پیمانہ پر محنت سے

منتقل ہوئے تھے، لیکن یورپ میں یہ علوم صرف دو سو سال میں مسلمانوں سے منتقل ہو کر پہنچ گئے اور یورپ بہت جلد ان علوم میں نہ صرف یہ کہ خود کفیل ہوا بلکہ فائق ہو گیا۔

حضرات! آپ لوگوں کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گی کہ اندلس میں طلیطلہ جسے آج ٹالیڈو کہا جاتا ہے ۱۰۸۵ء میں عیسائیوں کے قبضہ میں آیا۔ اس کے بعد جبرالٹر کی طرف سے یوسف بن تاشفین اندلس کو بچانے کے لیے پہنچا ہے اور زلاقہ کے مقام پر اس نے عیسائیوں کو شکست دی، لیکن عیسائیوں کی شکست کے باوجود یوسف بن تاشفین طلیطلہ کو عیسائیوں سے واپس نہیں لے سکا، طلیطلہ پر عیسائیوں کا قبضہ درحقیقت پورے اندلس پر عیسائیوں کے قبضہ کی تمہید تھا اور طلیطلہ پر عیسائی قبضہ کا مطلب نصف اسپین پر عیسائیوں کا قبضہ تھا، یہی طلیطلہ مسلمانوں سے علوم وفنون کے یورپ منتقل ہونے کا مرکز بنا ہے، طلیطلہ کی فتح کے چھ برس بعد ۱۰۹۱ء میں سسلی بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے آخری بار نکل گیا، نارمن فاتحین نے ان علوم وفنون کے مسلمان فضلاء کی عزت افزائی اور قدر دانی کی ہے، جغرافیہ پر ادریسی کی کتاب اور اس کا وہ کرہ جس پر عالمی نقشہ بنا تھا انہیں سسلی کے سلاطین کی سرپرستی و نگرانی میں ہوا ہے اس طرح سسلی مسلمانوں سے ان علوم وفنون کے یورپ منتقل ہونے کا دوسرا مرکز بنا ہے۔ فتح سسلی کے چھ سات سال بعد فلسطین بھی صلیبی سپاہیوں کے ہاتھوں چلا گیا اگرچہ صلاح الدین ایوبی نے اکانوے سال بعد پھر قدس کو واپس لیا ہے۔ لیکن یہ بات نہ بھولنی چاہیے کہ پندرہ سال کے اندر طلیطلہ پورا سسلی اور بیت المقدس کے مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل جانے کی وجہ مسلمانوں کا سیاسی اور فوجی رعب اور ان کی برتری کا احساس یورپین اقوام کے دل و دماغ سے نکل گیا۔ لیکن یورپ میں ابھی مسلمانوں کی علمی برتری اور علوم وفنون میں ان کی فوقیت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا اور یورپ نے سسلی اور طلیطلہ کو مرکز بنا کر مسلمانوں سے یہ علوم عقلیہ اور تجربیہ اور علوم فلسفیہ اپنی شاخوں کے ساتھ حاصل کیے۔

مسلمانوں میں جب یہ علوم وفنون منتقل ہوئے ہیں تو خاص بات یہ ہوئی کہ خاص طور پر ان علوم وفنون کی تعلیم کے لیے الگ سے کالج و یونیورسٹیاں قائم نہیں کی گئیں بغداد و قاہرہ اور اسلامی مملکت کے بہت بڑے شہروں میں میڈیکل کالجوں کے قیام کا رواج تو تھا اور ان تمام خصوصیات کے ساتھ یہ طبی کالج قائم ہوئے تھے جو آج کل کا رائج نظام ہے۔ مسلمانوں کے میڈیکل کالجوں میں طب کی تعلیم بھی ہوتی تھی، طلبہ کو عملی مشق بھی کرائی جاتی تھی، طبیہ کالج کا ایک شعبہ ادویہ سازی کا بھی تھا، مریضوں کو دوائیں اور

پرہیزی غذائیں مفت دی جاتی تھیں۔ مختلف امراض کے وارڈس الگ الگ ہوتے تھے اور اس کے ساتھ ایک رعایت مریضوں کو یہ بھی دی جاتی تھی کہ جب وہ صحت یاب ہو کر جانے لگتے تھے تو دو تین دن کا خرچ بھی ان کو دیا جاتا تھا جو اس زمانہ میں نہیں ہے، لیکن دوسرے علوم عقلیہ کے لیے اسلام کی تاریخ میں مدارس کا مستقل وجود نہیں ملتا ہے۔ لیکن یورپ میں باقاعدہ ان علوم وفنون کی درسگاہیں قائم کی گئیں، اور ترجمہ کا کام زمانہ کی فکری اور علمی ترقی کے ساتھ زیادہ تیز رفتاری سے عمل میں آیا تیرہویں صدی عیسوی کے آخر تک یورپ نقل و ترجمہ کے کام سے فارغ ہو کر، یونیورسٹیوں میں ان علوم کے پڑھنے اور پڑھانے سے خود کفیل ہو گیا تھا۔ اب ضرورت تھی کہ ان علوم کو حاصل کرنے والے فضلاء فکر و آراء اور عمل کے نئے نئے میدان مہیا کریں اور ان علوم کو جن کے مزاج میں ترقی و پیش قدمی ہے آگے بڑھائیں چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اور یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یورپ کے فضلاء نے موت، جلاوطنی اور کلیسا کے محکمۂ احتساب کی طرف سے جسمانی اور ذہنی تکلیفیں اٹھا کر ان علوم کو آگے بڑھایا اور اپنی کوششوں اور محنتوں سے علوم عقلیہ کے آسمان و زمین کو بدل دیا، علوم عقلیہ کے تمام شعبوں میں ان کی پیش رفت، علم طب، خواص اشیاء، کیمسٹری، علم الہیئت والافلاک، علم السیاسۃ، علم الاقتصاد اور علم الانسان میں تحقیقات اور دقت نظر کا وہ ثبوت دیا جس نے یونان کو بھی بہت پیچھے چھوڑ دیا بلکہ یوں کہیے کہ نشأۃ ثانیہ کی عمارت انھوں نے یونانی علوم وفنون کے ملبے اور کھنڈر پر تعمیر کی، یونانی عقلیت اور اس کے نتائج تحقیق نیز کائنات اور اجسام طبعیہ کے قائم کردہ یونانی نظام کو پاش پاش کر دیا، زمین کا کروی الشکل ہونا اور اس سے بڑھ کر زمین کی حرکت کا نیا تصور، کشش ثقل کے راز کی یافت و دریافت، نظام فلکی کو نئے آلات سے مشاہدات نے زمین کو آسمان اور آسمان کو زمین کر دیا۔

بطلیموس کی کتاب مجسطی جو علم ہیئت میں آخری اور فیصلہ کن کتاب سمجھی جاتی تھی اور جس کی اساس زمین کے نظریۂ سکون پر تھی نشأۃ ثانیہ نے اس کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا۔ مادہ جو یونانی فلسفہ کے الہیات و طبعیات میں ایک ناقابل شکست وجود تھا اس کو نکال باہر کر دیا گیا۔ مادہ کا وجود نہ تو میٹا فزکس میں رہ گیا نہ فزکس میں رہ گیا۔ ایٹم اور خلا کا تصور ایک حقیقی تصور ہو گیا، علم انسانی کی حدود اور اس کے دائرۂ اختیار و عمل پر جرمن فلسفی کانٹ نے جو کچھ لکھ دیا وہ ایک تسلیم شدہ حقیقت بن گیا وغیرہ وغیرہ۔

یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے بعد سے اب تک علوم عقلیہ اور تجربیہ میں یا دوسرے لفظوں میں کہیے کہ فلسفہ کی تمام شاخوں میں جو ترقی اور نسل انسانی کو ان سے جو فائدہ حاصل ہوا ہے اس کی مثال نہ تو یونان میں ملتی ہے نہ تو اسکندریہ میں ملتی ہے، نہ تو ما بین النہرین میں ملتی ہے، نہ تو بغداد و اندلس میں ملتی ہے اور نہ تو ہندوستان میں ملتی ہے، یورپ کا یہ کارنامہ ہے کہ اس نے کلیسا کی مزاحمت کے باوجود اور علوم عقلیہ پر غور و خوض کی ممانعت کے باوجود تیزی سے ترقی کی ہے۔ یہ مزاحمت و روک نہ تو یونان میں اپنے زمانہ میں ہوئی تھی، اور نہ اسکندریہ اور بغداد میں ہوئی تھی، صرف سقراط کی موت کا واقعہ ہم سنتے ہیں لیکن وہ مسئلہ فلسفہ کی ایک اہم شاخ علم الاخلاق سے متعلق تھا۔

حضرات! مسلمانوں میں علوم عقلیہ کی آمد اور پھر مسلمان فضلاء کے ذریعہ یورپ میں علوم عقلیہ پہنچنے کی یہ مختصر داستان ہے، لیکن میں یہ بات صفائی سے عرض کردوں کہ علوم عقلیہ کسی قوم و ملک کی میراث نہیں ہوتے ہیں، مختلف زبانوں میں مختلف قومیں اور مختلف ملک ان علوم کے محافظ اور پاسبان اور ان کو اپنی بساط بھر ترقی دینے والے اور آگے بڑھانے والے ہوئے ہیں، اس لیے یہ سمجھنا کہ یہ علوم عقلیہ، یہ سائنس کے علوم یہ بڑی بڑی مشینوں سے متعلق علوم و فنون آئندہ بھی ان کا مرکز یورپ یا امریکا ہی رہے گا یا ماسکو رہے گا تاریخی عمل اور نظام سے ناواقفیت ہے، یہ بعید نہیں ہے کہ آئندہ تیس، چالیس سالوں کے اندر ہندوستان آگے بڑھ جائے اور دنیا اس کی پیروی کرے جس طرح ہم آج ان علوم میں یورپ و امریکا کی پیروی کر رہے ہیں۔

یہ مختصر روداد ہے علوم عقلیہ کے مسلمانوں میں آمد اور پھر مسلمانوں کے ذریعہ یورپ منتقل ہونے کی تفصیل کے لیے علوم و فنون کی تاریخ پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کی طرف رجوع کیا جائے مثلاً قفطی کی تاریخ الحکماء وغیرہ جن کا حوالہ گزر چکا ہے۔

تحریر: امیر البیان شکیب ارسلان　　　　تلخیص و ترجمہ: مولانا نذر الحفیظ ندوی

سنوسی خانقاہیں

جہاد اور تزکیہ کی جامع درس گاہیں

[گزشتہ دو شماروں میں "سنوسی اور سنوسیت" کے عنوان سے اس خاندان کے مجاہدانہ کارناموں کا ایک رُخ پیش کیا گیا تھا، مکمل تاریخ تو کئی سو صفحوں کی طالب ہے جو ایک ماہنامہ کی بساط سے باہر ہے، البتہ اس تاریخ کا تابناک قابل نمونہ پہلو یہاں کا تربیتی نظام ہے جو سنوسی خانقاہوں میں رائج تھا۔ زیر نظر مضمون دراصل گزشتہ شائع شدہ مقالہ کی آخری قسط ہے جس کے شروع میں گزشتہ مضمون کا تتمہ ہے، اس کے بعد سنوسی خانقاہوں کے تربیتی نظام کا ذکر ہے]

پہلی جنگ عظیم ختم ہونے ہی والی تھی، ترکوں کو یقین ہوگیا کہ اب ان کی اور جرمنوں کی گت بنے گی، اس صورت حال کی نزاکت کا احساس کر کے انور پاشا نے شیخ سنوسی کو مشورہ دیا کہ آپ جلد سے جلد واپس طرابلس تشریف لے جائیں، انور نے ایسی باتیں کیں جیسے وہ شیخ کو یہ بتانا چاہتے ہوں کہ اب افریقی مسلمانوں کی نگاہیں آپ کی طرف مرکوز ہیں، انور نے اس کی بھی صراحت کی کہ خود سلطان کی بھی یہی خواہش ہے کہ آپ کی واپسی سے طرابلس کے مجاہدین کے عزائم کو تقویت ہوگی، آپ کو فوری طور پر بارہ ہزار بندوقیں مع کارتوس نیز دس توپیں، تیس مشین گنیں اور دو لاکھ اسٹرلنگ پونڈ دیا جا رہا ہے، یہ بات سُن کر شیخ سنوسی نے انور پاشا سے کہا کہ طرابلس کے جو لوگ یہاں ترکی حکومت میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں ان کے ذریعہ مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ آپ کی خواہش یہ ہے کہ ہم واپس جا کر اپنے عم زاد بھائی سیدی ادریس سنوسی سے جنگ شروع کر دیں، اس لیے کہ انھوں نے اٹلی اور انگریزوں سے صلح کر لی ہے انور نے یہ سُن کر کہا: حاشا کلا، ہم ہرگز ایسا نہیں چاہتے، ہم کو خوب اچھی طرح معلوم ہے کہ افریقہ

کے براعظم میں اس وقت سنوسی خاندان سے بڑھ کر اسلام اور مسلمانوں کا کوئی پُشت پناہ نہیں ہے، اگر خدانخواستہ اس خاندان کے اتحاد میں کسی طرح کوئی رخنہ پڑ گیا اور سنوسیوں کی قوت کمزور ہوگئی تو پھر افریقہ میں اسلام کا کوئی حامی و مددگار نہیں، آپ ہم پر مکمل اعتماد کریں، ہم ہر قیمت پر سنوسی خاندان کو متحد دیکھنا چاہتے ہیں، ہماری خیرخواہی اور مخلصانہ تعاون آپ کے ساتھ صرف اسلام کی حمایت اور مدد کے لیے ہے، ترکی کو اس کی کوئی توقع نہیں کہ طرابلس کو بازیاب کیا جا سکتا ہے، لیکن ہم اس کے باوجود یہ قطعاً پسند نہیں کرتے کہ ہمارے افریقی مسلمان استعماری طاقتوں کے ماتحت رہیں۔" انور کے متعلق یہ بات مشہور تھی کہ وہ اسلامی اتحاد کو بہت عزیز رکھتے اور پوری اسلامی دنیا کو ایک نگاہ سے دیکھتے تھے اس بنا پر ان کا اختلاف اپنے رفقاء سے ہوگیا تھا۔

شیخ سنوسی نے طرابلس واپسی کا عزم مصمم کر لیا تھا کہ کسی نے بتایا کہ جس آبدوز سے آپ تشریف لے جائیں گے وہ آپ کو مصراطہ کے ساحل پر اتار دے گی، یہ علاقہ ان دنوں رمضان شتیولی کے قبضہ میں ہے اس لیے وہ علاقہ آپ کے لیے قطعاً محفوظ نہیں ہے۔ اس بات کو سُن کر شیخ سنوسی سوچ میں پڑ گئے کہ کہاں اتریں کہ نہ رمضان شتیولی کا سامنا کرنا پڑے اور نہ ہی اٹلی والوں سے سابقہ پڑے، اسی سوچ میں تھے کہ پے درپے تیزی سے حالات میں ڈرامائی تبدیلیاں ہونے لگیں، اچانک وزارت تبدیل ہوگئی، انور پاشا اس میں جگہ نہ پا سکے، اب شیخ سنوسی کو ندامت ہوئی کہ انھوں نے تردّد اور تاخیر سے کیوں کام لیا، شیخ نے آستانہ (قسطنطنیہ) سے خوشی سے پولینڈ جانے اور وہاں سے آبدوز کے ذریعہ واپسی کا ارادہ کر لیا، اس کا احساس ہوتے ہی محمد السادس وحید الدین نے شیخ سنوسی کو اس عزم سے باز رکھنا چاہا اور ان پر زور دیا کہ ایسے سنگین حالات میں آپ کی جدائی ہم پر شاق گزرے گی، شیخ سنوسی کا خیال تھا کہ ان کے ساتھ فریب کیا جا رہا ہے تاکہ جب آستانہ پر دشمنوں کا قبضہ ہو جائے تو ان کو گرفتار کر لیا جائے، خود انور پاشا وزارت سے نکل جانے کے بعد بھی شیخ سنوسی کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے، ان کی بھی رائے یہی تھی کہ آپ جلد سے جلد ترکی سے یورپ کے کسی ملک تشریف لے جائیں، مبادا دشمنوں کے قبضے میں آپ چلے جائیں، آخر کار بڑے صلاح و مشوروں کے بعد ترکی کے شہر بروسہ جانے کا شیخ نے فیصلہ کیا، عثمانی حکومت نے بھی شیخ کے استقبال کا غیر معمولی اہتمام کیا، بروسہ کے ہر گورنر کو سلطان کی طرف سے یہی تاکید کی جاتی تھی کہ شیخ کی خدمت میں برابر جا کر مزاج پرسی کرتے رہیں اور ہر ممکن طریقہ سے ان کی دلداری کی جائے، جب تک شیخ کا قیام ترکی میں رہا ہر طرح سے ان کے

ساتھ عزت و تکریم کا معاملہ کیا جاتا رہا، وزارتیں بدلتی رہیں لیکن ترک حکومت کی طرف سے حسن سلوک اور اعزاز میں کوئی فرق نہیں آیا، ترک عوام کو بھی شیخ کے ساتھ غیر معمولی عقیدت و محبت تھی، ان کی غیر معمولی متوازن شخصیت ذاتی اور شخصی اغراض و خواہشات سے بے رغبتی، دنیا اور اس کے جھمیلوں، مادیت اور اس کی دلفریبیوں سے کنارہ کش ہو کر صرف دین کے لیے جد و جہد کرنا اور محض رضائے الٰہی کے جذبہ سے مسلمانوں اور اسلام کی خدمت کرنا یہ ان کی وہ صفات تھیں جن کے سب ہی ترک معترف تھے اور دل سے ان کے قدرداں بھی، چنانچہ ترک عوام بڑی تعداد میں شیخ سنوسی کی زیارت کے لیے اہتمام سے جاتے، ترکوں کی کافی تعداد نے سنوسی طریقہ کو اختیار بھی کر لیا تھا۔

سنوسیوں اور ان کے اہم ارکان سیدی محمد سنوسی، ان کے فرزند عالی مقام سیدی مہدی کے حالات و واقعات کے مطالعہ اور خود سیدی احمد الشریف سنوسی سے مفصل ملاقاتوں کے بعد اس نتیجہ تک پہونچا ہوں کہ سنوسیوں کا طریقہ ایک عملی طریقہ تھا جس میں کتاب و سنّت پر عمل پیرا ہونے کے ساتھ اذکار و اوراد کے اہتمام اور اسلام کے بنیادی فرائض و حقوق کی ادائیگی بھی ضروری ہے جیسا کہ قرنِ اول کے مسلمانوں کی مبارک زندگی تھی یعنی ؎

در کفے جام شریعت در کفے سندانِ عشق

اسی سندانِ عشق ہی کی کارفرمائی نے سنوسیوں کو اٹلی جیسی عظیم طاقت سے مسلسل تیرہ سال تک نبرد آزمائی پر تیار کیا، اگر سنوسیوں کے اندر جذبۂ جہاد اور تسبیح و مناجات کا ذوق اور عشق نہ ہوتا تو طرابلس اور برقہ جیسے شہر اٹلی کی پہلی یورش میں ڈھیر ہو کر رہ جاتے، لوگوں نے بتایا کہ اٹلی نے طرابلس اور برقہ پر قبضہ کے لیے پندرہ دن کا اندازہ لگایا تھا، لیکن صحرائی جنگ کے ماہر برطانوی جنرلوں نے پیشین گوئی کی تھی کہ یہ مدت تین ماہ تک بھی بڑھ سکتی ہے اس لیے کہ اٹلی کی فوجوں کو صحرائی جنگ کا تجربہ نہیں ہے، لیکن دونوں پیشین گوئیوں کے برعکس تیرہ سال تک سنوسیوں نے جہاد کا علم بلند رکھا اور ہنوز جنگ کا نتیجہ اٹلی کے لیے روزِ اول کی طرح ہے، اس طویل اور صبر آزما جہاد میں سنوسی مجاہدین خصوصاً سیدی احمد الشریف سنوسی نے بنیادی کردار ادا کیا ہے۔

سنوسیوں نے جہاد کا پرچم بلند رکھنے کے ساتھ ساتھ افریقہ کے جنگلوں اور دور دراز صحرائی علاقوں میں دعوتی کام وسیع پیمانے پر انجام دیے، ان کی مخلصانہ اور سرگرم دعوتی جد و جہد سے افریقہ کے جنگلی انسان بن گئے، ان کے اخلاق میں غیر معمولی اور حیرت انگیز انقلاب آ گیا، جو علاقے سنوسی دعوت سے

غیر معمولی حد تک متاثر ہوئے ان میں سوڈان کے پڑوسی ممالک تھے، سنوسی مبلغین میں شیخ محمد بن عبداللہ السنی، شیخ حمودہ مقعاوی اور سید طاہر دغاری اور دیگر حضرات نے پورے براعظم افریقہ کا وسیع پیمانہ پر دورہ کیا اور بڑے حصے کو اسلام کی تعلیمات سے روشناس کرایا، اس وقت افریقہ کے پورے علاقہ میں عیسائی مشنریز کا جال بچھا ہوا تھا، ان کے کاموں میں سب سے بڑی رکاوٹ اور مزاحمت یہی سنوسی تحریک تھی، چنانچہ نائیجر، کانگو، کیمرون اور چاڈ جیسے علاقوں میں عیسائی مبلغین بے بس ہوگئے اور انھوں نے اٹلی، فرانس اور برطانیہ سے شکایت کی کہ سنوسی مبلغین کے خلاف کوئی کارروائی کی جائے سنوسیوں کی دعوتی جدوجہد اور ان کے داعیوں میں ایسی غیر معمولی کشش ہے کہ ہم اپنے تمام تر مادی وسائل و ذرائع کے باوجود ناکام ہو رہے ہیں جب کہ وہ مادی سہولتوں سے محروم ہوتے ہوئے بھی کامیاب ہیں اور ان کے ہاتھوں لاکھوں انسانوں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔

سیدی مہدی کی سیرت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صحابہ و تابعین کے نقش قدم پر تھے، عبادت اور جہاد دونوں جذبوں اور نعمتوں سے بہرہ ور تھے، وہ فرمایا کرتے کہ قرآنی احکام کی تنفیذ کے لیے طاقت کا حصول ضروری ہے، چنانچہ جہاں وہ اپنے مریدوں کو عبادت اور مناجات اور تزکیۂ نفس پر آمادہ کرتے وہیں ان کو شہسواری اور نشانہ بازی کی مشق کرنے کی ترغیب دیتے اور بہ نفس نفیس شریک بھی ہوتے۔

شیخ سنوسی نے اپنے مریدین میں دعوت و جہاد کا ایسا جذبہ پیدا کر دیا تھا اور عملی طور پر بھی ان کو جہاد میں مشق کراتے رہتے اور جہاد و شہادت کی فضیلت ان کے دل و دماغ میں اس طرح اتار دی تھی کہ عبادت و مناجات اور جہاد کے جذبہ سے ہر وقت پوری جماعت سرشار رہتی تھی، صرف طرابلس کی جنگ میں سنوسیوں نے مجاہدانہ کردار ادا نہیں کیا بلکہ فرنچ فوجوں کے ساتھ بھی سوڈان کے بعض حصوں میں ان کی معرکہ آرائی ہوئی تھی جس میں سنوسی مجاہدین سرخرو ہوئے تھے۔

سیدی احمد الشریف نے مجھ سے تذکرہ کیا کہ ان کے چچا کے پاس خاص ان کی پچاس بندوقیں تھیں جن کی وہ دیکھ بھال اور صفائی خود اپنے ہاتھ سے کرتے، اگر کوئی مرید اس خدمت کو بجالانے کا ارادہ کرتا تو اس پر تیار نہ ہوتے، اس سے ان کے مریدین کے اندر مزید شوق و ولولہ اور جذبۂ جہاد پیدا ہوتا اور اپنے اسلحوں کو سنبھال کر رکھتے۔

سنوسی خانقاہوں میں جمعہ کے دن جنگی مشق اور اسلحہ کی صفائی ہوا کرتی تھی، سیدی احمد الشریف ایک بلند جگہ بیٹھتے، خانقاہ کی جماعت دو حصّوں میں تقسیم ہو جاتی، پھر شہ سواری، نیزہ بازی کے ساتھ بندوق سے بھی نشانہ بازی کی مشق ہوتی، شیخ کے وہ تمام مریدین جو درس و تدریس میں مشغول رہا کرتے تھے ان کی بڑی تعداد جنگی اسلحہ کے استعمال میں مہارت رکھتی تھی، کبھی کبھی مقابلہ بھی کرانے کا اہتمام ہوتا تھا اس میں کامیاب ہونے والوں کو انعامات بھی دیے جاتے۔

جمعرات کا دن ہاتھ سے کام کے لیے مخصوص تھا، اس دن خانقاہ کا ہر شخص خواہ عالم ہو یا طالب علم، فوجی ہو یا مدرس و معلم، کسی نہ کسی کام میں مشغول ہوتا، بعض لوگ بڑھئی کا کام کرتے، بعض لوگ لوہاری کا، کچھ لوگ کپڑے بننے اور عمارتوں کی تعمیر میں لگ جاتے، کچھ لوگ صحافت کے کاموں میں مشغول اور اداراتی امور کو انجام دینے کے لیے مخصوص ہیں، غرض کہ ہر شخص کسی نہ کسی کام میں مصروف ہوتا، خود سیدی احمد الشریف بھی اپنے ہاتھ سے اس دن سب کے ساتھ مل کر کام کرتے، باغبانی اور زراعت کا اہتمام بھی سنوسی خانقاہوں میں تھا، ہر خانقاہ کے ساتھ دو تین پھلدار باغوں کا ہونا ضروری تھا، دور دراز ملکوں سے انواع و اقسام کے پھلدار پودے لائے جاتے اور بڑے اہتمام سے ان کو لگایا جاتا، واحۃ الکفرہ اور جغبوب کے پھلدار باغوں اور وہاں کی زرعی پیداوار پورے ملک میں مشہور تھی۔

بعض مریدین شیخ سے کہا کرتے کہ ان کو کیمیا سکھا دیں، آپ فرماتے کہ کیمیا ہاتھ کی کمائی اور پیشانی کے پسینے بہانے کا نام ہے، اپنے مریدین کو صنعت و حرفت اختیار کرنے پر آمادہ کرتے، ان کی دلداری اور تسکین خاطر کے لیے ایسے جملے بھی فرمائے جن سے ان کو مسرت ہوتی، کبھی پیشہ وروں سے فرماتے کہ تم اپنے پیشوں کو حقیر اور کمتر نہ خیال کرو تمھارے لیے صرف یہ بات کافی ہے کہ شرعی فرائض کی ادائیگی کے ساتھ اپنے پیشوں کو نیک نیتی سے انجام دیتے رہو، کبھی خود سیدی احمد الشریف ان پیشہ وروں کے کام میں شریک ہو جاتے اور ان سے باتیں کرتے ہوئے فرماتے کہ اہل علم اور دعا و مناجات کرنے والے تم سے آگے نہیں بڑھ سکتے، تم اپنے پیشوں میں حسن نیت اور رضائے الٰہی سے لگے رہو یہی کافی ہے، اس میں تمھارے دین کی ترقی ہے۔ یہ بھی فرماتے کہ ملک کی ترقی، قوت اور تمدن کا انحصار صنعت و حرفت پر ہے۔

سنوسی جماعت کے اندر مکمل طور پر شریعت پر عمل ہوتا تھا، وہ صوفیانہ زہد و ذکر کے ساتھ اعلیٰ درجہ کے مجاہد بھی تھے۔ اسی طرح تنظیم میں بھی ان کا جواب نہیں تھا۔ سنوسیوں میں جو چوٹی کے علما و مجاہدین گزرے

ہیں ان میں بانی و مؤسس سید محمد علی بن سنوسی، سیدی عمران بن برکہ، سیدی احمد التواتی، سیدی عبدالرحیم بن احمد، سیدی عبداللہ السنی، سیدی ابوالقاسم العیساوی، یہ تمام حضرات اعلیٰ اخلاق اور سیرت و کردار کے حامل تھے۔

سیدی مہدی کے اقوال سے آپ ان کے مرتبہ اور علم و فہم اور تجربہ و پختگی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ وہ فرماتے تھے کہ تم کسی شخص کو بھی حقارت کی نظر سے نہ دیکھو، خواہ مسلمان ہو یا عیسائی یا یہودی یا کافر ہوسکتا ہے اللہ کے نزدیک اس کا مرتبہ بلند ہو اس لیے کہ تم کو نہیں معلوم کہ تمہارا خاتمہ کس پر ہوگا؟

سیدی احمد الشریف سنوسی کی عمر اگرچہ پچاس سے متجاوز ہے لیکن ان کی جسمانی کاٹھی اتنی مضبوط ہے کہ بالکل نہیں معلوم ہوتا کہ وہ پچاس سال کے ہو چکے ہیں، اس لیے بھی کہ شاذ و نادر کہیں کہیں بالوں میں سفیدی ہے، جسم دوہرا، سینہ فراخ، آنکھیں شعلہ کی مانند روشن، تابناک پیشانی، شخصیت غیر معمولی وجیہ اور بارعب یہ ممکن نہیں کہ کوئی شخص انھیں دیکھے اور ان کے احترام میں سرو قد کھڑا نہ ہو جائے۔

شیخ سنوسی نے تین بار ترکی کا دورہ کیا، ایک بار عالمی جنگ عظیم سے پہلے، دوسری بار جنگ کے دوران، پھر جنگ عظیم کے خاتمہ پر، ہر بار ان کا سرکاری پیمانہ پر استقبال کیا گیا لیکن مصطفیٰ کمال کے عہد کے ابتدائی دور میں ان کے ساتھ اعزاز و اکرام کا معاملہ اس وقت تک کیا گیا جب ان سے کام لینا تھا، چنانچہ قونیہ کی بغاوت فرو کرنے اور کردوں کو مطیع و فرماں بردار بنانے میں شیخ سنوسی نے بنیادی کردار ادا کیا، لیکن لوزان معاہدہ کے بعد ہی اس گرم جوشی اور تعظیم و تکریم میں فرق آگیا، کمال حکومت موقع کی تلاش میں رہنے لگی کہ کسی طرح سنوسی کو ترکی سے چلے جانے کا مشورہ دے، اس لیے کہ اطالوی حکومت سنوسی کی ترکی میں موجودگی پر خفگی ظاہر کر چکی تھی، آخر ایک بہانہ کمالی حکومت کو ہاتھ ہی آگیا۔

واقعہ یہ پیش آیا کہ ایک ترک نوجوان نے (جو سنوسی طریقہ میں داخل ہو چکا تھا) شیخ سے عرض کیا کہ ہم بیروت جا رہے ہیں وہاں معزول خلیفہ سلطان عبدالحمید کے سب سے بڑے فرزند شہزادہ سلیم مقیم ہیں آپ ان کے نام ایک سفارشی خط تحریر فرما دیجیے، شیخ نے یہ کہہ کر معذرت کی کہ ہم ان کو کیسے خط لکھ سکتے ہیں ہمارے اور ان کے درمیان کوئی مراسلت بھی نہیں ہوئی ہے، لیکن ترک نوجوان اس سفارشی خط پر اتنا مصر ہوا کہ شیخ کو خط لکھنا ہی پڑا، خط کے آخر میں شیخ نے واللّٰہ مع الصابرین کی آیت لکھ دی جو آلِ عثمان کے حسب حال تھی کہ وہ لوگ اب غربت و مسافرت کی زندگی گزار رہے ہیں، یہ ترک نوجوان جب ترکی اور شامی

حدود کے درمیان حلب شہر پہونچے تو محافظوں نے سامان کی سختی سے تلاشی لی، اس میں سے یہ خط برآمد ہوا، یہ خط انقرہ بھیج دیا گیا، وہاں سے حکم آیا کہ نوجوان کو یہاں بھیج دیا جائے، پولیس حکام نے اس نوجوان پر سختی کی تو اس نے اس کا اعتراف کیا کہ اسی نے شیخ سے بڑے اصرار کے بعد یہ تعارفی خط حاصل کیا تھا اور واقعی وہ شہزادہ سلیم سے ملاقات کرنے جا رہا تھا، اس نوجوان کو معمولی عدالتی کارروائی کے بعد اسی طرح پھانسی دے دی گئی جس طرح ہزاروں بے گناہوں کو کمالی حکومت نے تختۂ دار پر لٹکا دیا تھا، جرم صرف یہ تھا کہ وہ کمالی حکومت کو پسند نہیں کرتے۔

اس ترک نوجوان کو پھانسی دینے کے بعد کمالی حکومت نے مرسین کے گورنر کو ہدایت دی کہ شیخ سنوسی کو اسی وقت فوراً ترکی سے نکل جانے کا حکم دے دیا جائے، شیخ کو جب یہ حکم نامہ ملا تو انھوں نے اتنی مہلت طلب کی کہ سفر کے لیے ضروری تیاری کا موقع دیا جائے، ان کے پاس سامانِ سفر اور زادِ راہ بھی نہیں ہے بعض اشیاء کو فروخت کر کے وہ سفر پر روانہ ہو جائیں گے، گورنر نے اس درخواست سے انقرہ کو مطلع کیا، وہاں سے یہ حکم صادر ہوا کہ ایک گھنٹے کی بھی مہلت نہیں ہے، اسی وقت ملک سے جس حال میں ہوں نکل جائیں، حالاں کہ اس سے پہلے ترکی حکومت نے یہ پیش کش کی تھی کہ شیخ جب بھی ترکی سے جائیں گے ان کو دو ہزار اسٹرلنگ پونڈ دیے جائیں گے لیکن ترکی حکومت اپنے اس وعدہ کو فراموش کر بیٹھی اس کے نزدیک واللہ مع الصابرین کا جملہ آلِ عثمان کے لیے لکھنا ناقابلِ معافی جرم تھا، اس کا صریح مطلب یہی تھا کہ شیخ سنوسی گویا آلِ عثمان کی دوبارہ واپسی کے متمنی ہیں، کمالی حکومت نے تمام ترک اخبارات میں شیخ سنوسی کی تصویر شائع کرائی جس کے نیچے یہ جملہ بھی لکھا تھا کہ "یہ اس سنوسی کی تصویر ہے جس نے ملک کے ساتھ خیانت اور غداری کی ہے"۔

شیخ سنوسی مجبوری اور بے چارگی کے عالم میں اسی وقت شام ہوتے ہوئے بیروت گئے، وہاں سے بیت المقدس کی زیارت کے لیے تشریف لے گئے، وہاں سے واپس شام آئے، پھر موٹر کے ذریعہ مدینہ منورہ چلے گئے جہاں سعودی حکومت نے ان کا پرجوش خیر مقدم کیا اور ان کی شاہانہ میزبانی کی۔ ان دنوں وہاں الجزائری شہزادہ سعید موجود تھے، انھوں نے بھی شیخ کو ہاتھوں ہاتھ لیا، بڑی خاطر مدارات کی، شیخ عرصہ تک مدینہ منورہ میں مقیم رہے، حج کے لیے مکہ مکرمہ آئے تو چند ماہ یہاں بھی قیام کیا پھر عسیر اور جیزان تشریف لے گئے وہاں علی سید حسن ادریس کے

کے مہمان رہے اس لیے کہ سنوسی اور ادریسی خاندان کے درمیان بڑے گہرے تعلقات اور مخلصانہ روابط تھے، وہاں ایک عرصہ تک قیام کے بعد طائف، مکہ مکرمہ میں تھوڑے عرصہ قیام کرکے مدینہ منورہ چلے گئے جہاں کچھ عرصہ بعد مسافرت اور بے کسی کے عالم میں اس مجاہد نے ۱۳۵۱ھ مطابق ۱۹۳۳ء میں اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کردی۔

شیخ احمد سنوسی کے حالات وسیرت سے ذاتی اور گہری واقفیت کی بنیاد پر لکھتا ہوں کہ اگر وہ قرنِ اوّل کے غزوات وجہاد میں شریک ہوتے تو بلاشبہ دوسرے ممتاز صحابہ کرام اور اس وقت کے فوجی قائدین میں ان کا شمار ہوتا۔

واقعہ یہ ہے کہ ۲۰۴ مہینے تک اطالوی فوجوں کا مقابلہ کرنا آسان کام نہ تھا جب کہ اطالوی فوجوں کے پاس توپ خانہ، ہوائی جہاز اور دیگر جدید ترین اسلحہ تھے۔ بعض مریض قسم کے لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ آخر اتنے عرصہ تک جنگ کرنے کا نتیجہ کیا نکلا، اطالوی اقتدار لیبیا پر اور بھی مستحکم ہوگیا اور اس نے لیبیا کے عوام پر مزید ظلم وستم کے پہاڑ توڑے، اگر اطالوی یورش کے پہلے ہی مرحلے میں ان کا قبضہ مغربی طرابلس اور برقہ پر ہو جاتا اور لیبیا کے عوام ان کے قبضہ کو تسلیم کر لیتے تو یہ کہیں بہتر تھا۔ میں ان مریض اور بزدل قسم کے لوگوں سے صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ آپ یورپ کی تاریخ سے بھی اس کی مثال پیش کر سکتے ہیں، بھلا کسی بھی یورپی ملک نے کسی دوسرے یورپی ملک کے قبضہ کو ایک لمحہ کے لیے بھی گوارا کیا، فرانس نے جرمنی کے قبضہ کے خلاف کتنی زبردست جدوجہد کی آخر کار اس کو ملک چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا، آزادی اور استقلال کو جو قومیں پسند کرتی ہیں وہ ہرگز غلام رہنا اور کسی دوسری قوم کے تابع رہنا گوارا نہیں کرتیں، جو قومیں بغیر دفاع کے مرجاتی ہیں ان کے لیے موت ہی بہتر ہے۔

کسی عرب نے شاعر نے کہا ہے:

"اور تمہارے اندر قوت ہو تو اپنے دشمن سے شمشیر وسنان سے جنگ کرو ورنہ قرطاس وقلم ہی استعمال کرو، دشمن کی دشمنی اس طرح کبھی نہیں ختم ہو سکتی کہ تم ہمیشہ کے لیے اس کے آگے سر تسلیم خم کر دو۔"

اس سیاست پر قدیم اور جدید دور میں عمل ہوتا رہا ہے، اگر اطالوی فوجیں طرابلس پر بلا مقابلہ قابض

ہو جاتیں تو یورپی ممالک کے سامنے تمام عرب ممالک کے دروازے کھل جاتے۔

امیر شکیب ارسلان نے افریقہ میں اشاعت اسلام کی جدوجہد کا جائزہ لیتے ہوئے ایک دوسرے مضمون میں قادری، تیجانی، درویشی، شاذلی اور مہدیوں کی جماعت کا ذکر کیاہے، امیر نے افریقہ میں اسلامی دعوت کے غیر معمولی اثرات اور ہمہ گیری کا ذکر کرتے ہوئے لکھاہے کہ اصلاً ان تمام جماعتوں پر تصوف کا رنگ چھایا ہوا تھا اس لیے انھیں اس علاقہ میں کامیابی ہوئی وہی تصوف جو اپنے ماننے والوں میں زہد وتقشف کی زندگی اور احتساب کی روح پیدا کرتا ہے۔ امیر شکیب نے سنوسی تحریک کے غیر معمولی اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے سنوسی خانقاہوں سے منسلک چار ملین مریدین کی تعداد بتائی ہے، پھر آخر میں افریقہ کے مختلف علاقوں میں ایک سو تیس خانقاہوں اور ان کے سربراہوں کی فہرست دی ہے، اس میں جدہ و مدینہ منورہ اور ینبع کی خانقاہوں کا ذکر ہے۔ امیر نے سنوسی طریقہ تبلیغ کا ذکر کرتے ہوئے لکھاہے کہ سنوسی مبلغین سوڈان کے علاقوں سے کمسن غلاموں کو خرید کر جغبوب لاتے، وہاں ان کی اسلامی تربیت کا غیر معمولی اہتمام کرتے، پھر جب یہ لوگ علم وعمل میں پختہ ہو جاتے تو ان کو آزاد کر دیتے، اس طرح ہر سال سیکڑوں داعی تیار ہو کر افریقہ کے دور دراز علاقوں میں پھیل جاتے۔ یہ حضرات تاجروں اور مبلغوں کی صورت میں کام کرتے لیکن جس علاقے میں بھی جاتے وہاں ایک خانقاہ ضرور تعمیر کرتے، اس میں مسجد، مدرسہ، رہائشی مکانات کے علاوہ اس خانقاہ کی آمدنی کے لیے پھلدار باغات بھی لگاتے، غلے میں یہ خانقاہیں خود کفیل بھی ہوتیں کہ ہر خانقاہ کے ساتھ زرعی فارم بھی ہوا کرتے تھے۔

ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی

قصیدۂ بُردہ

(۶)

جَاءَتْ لِدَعْوَتِهِ الْاَشْجَارُ سَاجِدَةً تَمْشِیْ اِلَیْهِ عَلٰی سَاقٍ بِلَا قَدَمِ
کَاَنَّمَا سَطَرَتْ سَطْرًا لِمَا کَتَبَتْ فُرُوْعُهَا مِنْ بَدِیْعِ الْخَطِّ بِاللَّقَمِ

(آپؐ کے معجزات کے بیان میں یہ واقعات بھی ہیں:)

آپ کے بلانے پر درخت بغیر اپنی جڑوں کے صرف تنوں پر سر جھکائے چلے آئے، گویا کہ ان درختوں نے راستے کے بیچ ایک سطر کھینچ دی جس کو ان شاخوں نے نایاب رسم الخط میں لکھ دیا تھا۔

ان دونوں شعروں میں ایک معجزہ کا ذکر ہے، جس کی ایک روایت مستند ہے۔ امام مسلمؒ نے حضرت جابرؓ سے روایت کی ہے کہ ایک مرتبہ آپ حاجت بشری کے لیے جا رہے تھے [مگر کوئی آڑ کسی درخت یا ٹیلہ کا نہ تھا۔ اور عادت شریفہ یہ تھی کہ جب آپ اس قصد سے نکلتے تو جتنی دور لوگ عام طور سے جایا کرتے ہیں اس سے کہیں زیادہ اور نکل جاتے کہ لوگوں کی نگاہ وہاں تک نہ پہونچتی اور کسی پہاڑ کے کھوہ یا درختوں کے جھنڈ میں اپنے آپ کو پوشیدہ کر لیتے، مگر اس مرتبہ سامنے کوئی جھاڑی نہ تھی، درخت تھے مگر متفرق اکا دکا، جو پردہ کا کام نہیں دے سکتے تھے] اس موقع پر ایک معجزہ کا ظہور ہوا جس کو سبھوں نے دیکھا کہ آپؐ نے ایک درخت کی شاخ ہاتھ سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچی وہ پورا درخت آپ کے ساتھ کھنچتا ہوا اس طرح آیا جیسے کسی جانور کے کان پکڑ کر کوئی لے آئے۔ آپؐ نے اسی طرح دوسرے درخت کی شاخ پکڑ لی اور وہ ساتھ ہو لیا۔ ان دونوں کو آپؐ بیچ میدان میں لے آئے اور ان دونوں درختوں نے ایک دیوار سی بنا دی[1]، اس کو شاعر حضرت بوصیریؒ تشبیہ دیتے ہیں کہ گویا صفحۂ قرطاس پر ایک لکیر کھینچ دی۔

---

[1] یہ روایت صحیح مسلم باب الزہد میں ہے۔ اسی حدیث میں یہ بھی مذکور ہے کہ بعد میں یہ دونوں درخت اپنی اپنی جگہ پر از خود واپس گئے۔

مقصد، وسیلہ راہ کو کہتے ہیں، اور سجدہ کرنے کا مفہوم لغوی معنوں میں ہے کہ جھک کر مطیع و فرمانبردار ہو کر۔ اور اگر زمین بوس ہونے کا مفہوم ہو تو "مقصد پردہ پوشی" حاصل نہ ہوگا۔

ایک اور روایت شیخ باجوریؒ نے اپنی شرح میں نقل کی ہے مگر بزرگان سلف عام طور پر احادیث کی تخریج اور اس کی سند کا ذکر کرنا ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ "سفر السعادۃ" مطبوعہ حلبی مصر ۱۳۰۲ھ میں یہ روایت موجود ہے۔ قاضی عیاض نے الشفاء میں بھی اس کو نقل کیا ہے۔ بہرحال ان حوالوں سے یہ روایت نقل کرتا ہوں۔

ایک اعرابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اپنا کوئی معجزہ (آیۃ) دکھائیے، جس سے یہ سمجھوں کہ آپ اللہ کے فرستادہ سچے نبی ہیں۔ آپ نے فرمایا، تم سامنے درختوں میں سے کسی درخت سے کہو تم کو رسول اللہ بلاتے ہیں۔ چنانچہ وہ گیا اور ایک درخت سے مخاطب ہو کر کہا، تم کو رسول اللہ بلاتے ہیں۔ وہ درخت دائیں جانب مائل ہوا، پھر بائیں رُخ مڑا، آگے کی طرف جھکا اور پشت کی جانب خمیدہ ہوا اور اس کی جڑیں زمین سے جُدا ہو گئیں اور وہ پورا درخت رینگتا ہوا اس بدوی کے ساتھ ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا اور بہ آواز بلند ہوئی السلام علیک یارسول اللہ!۔ اعرابی (بدو) نے عرض کیا اب آپ اس کو واپس جانے کا حکم دیجیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اشارہ سے واپس ہونے کا حکم دیا اور وہ درخت اسی طرح رینگتا ہوا اپنی جگہ پر جاکر جم گیا۔

مِثْلَ الغَمَامَةِ أنّى سَارَ سَائِرَةً   تَقِيهِ حَرَّ وَطِيسٍ للهَجِيرِ حَمِي

جس طرح ابر کا ٹکڑا جہاں آپ جاتے وہ سایہ فگن رہتا، آپ کو دوپہر کی سخت تپش کی گرمی سے محفوظ رکھتا۔

(عربی داں حضرات کے لیے "مثل" لفظ ماقبل "الاشجار" کا حال منصوب بھی ہو سکتا ہے اور سائرۃ اس کی صفت، اور تقی الخ حال، وطیس دراصل تنور کو کہتے ہیں، سورج یا جنگ کے لیے استعارہ تصریحیہ ہے۔ ھجیرۃ اشتداد حرارۃ کا وقت۔ حَمِی ماضی گرم ہوا بمعنی حام، فاعل للمبیں)

پہلے دو شعروں میں ایسے معجزے کا ذکر تھا جس کا تعلق زمین سے تھا۔ اس شعر میں ایسے معجزہ کا ذکر کیا ہے جس کا تعلق اوپر آسمان سے ہے۔ بادل کا ٹکڑا آپؐ کے لیے سایہ فگن رہا ہے۔ اس کا واقعہ تمام

احادیث و سیر کی کتابوں میں موجود ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عم بزرگوار ابو طالب اور دوسرے بزرگان قریش کے ہمراہ ایک تجارتی قافلہ کے ساتھ شام گئے تو بحیرہ کے راہب نے جو کبھی اپنی خلوت سے باہر نہیں نکلتا تھا، اس قافلے کے استقبال کے لیے باہر نکل آیا اور قافلے کے افراد پر غائر نظر ڈالی اور ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر پہچان لیا، اور رفقائے سفر سے کہا کہ ان کا خیال رکھنا یہ سیّد العالمین ہیں جن کو اللہ تعالیٰ سارے عالم کے لیے رحمت بنا کر مبعوث فرمانے والا ہے۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ آپ کو یہ کس طرح معلوم ہوا؟ راہب نے کہا کہ میں نے جو علامتیں آنے والے نبی کی پڑھی ہیں ان میں سے تمام علامتیں اِنؐ میں پائی جاتی ہیں۔ آپؐ کے سر پر بادل کا ٹکڑا سایہ فگن ہے اور ان کی پُشت پر مہر نبوت ہے، راہب کی فرمائش پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پُشت مبارک دکھائی، راہب نے اس کو چوما، آنکھوں سے لگایا اور کہا یہی وہ ناموس ہے جس کی بشارت دی گئی۔ (اس روایت کے الفاظ میں کمی بیشی ہے خلاصۂ کلام ایک ہی ہے، سفر السعادۃ میں بہت تفصیل ہے، سیرۃ ابن ہشام میں الفاظ مختصر ہیں)۔

اَقْسَمْتُ بِالْقَمَرِ الْمُنْشَقِّ لَہٗ ‎ ‎ مِنْ قَلْبِہٖ نِسْبَۃٌ مَّبْرُوْرَۃُ الْقَسَمِ

میں قسم کھاتا ہوں چاند کے پیدا کرنے والے کی اس بات پر کہ آپؐ کا قلب مبارک اس چاند کے مشابہ ہے جو بطور معجزہ شق کیا گیا تھا۔ اور میری یہ قسم سچی قسم ہے۔

شارح قصیدہ شیخ ابراہیم باجوری نے لکھا ہے اور صحیح لکھا ہے کہ اَقْسَمْتُ بِالْقَمَرِ سے مراد اَقْسَمْتُ بِرَبِّ الْقَمَرِ ہے، یعنی چاند کی قسم نہیں بلکہ چاند کے رب کی قسم۔ (جار و مجرور کے درمیان اضافت محذوف ہے) کیوں کہ بندوں کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کی قسم کھائیں، البتہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے جس کی چاہے قسم کھائے، اس لیے جو بات قرآن کریم میں روا ہے والشمس وضحاھا، والسماء والطارق... الخ یہ سب قسمیں حق تعالیٰ جل شانہٗ کی جانب سے ہیں، مگر بندوں کو اس کی اجازت نہیں ہے، قسم اس بات پر کھائی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک کو چاند سے مشابہت ہے، چاند بھی آپؐ کی انگلیوں کے اشارے سے شق ہوا، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب مبارک بھی شق کیا، شق القمر کا معجزہ تمام صحاح سے تو ثابت ہی ہے، قرآن کریم میں بھی مذکور ہے۔

واقعہ یہ پیش آیا تھا کہ کفار قریش نے آپؐ سے اظہار معجزہ کی درخواست کی، آپؐ نے اپنی انگشت مبارک سے اشارہ فرمایا اور چاند کے صاف دو ٹکڑے ہو گئے، اس کا ایک ٹکڑا ایک پہاڑ پر گرا اور دوسرا اس کے نیچے،

کفار نے اس معجزہ کو تسلیم کرنے کے بجائے اس کو سحر بتایا اور سحرنا محمد، یعنی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمیں سحر کردیا یعنی آنکھوں کو نظر بند کردیا، لہذا دوسرے شہروں میں جاکر لوگوں سے پوچھنا چاہیے کہ آیا انھوں نے بھی چاند کے ٹکڑے ہوتے ہوئے دیکھا تھا، چنانچہ لوگوں میں اس کا چرچا ہوا اور دور دراز سے آنے والوں سے اور وہاں جاکر دریافت کیا گیا ہر ایک نے اس کی تصدیق کی، اس پر کفار نے کہا یہ "سحر مستمر" (ہمیشہ کا جادو) ہے۔

سورۂ قمر کی ابتدائی آیات میں ان کا ذکر ہے:

"اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ وَاِنْ يَّرَوْا آيَةً يُّعْرِضُوْا وَ يَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ"

"قیامت قریب آپہونچی اور چاند شق ہوگیا، اور (اگر) کافر کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ ایک ہمیشہ کا جادو ہے"

(ترجمہ مولانا فتح محمد خاں جالندھری)

حضرت بوصیریؒ اپنے اس شعر میں کہتے ہیں کہ اس شق ہوجانے والے چاند سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک کو نسبت۔ یعنی مشابہت ہے کیوں کہ آپؐ کا صدر مبارک بھی شق کیا گیا ہے، اور روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک بار نہیں بلکہ چار مرتبہ یہ واقعہ پیش آیا۔ ایک شاعر نے اس کو نظم بھی کیا ہے:

وشُقَّ صَدرُ المُصطفیٰ وَهُوَ فِیْ دارِ بنی سَعد بلا مِرْیَه

کشَقِّه وهو ابن عشرٍ و فی لیلة معراجٍ، و فی البعثه

(حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ مبارک (پہلی بار) اس وقت شق کیا گیا جب کہ آپ بنو سعد (حضرت حلیمہ سعدیہ کے قبیلہ) میں تھے جس میں کوئی شک ہی نہیں ہے، جس طرح اس کو (سینۂ مبارک) اس وقت شق کیا گیا جب آپؐ کی عمر دس سال تھی، پھر...

شب معراجؐ میں یہی عمل پیش آیا اور بعثت کے وقت آپ کا سینۂ مبارک چاک کیا گیا تھا)

الباجوریؒ لکھتے ہیں کہ ایک روایت پانچویں مرتبہ شق صدر کی ہے جو اس وقت پیش آیا تھا جب کہ آپؐ کی عمر شریف بیس سال کی تھی، مگر یہ روایت ثابت نہیں ہے، شاعر نے اس مضمون کو (کہ قلب مبارک بھی جو شق القمر کے مشابہ ہے) زور دے کر بیان کیا ہے کہ میری قسم وہ ہے جس کو مبرور بالکل سچ کہا جائے۔

وَمَا حَوَى الغَارُ مِن خَيرٍ وَّ مِن كَرَمٍ   وَمِن كُلِّ طَرفٍ مِنَ الكُفَّارِ عَمِي

اور غار (ثور) نے جس خیر و کرم کو اپنی آغوش میں لیا اور وہ جس سے تمام کفار کی نگاہیں کور ہو گئیں۔

اس شعر میں اس معجزہ کا ذکر ہے کہ جب ہجرت کے لیے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے رفیق غار حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ چلے ہیں تو مکہ کے قریب کے پہاڑ کی کھوہ (غار) میں پناہ لی ہے اور کفار قریش نے آپ کا تعاقب کیا اور اس غار تک پہونچ گئے تھے جس کے اندر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ موجود تھے مگر وہ آپ کو دیکھ نہ سکے، حالاں کہ روایات میں ہے کہ اگر وہ لوگ اپنے پاؤں کی طرف دیکھتے تو آپ کو پا لیتے مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی نگاہوں کو بے نور کر دیا۔

اس شعر میں خیر۔ کرم کے دو لفظ آئے ہیں، خیر کا لفظ بہت عام ہے مگر اس کے معانی بہت وسیع ہیں، اللہ کی ہر نعمت کو خیر کہتے ہیں، ہر خوبی کو خیر کے لفظ سے یاد کیا جاتا ہے، اور کرم کا لفظ عربی محاورے میں سخاوت کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس شعر میں "خیر" سے مراد خوبی ذاتی و صفاتی کے جامع بلکہ شہر خوبی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس مراد ہے، اور "کرم" سے اشارہ حضرت سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف ہے جنھوں نے اپنا سارا اندوختہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر لا کر ڈال دیا تھا۔ (طَرف) کے معنی نگاہ کے ہیں۔

فَالصِّدقُ فِی الغَارِ وَالصِّدِّیقُ لَم یَرِمَا   وَھُم یَقُولُونَ مَا بِالغَارِ مِن اَرِمِ

الصدق سے مراد ذو الصدق یعنی سراپا صداقت، مراد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم، اور الصدیق سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کا لقب ہے، (یہ لقب حضرت ابو بکرؓ کو اس وقت عطا ہوا جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسرار و معراج کا واقعہ ذکر کیا تو کفار نے تضحیک کے انداز میں اس کی تردید کی اور سب سے پہلے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر رسول اللہ (ص) یہ بات کہتے ہیں تو بالکل سچ ہے، کیوں کہ ہم اس سے زیادہ نادر اور انوکھی بات پر ایمان لا چکے ہیں کہ آپ پر وحی آسمان سے آتی ہے اور جبرئیلؑ خدمت عالی میں حاضر ہو کر اللہ تعالیٰ کا پیغام لاتے ہیں)۔ بہر حال اس شعر کا ترجمہ یہ ہے:

"سراپا صداقتؐ اور صدیق امتؓ غار سے جدا نہیں ہوئے، یعنی اسی میں موجود رہے اور کفار کہتے رہ گئے کہ غار میں کچھ نہیں رکھا ہے۔"

لفظ 'یرما' کی اصل یریمان ہے رام یریم رَیمًا : جدا ہونا، ٹلنا، جگہ چھوڑنا، نونِ تثنیہ تو لَمْ نافیہ کی وجہ سے حذف ہوا، اور یریما کی 'ی' ضرورت شعری کی وجہ سے۔ اِرَم پہاڑ کے دہانے پر بطور علامت کے رکھے ہوئے پتھر کو بھی کہتے ہیں اور حاجت و ضرورت ستعمل تیر چڑ

ظَنُّوا الحَمَامَ وَظَنُّوا العَنكَبُوتَ علىٰ   خَيرِ البَرِيَّةِ لَمْ تَنْسِجْ وَلَمْ تَحُمِ

کفار کو گمان ہوا خیر البریۃ صلی اللہ علیہ وسلم پر (یعنی جس غار میں آپ تھے اس کے دہانے پر) کبوتری ہے یا مکڑی نے جالا تن دیا ہے حالاں کہ نہ تو کبوتری تھی اور مکڑی کا جالا۔

قاعدہ یہ ہے کہ انسان کو دیکھتے ہی کبوتر اُڑ جاتے ہیں، اور جب کوئی کمزور سے کمزور آدمی بھی ایسی جگہ داخل ہوگا جہاں مکڑی کا جالا ہے تو وہ ٹوٹ جائے گا، لہٰذا کہیں پر کبوتر کو اڑتا چکر لگاتا دیکھا جائے یا مکڑی کا جالا دیکھا جائے تو بھی یقین آتا کہ یہاں کوئی نہیں ہے، مگر اللہ تعالیٰ کا یہ انتظام تھا کہ کفار کو ایسا ہی نظر آیا۔

(عربی داں حضرات کے لیے : لم تنسج / لم تحم متعلق بخیر البریۃ، لف ونشر مشوش (غیر مرتب) الحمام ۔ لم تحم ۔ العنکبوت : لم تنسج ۔ لم تنسج سے پہلے واؤ حالیہ محذوف مانا جائے گا)۔

وِقَايَةُ اللهِ أَغْنَتْ عَنْ مُضَاعَفَةٍ   مِنَ الدُّرُوعِ وَعَنْ عَالٍ مِنَ الأُطُمِ

اللہ کی حفاظت نے دوہری زرہ پہننے (یا زرہ کے آہنی کڑوں کو دوہرا کرنے) سے بے نیاز رکھا، اور اس بات سے بے نیاز رکھا کہ بلند پہاڑیوں کی چوٹیوں پر جا کر پناہ لیں۔

شعر کا مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نصرت ہر حال میں شریک تھی، اور آپ کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے براہِ راست اپنے ہاتھوں میں رکھی تھی، اس لیے آپ کو اپنی ذات کے لیے حفاظتی تدبیر میں اہتمام و غلو کی ضرورت نہ تھی، نہ تو اس کی ضرورت تھی کہ دوہری زرہ پہنیں یا آہنی خود لگائیں، یا زرہ کی کڑیوں کو دوہرا کریں، بلکہ معمولی سا ظاہری انتظام فرمالیا کرتے تھے جو بشریت کا تقاضہ تھا۔

یہ شعر اس حقیقت کا اظہار ہے کہ 'حفاظت' دراصل اللہ ہی کی حفاظت ہے، ورنہ ظاہری تدبیریں جس قدر بھی کی جائیں سب بیکار ثابت ہوتی ہیں، ابھی گنتی کے چند برسوں میں دیکھیے کہ کتنے

ملکوں کے سربراہوں کو قتل کیا گیا، جب کہ ان کی حفاظت پر لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں کے حساب سے دولت صرف کی جاتی رہی ہے۔ مہینوں سے انٹیلجنس ایک ایک سڑک اور ایک ایک موڑ کا جائزہ لیتے رہتے ہیں جہاں سے کوئی سربراہِ حکومت گزرنے والا ہوتا ہے، فضا سے ہیلی کاپٹر پہرہ دیتے رہتے ہیں، ہر ہر عمارت کا جائزہ لیا جاتا ہے جو اس راستے کے قریب واقع ہے جہاں سے "موکب ہمایونی" گزرنے والا ہے۔ ملک کی وزارت داخلہ توجہ کا مرکز رہتی ہی ہے، بیرونی ممالک کے ماہرین سے حفاظتی تدابیر میں مدد لی جاتی ہے۔ پھر بھی کیا ترقی یافتہ اور کیا غیر ترقی یافتہ دونوں قسم کے ممالک میں برسرِاقتدار بلکہ کہنا چاہیے سفید سیاہ کے مالک اشخاص قتل کیے جاتے ہیں۔ مثالیں جب چاہیے انگلیوں پر گن لیجیے، اس کے مقابلہ میں دیکھیے بلکہ ایسے دور میں جب سراغرسانی کا فن ایجاد نہیں ہوا تھا، حفاظتی دستے اور سراغرساں تو الگ رہے معمولی پہرہ دار کا بھی تصور نہیں، اور دشمن پورا قبیلہ، علاقہ اور شہر کا شہر، مگر خدائی نگہداشت اور حفاظت کا یہ عالم کہ دشمنوں کے بیچ سے ایسا نکلتا ہے جیسے گندھے ہوئے آٹے سے کوئی بال نکال لے، جس بات کو سمجھنے سے عقل عاجز رہے اسی کو معجزہ کہتے ہیں۔

قلندراں کہ بہ تسخیر آب و گل کوشند
زشاہ باج ستانند و خرقہ می پوشند

بجلوت اند و کمندے بمہر و مہ پیچند
بخلوت اند و زمان و مکاں در آغوشند

بروز بزم سراپا چو پرنیان و حریر
بروزِ رزم خود آگاہ و تن فراموشند

نظامِ تازہ بچرخِ دو رنگ می بخشند
ستارہ ہائے کہن را جنازہ بر دوشند

(اقبالؒ)

مولانا عبید اللہ کوثی ندوی
رفیق دار المصنفین، اعظم گڑھ

تنقیدی ادب کے اسلامی اقدار

(۲)

تنقید ادب کے سلسلہ میں اس وقت تک جو تفصیلات دی گئی ہیں ان سے ادب کے بارے میں اسلام کے آفاقی نقطۂ نظر کی وضاحت ہوتی ہے کہ نظر الفاظ کی طرف کم اور معانی کی طرف زیادہ رہے، جسم سے زیادہ روح قابل اعتنا ہے لہذا اسلامی ادب میں کہیں سے بھی کسی رنگ و نسل، یا کسی خاص مذہب و تہذیب یا محدود جغرافیہ اور ماحول کا پر تو نظر نہیں آتا، ان کی روشنی میں ہر جگہ اور ہر دور کی ادبی کاوشوں کے معیار کی قدر و قیمت اور حسن و قبح کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر کی یہی آفاقیت تھی جس کی وجہ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دورِ جاہلیت کے بہت سے شعراء کا کلام سُنا اور پسند فرمایا، اس سلسلہ میں آپ نے قدیم جاہلی شعراء عنترہ، امرء القیس، اعشیٰ، زہیر بن ابی سُلمیٰ، طرفۃ العبد کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار فرمایا۔ عمرو بن الشرید سے امیہ بن ابی الصلت کے اشعار سنانے کی فرمائش کی اور انھوں نے اس کے سو سے زیادہ اشعار سنائے۔ ایک موقع پر عمرو بن سلم خزاعی نے ایک جاہلی شاعر سوید بن عامر کے اشعار گوش گزار کیے، حضرت حسان بن ثابتؓ سے آپؐ نے دورِ جاہلیت کا ایک قصیدہ سنانے کی فرمائش کی اور دورِ جاہلیت کے سرمایۂ شعر کی نقل و روایت کی اجازت کا اعلان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ: "یاحسان انشد نی قصیدۃ من شعر الجاھلیۃ فان اللہ قد وضع عنا آثامھا فی روایتھا وشعرھا۔" (دلائل الاعجاز) یعنی "اے حسان! جاہلی زمانہ کا کوئی قصیدہ سناؤ، اللہ نے ان قصیدوں میں جو گناہ کی باتیں ہیں ان کی ذمہ داری سے تمھیں سبکدوش فرمایا ہے۔"

واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہی طرز عمل ادب جاہلی کے تحفظ کا سبب بنا۔ ادب جاہلی کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طرزِ عمل، اسلام کے ادبی نقطۂ نظر کی وسعت، اس کی بے تعصبی،

اور اس کی آفاقیت کی دلیل ہے۔

اس مضمون کے آغاز میں یہ بات بھی کہی گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "اصناف ادب وغیرہ امور میں فکر وخیال کو پوری آزادی دی ہے کوئی بندش نہیں لگائی" یہ بات بھی اسلام کے آفاقی نقطۂ نظر کی نشان دہی کرتی ہے۔ ادب کا قافلہ فکر کی مدد سے آگے بڑھتا ہے۔ ادب کی اصناف میں نئے نئے اضافے ہوتے چلے جاتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ادب کی کسی ایک ہی صنف کو اپنی پسندیدگی کی سند نہیں دی، بلکہ جو صنف بھی آپ کے سامنے پیش ہوئی اس کو آپ نے کسی خاص صنف میں ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ ادب کی مطلق قدروں کی روشنی میں سنا، پرکھا، قبول کیا یا ناپسند فرمایا۔

آپ کے سامنے قصیدہ کی مختلف بحریں جن میں مدح و مراثی کے علاوہ رزمیہ اشعار بھی تھے نیز قرآن و حدیث نبوی کی شعروں میں تشریح و ترجمانی اور حکمت و دانش پر مشتمل اشعار پڑھے گئے۔ آپ نے کہیں تعریف فرمائی، کسی کی تحسین کی، کسی کو ناپسند فرمایا، اور کہیں لفظی اور کہیں معنوی اصلاح بھی فرمائی مگر ادبی اصناف میں محض کسی خاص صنف ہونے کی پر، کسی پر بھی کوئی بندش عائد نہیں کی، ذوق وخیال کو اس بارہ میں پوری طرح آزاد رہنے دیا گیا۔

انسان کے اعلیٰ اوصاف، فیاضی، حوصلہ مندی، بہادری اور دین اور انسانیت کی راہ میں بے غرض خدمت اور قربانی کی قدر، اسلام سے بڑھ کر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہتر، کون کر سکتا ہے۔ آپ نے تو انسانیت کے ضمیر اور خمیر میں یہی اوصاف پیدا کرنے کے لیے ساری جدوجہد کی تھی، چنانچہ یہ صفات آپ کو جہاں کہیں نظر آئیں آپ نے ان کی حوصلہ افزائی فرمائی، اور شعر وسخن کو بھی اس کے لیے مہمیز دی، طلحہ بن عبید اللہ نے ایک غزوہ (احد) میں بہادری کے جوہر دکھائے تو آپ نے ان کی حوصلہ افزائی اور جوہر شجاعت کی قدر دانی کے لیے ان کی تعریف میں قصیدہ لکھنے کا حکم دیا اور کئی صحابہ نے اس ارشاد کی تعمیل میں قصیدے کہے۔ کعب بن زہیر نے نعتیہ اشعار کہے تو انھوں نے ایک خاص وجہ سے اپنے اشعار میں انصار مدینہ کو نظر انداز کر دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو انصار کی مدح میں بھی اشعار کہنے کی ترغیب دی۔

ادب کی بارگاہ میں بڑی بے ادبی ہوگی اگر میں اپنے اس مضمون کے آخر میں ادب عالیہ کا ذکر نہ کروں۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ ادب کی صنف شاعری میں جولانیٔ طبع کے مواقع زیادہ ہیں، لیکن نثر کے مقابلہ میں شعر و سخن کا سے دارو، اس میں زیادہ آگاہی اور احتیاط چاہیے ورنہ معانی کے نزول کے بجائے شاعر کی اپنی ہستی ذہول کا شکار ہوجاتی اور پستی اور رُسوائی سے دوچار ہوکر رہتی ہے، مگر قرآن نے جو نسخۂ کیمیا دیا ہے اس نے شاعری جیسی صنف نازک کے لیے بلندی اور عظمت کی شاہراہ کھول دی ہے۔

قرآن نے یہ بتایا ہے کہ یقین و عمل اور روح جہاد ضمیر شاعر میں پنہاں اور موجزن ہوں تو یہ شاعری بھی قوموں کی زندگی میں حیات جاودانی کی روح پھونک دیتی ہے اور پھر وہ ادب عالیہ کا حصّہ بن جاتی ہے۔ یہی سہ گانہ نسخۂ کیمیا اثر ادب کی ہر ایک صنف کے لیے ہمیشہ سے زود اثر، اور صحت بخش ثابت ہوا ہے۔ پھر انسانی تاریخ کے قدیم ترین زمانوں میں بھی وہی ادب شاہکار قرار پایا ہے جس میں عقیدہ کی کارفرمائی رہی ہو اور جس میں شعور و احساس اور محبت و وارفتگی کے تمام جذبات کسی ایک مرکز یا شخصیت کے ارد گرد متلاطم ہوگئے ہوں، اسلام کی نگاہ میں، یہ مرکز ہمیشہ سے خدا کی ذات، اور اس کے بھیجے ہوئے نبیوں اور رسولوں کی شخصیت رہی ہے اس لیے اب خدا کی ہستی اور ذاتِ نبوی ہی اسلام کی نگاہ میں احساسات اور جذبات کی آماجگاہ اور عشق و محبت کا نقطۂ ارتکاز ہیں، ان کی محبت اور رحمتوں سے سرشار دل اور بے قرار روح جب فکر و خیال کو مہمیز دیتی ہے تو شعر و ادب کی زلفیں سنور جاتی ہیں۔

ادب کی تاریخ کے طالب علم کے لیے ادب کی اقبال مندیوں اور کامرانیوں کی یہ داستان نئی نہیں بازدیدہ اور بارہا کی شنیدہ ہے، اس موقع پر میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ، کی ایک عبارت نقل کروں گا، جس میں ادب کے لیے حیاتِ نو اور ادیبوں کے لیے جہانِ تازہ کی نوید ہے۔ مگر یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ جانِ ادب کیا ہے اور ادیب کس طرح اور کیوں کر ادیب بن سکتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ:

"میں ادب کو ایک زندہ وجود سمجھتا ہوں جس کے پہلو میں درد بھرا دل، باشعور ضمیر، زندہ احساس، پختہ عقیدہ اور اس کا ایک واضح و متین نصب العین

ہوتا ہے، رنج و الم سے وہ رنجور اور اسبابِ مسرت سے وہ مسرور ہوتا ہے اور اگر ادب ایسا نہیں تو وہ جامد اور بے جان ادب ہے جو مداری کے نقل و تماشہ اور جمناسٹک کی ورزشوں سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔

آپ مجھے اجازت دیں کہ آپ کے سامنے اقبال کے وہ اشعار پڑھوں جن سے اس عظیم شاعر کے عقیدہ اور اس کے ادبی نظریہ کی وضاحت ہوتی ہے جس پر اقبال کا پورا شعری و فکری دبستان قائم ہے۔ اقبال کا یہ عقیدہ ہے کہ ادب میں اس وقت تک جان نہیں پڑتی جب تک کہ وہ اپنی زندگی اور توانائی دھڑکتے دل کی گہرائیوں سے نہیں حاصل کرتا اور خونِ جگر سے سیراب نہیں ہوتا، وہ ایک شعر میں اس وسیع مضمون کو ادا کر دیتے ہیں:

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

وہ فرماتے ہیں کہ:

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا"

(اقتباس از "شعر و ادب کو نیا رخ دینے میں اقبال کا کردار")

تعارف و تبصرہ

شبلیؒ، معاندانہ تنقید کی روشنی میں

سید شہاب الدین دسنوی
شائع کردہ: انجمن ترقی اردو (ہند)
صفحات: ۱۴۷ کاغذ چکنا جلد مع گرد پوش
قیمت: پچیس روپے
ملنے کا پتہ: دار المصنفین اعظم گڑھ (۲) انجمن ترقی اردو دہلی

علامہ شبلی نعمانی کی مشہور رباعی جو ان کی قبر کا کتبہ بھی ہے[۱]:

عجم کی مدح کی، عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

مولانا شبلیؒ نے عجم کی مدح ضرور کی، مگر عجمیوں سے ان کا مقصد غیر عرب تھے، غیر مسلم نہیں تھے،

---

[۱] اس کی کتبہ کی تاریخ یہ ہے کہ مولانا سید ابو الحسن علی الحسنی مدظلہٗ ایک مرتبہ اعظم گڑھ گئے ہوئے تھے، مرحوم مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے کہا کہ یہاں کئی قبریں ہیں، ان میں ایک قبر مولانا شبلی نعمانی کی ہے، لوگ دریافت کرتے ہیں کہ مولانا کی قبر کون سی ہے اس لیے کتبہ لگانے کا خیال ہوتا ہے مگر اس پر کیا لکھا جائے؟ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ نے کہا وہ اپنا کتبۂ مزار تو خود لکھ چکے تھے۔ ان دو شعروں سے بڑھ کر کیا موزوں کتبہ ہو سکتا ہے؟

انھوں نے اُن صنادید اسلام کی مدح کی جن سے اسلام اور مسلمانوں کی آبرو قائم تھی، حضرت امام ابوحنیفہؒ کی مدح عین اسلام کی مدح تھی، شعرالعجم بھی لکھی تو اس کی ابتدا اس کے مقصد تالیف اور انتہا کو ظاہر کرتی ہے،

"اسلام ایک ابرِ کرم تھا اور سطح خاک کے ایک ایک چپہ پر برسا لیکن فیض بقدر استعداد پہنچا، جس خاک میں جس قدر زیادہ قابلیت تھی اسی قدر زیادہ فیضیاب ہوئی، عرب، ایران، ہند، ترکستان، تاتار، مصر، شام، روم سب اس کے حلقہ میں آئے لیکن قبول اثر میں سب یکساں نہ تھے، فرق مراتب تھا، اور فرق مراتب کی حیثیتیں بھی مختلف تھیں، جس قوم میں جس قسم کی قابلیت تھی اسلام نے اس کو اور چمکایا، ترک شجاع تھے شجاع تر ہو گئے، ایرانی ہمیشہ سے تہذیب، معاشرت اور علوم و فنون میں ممتاز تھے اسلام نے ان کو ممتاز تر کر دیا۔"

مولانا شبلی نے محض تواضع اور انکساری میں اپنے آپ کو "چندے مقیم آستان غیر" لکھا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ کبھی بھی آستانۂ اسلام سے جدا نہیں ہوئے، سیرت کا کام شروع کرنے سے پہلے سیرت "الفاروق" لکھ کر مولانا شبلی نے وہ کارنامہ انجام دیا ہے جس نے ہزاروں مشکوک دل و دماغ کو اسلام کے صحیح سرچشمہ سے روشناس کیا اور آج تک اس معیار کی کتاب سامنے نہیں آئی ہے، اگرچہ سیکڑوں کتابیں اس موضوع پر لکھی جا چکیں، اور جہاں تک خاتمہ بالخیر ہونے کا تعلق ہے اس کی شہادت دینے والے ثقہ ترین افراد امت ہیں، جنھوں نے مولانا کی آخری وصیت سُنی ہے کہ وہ اپنے انتقال سے ذرا پہلے جب کہ گویائی جواب دے رہی تھی اپنے عزیز ترین اور قابل صد فخر شاگرد رشید مولانا سید سلیمان ندویؒ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہہ رہے تھے کہ "سیرت، سیرت سب کام چھوڑ کر سیرت"۔

وہ مردِ خدا جس کا دل اسلام کے درد سے بھرا تھا جس کے سر میں اسلام کی عظمت کے علاوہ کوئی سودا نہ تھا، جس کا ادب، جس کا قلم اور جس کی شاعری اسلام کے لیے وقف تھی، اس کے چہرہ پر چند شہرت کے طالع آزما اپنی بدطینتی کا عکس ڈالنے کو ادب کی خدمت سمجھنے لگے، اور مغرب کی تقلید میں سیرت نگاری کا کمال یہ سمجھ بیٹھے کہ کسی کے اعمال و کردار، پاکیزہ اعمال اور نورانی چہرہ، عمامہ و عبا کے بیان سے حلیہ مکمل نہیں ہو سکتا، جب تک کہ حمام میں جھانک کر بدبینی کے خوردبین سے تصویر نہ لی جائے، ایک واقعہ ان کی زندگی کے آئینہ شفاف میں غبار کی حیثیت سے زیادہ قابل ذکر نہ تھا کہ بمبئی کے فیضی خاندان سے ان کا ادبی اور اخلاقی تعلق تھا، جہاں ایک "سیرو شکار" قسم کی خاتون نے ادبی انداز کی خط و کتابت کی، ایک نیم پارسی اور نیم مسلم

خاندان کی عورت اردو لکھنے میں مشق بڑھاتی ہے۔ اس کے خطوط مولانا اپنی صاحبزادی اور خاندان کے دوسرے افراد کو دکھاتے ہیں، اور اس کو ادبی ذوق سے آگاہ کرنے میں دو چار فقرے ایسے نکل جاتے ہیں جو عالمانہ شان سے فروتر تھے، لیکن اگر شرافت و اخلاق کوئی چیز ہے تو انصاف کی عدالت میں ایک پاکباز اور پاکدامن شخصیت پر ناروا حملہ کرنے کی گنجائش نہیں نکلتی، لیکن ادبی سنسنی خیزی کے ذوق نے رائی کا پہاڑ بنا دیا، اللہ بخشے مولانا حامد حسن قادری کو جنھوں نے داستان اردو میں مولانا کی مظلومیت کا اظہار کیا، اور یہ بتایا کہ وہ خطوط ایک شاعرانہ طبیعت کا رُخ تھا اُس کو طومار بنا کر افسانہ بنانا کسی طرح روا نہیں، مگر داستان بن چکی تھی، ان کے حریف اور علم و دانش کے حاسد گروہ کے لیے جو اونٹ نگل جانے میں پرواہ نہیں کرتے ان کو حالت احرام میں مچھر مارنے پر فتویٰ دینے کا بہانہ ہاتھ لگ گیا، مولانا سید سلیمان ندویؒ پر یہ الزام لگایا کہ انھوں نے اس واقعہ کو ذکر کر کے شبلی کی سیرت کو رنگین کیوں نہیں کیا، ایک دوسرے حلقہ کو شکایت رہی کہ مولانا سید سلیمان ندوی نے مولانا کو طبقۂ علماء کا ایک گل سرسبد کیوں ثابت کیا، اور حیات شبلی میں ایک نابکار کہانی کا ذکر کر کے اس کو داغدار کیوں نہ کیا۔

سید صاحب کے بعد ان کے ایک لائق شاگرد مرحوم سید صباح الدین صاحب نے بھی شبلی کی عظمت رائد سرِ نو تازہ کرنے کے لیے ایک کتاب "شبلی، تالیفات کی روشنی میں" لکھی جو ان کی طبعی شرافت اور علمی وراثت کا تقاضہ تھا۔

مولانا شبلی کے وطن اور برادری سے دور کا بھی تعلق نہ رکھنے والے سید شہاب الدین صاحب دسنوی ہیں جنھوں نے علامہ کے رُخ روشن سے اغیار کے ڈالے ہوئے غبار کو تاریخی جائزہ کی شکل میں دور کیا ہے، اس کتاب میں اس نابکار کہانی کا ہر رُخ سے جائزہ لیا گیا ہے، وہ اپنی کاوش میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں پروفیسر خلیق انجم صاحب کی اس تحریر سے ظاہر ہوتا ہے، وہ لکھتے ہیں،

> "مجھے اس کا اعتراف ہے کہ اپنے محترم سید شہاب الدین صاحب کی اس کتاب کا مسودہ پڑھنے سے پہلے میرے ذہن میں شبلی کی وہی تصویر تھی جو شیخ اکرام اور وحید قریشی نے پیش کی تھی۔ دسنوی صاحب کی دلیلوں نے مجھے اپنی رائے بدلنے پر مجبور کر دیا۔ شبلی کی حمایت میں یہ پہلی معقول و مکمل کتاب ہے، اس لیے مجھے یقین ہے کہ اب شبلی جیسے مظلوم انسان کے ساتھ انصاف ہو سکے گا۔"

یہ اعتراف اس لیے وقیع ہے کہ شیخ اکرام اور قریشی صاحب کے سنسنی خیز انکشافات سے علامہ شبلی کی تصویر پر جو سیاہی ڈالنے کی کوشش کی تھی، اس سے متاثر ہونے والے نے یہ کتاب پڑھ کر اپنی رائے بدل دی۔

سید شہاب الدین کی یہ پہلی کتاب نہیں ہے اس سے پہلے انھوں نے محمد علی جناح کی سوانح حسین انداز میں لکھی، ارسٹائن کی کہانی، کیمیا کی کہانی اور اردو کی نصابی کتابیں اچھی صاف ستھری اردو میں لکھ چکے تھے۔

ان کو ہندوستان اور ہندوستان کے باہر کی یونیورسٹیوں سے علمی سندیں حاصل ہیں، حکومت ہند کا ایوارڈ بھی پاچکے ہیں اور اپنی زندگی کا بہترین حصہ انجمن اسلام بمبئی کی خدمت و ترقی میں صرف کر چکے ہیں، اور اب رضاکارانہ طور پر دارالمصنفین کے انتظامیہ کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ ان کی پیش نظر کتاب یوں تو مولانا شبلی کے دفاع میں ہے مگر شبلی کا دفاع دراصل ایک عظیم سیرت نگار نبوی کا دفاع ہے، اور اس کا باعث حبّ نبویؐ اور دینی شغف ہے، جو مصنّف کی ادبی خدمات کا اگر ایک اعلیٰ نمونہ ہے تو دوسری طرف ان کے لیے اجر و ثواب کا باعث اور مغفرت کا وسیلہ بھی ہوگا، (ان شاء اللہ العزیز)۔

(ععن)

اطبّاء اور ان کی مسیحائی:

تالیف: حکیم محمد مختار اصلاحی

صفحات: ۳۱۲ کاغذ نفیس، مجلد مع گرد پوش

قیمت: پچاس روپے

ملنے کا پتہ: اصلاحی دواخانہ، فینسی محل، محمد علی روڈ، بمبئی ۴۰۰۰۰۳

مولانا حکیم محمد مختار اصلاحی، مدرسۃ الاصلاح کے فارغ شدہ عالم اور مستند و قدیم تجربہ کار حکیم ہیں، بمبئی میں ان کے متعدد مطب اور دواخانے ہیں، اور وہاں کے مشہور و مقبول طبیب ہیں، زیر نظر کتاب میں

انھوں نے اپنے پیش رو اطبا سے لے کر معاصرین تک کے مختصر حالات اور ان کی مسیحائیوں کے کرشمے دکھلائے ہیں، اور اس فہرست میں لکھنؤ کے خاندان عزیزی اور دہلی کے خاندان مجیدی دونوں کی خصوصیات' کمالات اور فن طب پر دسترس کو نمایاں کیا ہے، حکیم صاحب نے وسعت قلبی کے ساتھ ہر ایک کا تذکرہ عقیدت مندانہ انداز میں کیا ہے، کسی سے پیشہ ورانہ رقابت کی بُو نہیں محسوس ہوتی۔ آلات اور مشینوں کی ایجاد سے پہلے بھی خالق کائنات نے ایسے افراد پیدا کر دیے تھے جن کی انگلیاں مریض کی نبض دیکھ کر مرض کی تہہ تک پہونچ جاتی تھیں، کوئی مفرد دواؤں سے علاج کرتا کوئی مرکبات سے، لیکن سب ہی باکمال تھے۔ حکیم صاحب نے یہ مفید کام کیا ہے جس سے موجودہ اور آئندہ نسلوں کو معلوم ہوگا کہ ان کے آبا کیا تھے۔؟ اور فن سے ان کا کیا خلوص تھا

اس کتاب کا ایک کامیاب پہلو تو یہی ہے جو کتاب کے نام سے ظاہر ہے۔ اس میں بقراط وسقراط، جالینوس، ابن سینا سے لے کر حکیم محمد شریف خان، حکیم محمود خاں، حکیم عبدالمجید خاں۔ مسیح الملک اور حکیم محمد احمد خاں تک کے اکثر اطبا کا حال اور ان کی مسیحائی کے کمالات مذکور ہیں۔ دوسری طرف حکیم عبدالعزیز، حکیم عبدالرشید، حکیم عبدالحمید لکھنوی، حکیم مولانا عبدالحی الحسنی، اور صدر الاطبا حکیم محمد الیاس کے نام و کام کا ذکر ہے، مؤلف اپنے معاصرین میں حکیم خواجہ شمس الدین صاحب مرحوم، حکیم حاجی عبدالحمید اور حکیم حافظ محمد سعید (متولیان وقف ہمدرد) کا تذکرہ بھی پورے احترام اور قدر دانی سے کرتے ہیں۔

اس کتاب کا ایک پہلو ادبی بھی ہے، حکیم اصلاحی صرف طبیب ہی نہیں اردو کے ادیب بھی ہیں، زبان صاف دُھلی ہوئی اور تصنّع سے پاک لکھتے ہیں۔ اطبّا اور فقہا کے یہاں ضرورت کے ماتحت کوئی بات پوشیدہ یا کنایہ میں نہیں کہی جاتی کیوں کہ ضرورت کا تقاضہ یہی ہے، مگر حکیم صاحب اس باب میں بہت پُر لطف اور ادبی انداز کے کنایوں سے کام لیتے ہیں جو الکنایۃ ابلغ من التصریح کا مصداق ہے، اس کے علاوہ ان کو وصفی انشائیہ میں کمال معلوم ہوتا ہے۔

لکھنؤ کے ایک حکیم صاحب اور ان کے نوابی ٹھاٹ کے مطب کا ذکر ایسا کیا ہے جیسے مصور عہد قدیم کے شاہی دربار کا نقشہ پیش کر رہا ہو۔

زبان و ادب کی رعایت کا اندازہ ذیل کی چند سطروں سے ہوگا، دہلی کے ایک باکمال حکیم میر محمد مرتعش کے حال میں لکھتے ہیں:

"پروردگار کا نظام تلافی بھی خوب ہے، کسی کمی اور معذوری کا بدل اتنے اچھے طریقے سے مہیا کر دیا جاتا ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے مشہور معالج حکیم عبدالوہاب انصاری نابینا تھے اور حکیم نابینا ہی کے نام سے شہرت پائی لیکن اسرار شریانیہ اور نبض شناسی سے ان کو جو آگاہی تھی وہ آنکھ والے بڑے بڑے حکیموں کو بھی حاصل نہ تھی، "حکیم لولے" کے دونوں ہاتھ غائب تھے لیکن ان کے دستِ شفا کی ہر طرف دھوم تھی، میر صاحب بھی رعشہ کی وجہ سے نبض پر صحیح ڈھنگ سے ہاتھ نہیں رہ سکتے تھے لیکن ان کی مقبولیت و شہرت کی اصل وجہ ان کی نباضی ہی تھی۔"

اطبائے کرام کے لیے یہ کتاب تو نسخۂ بے بہا ہے، اس میں سیکڑوں نسخے ان کے کام کے لیں گے، گویا ایک بیاض ہی ہاتھ آجائے گی۔ امید ہے کہ حکیم محمد مختار اصلاحی کی یہ کتاب ان کے کارناموں کی نمائندہ ثابت ہوگی۔

کتاب کے آخر میں اگر انڈکس ہوتا تو اس کا فائدہ بڑھ جاتا، گرد پوش پر قدیم ہاون دستہ کے ساتھ جدید آلات کے نقشے شاید اس لیے دیے گئے ہیں کہ یہ دیکھا جائے کہ ہاون دستے کے عہد میں جو مسیحائی ہوتی تھی اس کا اندازہ تھرما میٹر اور سرنج کے عہد کے لوگ لگا سکیں۔

(ع ۔ ن)

ترتیب: شفیق الرحمٰن ندوی

عالمِ اسلام کی

علمی و ثقافتی سرگرمیاں

سعودی اخبارات کے بموجب خادم الحرمین الشریفین شاہ فہد بن عبد العزیز نے ایک شاہی فرمان کے ذریعہ اعلان کیا ہے کہ جو قیدی قرآن مجید حفظ کرلیں گے ان کی سزا کی مدت میں تخفیف کرکے نصف کردی جائے گی، انھوں نے تمام ذمہ دار افسران کو ہدایت کی ہے کہ اس کا نفاذ شروع کر دیا جائے۔ اس اعلان کا بجاطور سے ملک کے اندر اور باہر خیر مقدم کیا گیا ہے۔ رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر عبد اللہ عمر نصیف نے تار کے ذریعہ مبارکباد دی ہے، بیرون ملک سے بھی اس نوع کے پیغامات آئے ہیں، یہ فیصلہ خادم الحرمین الشریفین کے شایانِ شان ہے اور اس بات کا غماز ہے کہ ان کے دل میں قرآن مجید کی بڑی عظمت ہے اور وہ زیادہ سے زیادہ قرآن اور اس کی تعلیمات کو فروغ دینے کا جذبہ رکھتے ہیں، چنانچہ اس مقصد کے لیے انھوں نے ایک خاص پریس قائم کردیا ہے جو ان ہی کے نام سے موسوم بھی ہے جہاں سے قرآن مجید کے لاکھوں نسخے طبع ہو کر ملک اور بیرونِ ملک پھیل چکے ہیں۔

حالیہ فیصلہ کا ایک مفید پہلو یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعہ قیدیوں کی ذہنی و فکری تربیت ہوگی کیونکہ جب قیدی قرآن مجید حفظ کریں گے تو اس کے معانی و مطالب سے بھی کسی قدر واقف ہوں گے کیونکہ ان کی ایک بڑی تعداد عربی داں ہوگی بلکہ ان کی مادری زبان عربی ہوگی، قرآن کریم کی دل آویزی ضرور ان کو متاثر کرے گی لہٰذا جب وہ جیلوں سے باہر ہوں گے تو اپنی ذات، اپنے خاندان بلکہ پورے معاشرے کے لیے مفید بن کر نکلیں گے، اس طرح جیل خانے اصلاح خانے بن جائیں گے۔

قرآن مجید سے شغف اور اس کی خدمت کی خواہش کا ایک مظہر حفظ، قرات اور تفسیر کا وہ عالمی

مقابلہ بھی ہے، جو سعودی وزارت اوقاف و حج کے زیر نگرانی گزشتہ نو برسوں سے ہو رہا ہے اور جس میں مختلف ممالک کے قراء اور حفاظ شریک ہوتے ہیں اور کامیاب حضرات گرانقدر انعامات سے نوازے جاتے ہیں، اس سال بھی اس کا دسواں عالمی مقابلہ مکہ مکرمہ کے انٹر کانٹی نینٹل کے تضامن اسلامی ہال میں ہوا۔ جس کا آغاز ۴ جمادی الثانی کو اور اختتام ۱۵ جمادی الثانی کو ہوا۔ افتتاح شاہ فہد کی نیابت میں مکہ مکرمہ کے نائب امیر شہزادہ سعود بن عبد المحسن بن عبد العزیز نے کیا، اس مقابلہ میں ۳۵ ممالک کے ۴۵ اسلامی اداروں اور تنظیموں کے نمائندے شریک ہوئے، شرکار کی مجموعی تعداد ۷۵ تھی حکم کے فرائض انجام دینے کے لیے باضابطہ ایک کمیٹی تشکیل دی گئی، جس میں سعودی عرب کے علاوہ دوسرے ممالک کے ماہرین بھی شریک تھے۔ ان میں مراکش کے شیخ عبد الغفور الناصر، مصر کے شیخ محمود امین طنطاوی، ملیشیا کے شیخ صلاح الدین عمر اسحاق اور ہندوستان کے مولانا محبوب الرحمٰن صاحب ازہری جنھوں نے دار العلوم ندوۃ العلماء کی نمائندگی کی خاص طور سے قابل ذکر ہیں، مقابلہ پانچ گروپوں پر منقسم تھا۔

● پہلے گروپ میں مکمل حفظ مع تجوید کے علاوہ ساتویں پارے کی تفسیر شامل تھی، اس میں شرکار کی تعداد چودہ تھی۔ پہلی پوزیشن سعودی عرب کے عبد اللہ حواس محمد الحواس نے حاصل کی اور ان کو ۷۵ ہزار ریال کا انعام ملا۔ دوسری پوزیشن مصر کے مصطفےٰ محمد محمود حسین کو ملی اور ۷۲ ہزار کا انعام حاصل کیا، تیسری پوزیشن چاڈ کے محمد صالح احمد کو ملی اور ۶۹ ہزار ریال کے مستحق قرار پائے۔ چوتھی پوزیشن شام کے احمد تیب صبحی نے حاصل کی اور ۶۶ ہزار ریال انعام پائے۔

● دوسرے گروپ میں مکمل حفظ قرآن اور تجوید تھی۔ اس گروپ میں حصہ لینے والوں کی تعداد ۷ ۴ تھی۔ پہلی پوزیشن ایک مصری حافظ نے حاصل کی اور ۵۵ ہزار ریال پائے۔ دوسری پوزیشن نائیجریا کے حافظ نے حاصل کی جب کہ تیسری لیبیا کے حافظ کو ملی اور چوتھی پوزیشن سعودی عرب کے حافظ نے حاصل کی۔ انعامات بالترتیب ۵۵، ۵۲، ۴۹، اور ۴۶ ہزار کے تھے۔

● تیسرے گروپ میں بیس پارے حفظ مع تجوید تھے، اس میں شرکار کی تعداد ۲۸ تھی۔ پہلی پوزیشن مصر کے حافظ نے حاصل کی، دوسری پوزیشن ایک پاکستانی حافظ کو ملی، تیسری پوزیشن شام کے حافظ کو اور چوتھی پوزیشن مراکش کے حافظ کو ملی، پانچواں انعام لیبیا کے حافظ کو ملا۔ اس گروپ میں انعامات بالترتیب ۴۰، ۳۷، ۳۴، ۳۱ اور ۲۸ ہزار ریال کے تھے۔

● چوتھے گروپ میں دس پارہ حفظ مع تجوید کا مقابلہ تھا، شرکار کی تعداد ۳۰ تھی، پہلی پوزیشن سعودی عرب کے عثمان محمد اسلم صدیقی نے حاصل کی۔ اس میں انعامات بالترتیب ۲۵، ۲۲، ۱۹، ۱۶، ۱۴ اور ۱۲ ہزار کے تھے۔

● پانچویں گروپ میں (۶۰) افراد شریک ہوئے اور اس گروپ میں صرف ایک پارہ حفظ مع تجوید کا مقابلہ تھا، پہلی پوزیشن مصر کے نمائندے نے حاصل کی۔ اس میں انعامات بالترتیب ۱۰، ۸، ۶، اور ۵ ہزار ریال تھے۔

مسلمان والدین اپنے بچوں کو کسی مالی فائدے کے لیے حفظ نہیں کراتے، اور نہ مسلمان بچوں ہی کی یہ غرض ہوتی ہے، وہ تو دین کی حفاظت اور حصولِ ثواب کی نیت وجذبہ سے حفظ کرتے ہیں، البتہ اس نوع کے مقابلوں سے ان کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

جامعہ زیتونہ کی نشاۃ ثانیہ:

تیونس سے امید افزا خبریں آرہی ہیں، موجودہ صدر زین العابدین بن علی کے حالیہ اقدامات اگر کسی حکمت عملی اور سیاسی داؤ پیچ کا نتیجہ نہیں ہیں تو توقع کرنی چاہیے کہ صبح امید طلوع ہو چکی ہے، اسلام اور اسلام پسندوں پر عائد پابندیاں ایک ایک کرکے رخصت ہوں گی اور اسلام کو اس مسلم ملک میں اپنا کردار ادا کرنے کا پورا موقع ملے گا۔ ایک خوش کن خبر یہ آئی ہے کہ ۳۰ برس کے بعد جامعہ زیتونہ کی پہلی پوزیشن بحال کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ جامعہ زیتونہ دنیا کی قدیم ترین یونی ورسٹی ہے، جامع ازہر، جامع قرویین، آکسفورڈ اور ہارورڈ نامی یونی ورسٹیاں بعد کی پیداوار ہیں، اس یونی ورسٹی سے ابن خلدون جیسے متعدد عالمی شہرت کے مالک دانشور پیدا ہوئے۔ تیونس ہی نہیں مغربی افریقہ کے متعدد ممالک کی دینی و فکری تربیت کی خدمت اس نے انجام دی ہے۔ مغرب کے دہانے پر ہونے کے سبب مغرب زدگی اور عیسائیت کے سیلاب کو روکنے اور اسلامی تشخص برقرار رکھنے میں موثر کردار ادا کیا ہے، الجزائر کے علمار کی وقیع تعداد اس یونی ورسٹی کی تربیت یافتہ ہے، فرانسیسی سامراج کے خلاف جنگ میں اس کے تعلیم یافتہ علمار نے کلیدی رول ادا کیا ہے، اس کی خدمات کا یہ تنوع علمانیت (سیکولرزم) کے پرستاروں کی نگاہ میں جرم قرار پایا ہے، انھوں نے اس چشمۂ رواں کو خشک کر دینے کا تہیہ کرلیا۔ حبیب بورقیبہ کا ۳۱ برس پر محیط دورِ حکومت تیونس کے مسلمانوں کے لیے بالعموم اور اس عالمی یونی ورسٹی کے لیے بالخصوص تاریک ترین دور تھا، وہ اس کی گرانقدر خدمات اور عوام میں اس کے اثرات

سے بخوبی واقف تھے۔ یہ زیرک سیاستداں جانتا تھا کہ جامعہ زیتونہ اسلامی فکر و عمل کا منبع ہے۔ اس کی موجودگی میں سیکولرزم اور دین کے متوازی دھارے جاری رہیں گے۔ لادینیت کے فروغ کی راہ میں یہ چیز حارج ہوگی۔ اس لیے انھوں نے اس کے اثرات ختم کرنے کا پروگرام بنایا۔ پہلے مرحلے میں اس جامعہ کو صرف تین شعبوں، کلیۃ الشریعۃ، کلیۃ اصول الدین اور کلیۃ اللغۃ تک محدود کر دیا۔ دوسرے مرحلے میں اس یونی ورسٹی کو ختم کرکے تیونس یونی ورسٹی کا ایک شعبہ قرار دیا، ملک میں اس کے خلاف شدید ردعمل ہوا، بالخصوص علما نے اس کی بازیافت کی سعی کی، لیکن ایسی ساری کوششیں آہنی ہاتھوں سے دبادی گئیں، علما رشد اُئد و محن کا شکار بنائے گئے، بعض مسلم تنظیموں نے یہ بھی پیش کش کی کہ یہ یونی ورسٹی بحال کر دی جائے اور اس کے لیے سرمایہ کی فراہمی کی ذمہ داری وہ قبول کریں گی لیکن اس راہ کی ہر کوشش سیکولرزم کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دی گئی۔

اس پس منظر میں صدر زین العابدین بن علی کی جانب سے جامعہ زیتونہ کی پہلی پوزیشن بحال کرنے کا اعلان یقیناً خوش آئند ہے۔ چنانچہ تیونس اور اس کے باہر اس کا خیر مقدم کیا گیا ہے اور اسے مناسب اور جرأت مندانہ اقدام قرار دیا گیا ہے، صرف یہی نہیں انھوں نے اسلام پسندوں کی بڑی تعداد کو رہا کرنے اور باقی کی سزاؤں میں تخفیف کا بھی اعلان کیا ہے۔ بعض حلقوں کی جانب سے اس نوع کے اقدامات پر حیرت و استعجاب کا بھی اظہار کیا گیا ہے، کیوں کہ صدر زین العابدین بن علی حبیب بورقیبہ کے ہم خیال اور معتمد علیہ سمجھے جا رہے تھے، لیکن زمام حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد ماضی کی غلطیوں کی اصلاح کی راہ اپنائی ہے، اس طرح ان کے موجودہ رویہ سے یہی ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ ایک فوجی جرنیل کی حیثیت سے اپنے حاکم کی تابعداری کرتے رہے، لیکن جب موقعہ ملا تو اس کی تلافی کی کوشش کر دی ہے۔

ایک مظلوم کی دادرسی:

التربیۃ الاسلامیۃ بغداد کے مطابق مکتبہ دار الانبار بغداد نے سلطان عبدالحمید ثانی کے حالات زندگی پر ایک کتاب شائع کی ہے، کتاب کے مصنف "ایک ترک" اور "خاں محمد علی" ہیں۔ سلطان عبدالحمید ثانی مظلوم مسلم سلاطین میں ایک ہیں، جن کی کردار کشی کی پوری کوشش کی گئی ہے، ان کی زندگی کے تابناک پہلو بالخصوص غیرت اسلامی کے نمونے سامنے آنے نہیں پائے، جن لوگوں نے بھی ان پر قلم اٹھایا، حقائق کو توڑ مروڑ کر اپنی غرض کے تابع بنایا، اس مظلوم سلطان کی دادرسی کی یہ پہلی کوشش ہے، یہی وجہ ہے کہ کتاب مارکٹ میں آنے کے ساتھ ہی ہلچل مچ گئی۔ لوگوں نے ذوق و شوق سے پڑھا۔ اس میں دلائل کی روشنی میں حقائق

سے پردہ اٹھانے اور سلطان کی صحیح تصویر پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔ حق یہ ہے کہ سچائی کی تلاش کرنے والوں کے لیے یہ کتاب گراں قدر تحفہ ہے۔

کتاب میں دولت عثمانیہ کے قیام سے لے کر اختتام تک کی تاریخ اختصار کے ساتھ آگئی ہے، چونکہ اصل موضوع سلطان عبدالحمید ثانی ہیں اس لیے ان کے حالات کسی قدر تفصیل سے آئے ہیں۔ کتاب سنجیدہ علمی انداز میں تاریخی دستاویز سے مدلل کر کے تیار کی گئی ہے۔ مؤلف نے لکھا ہے کہ سلطان عبدالحمید ثانی کی تخت سلطنت سے معزولی، جمعیت اتحاد و ترقی کا قیام اور بتدریج تخت سلطنت تک اس کی رسائی عالمی ماسونی تحریک کی نمایاں ترین کامیابی ہے۔ اس کے بعد وہ سب کچھ انھیں مل گیا جس کے حصول کے لیے سلطان کے خلاف اسٹیج تیار کیا گیا تھا۔ فلسطین میں یہودی ریاست کا قیام اس تحریک کا مطمح نظر تھا۔ ابتدا میں سلطان کو پیش کش کی گئی کہ وہ فلسطین میں یہودیوں کو زمین خریدنے اور آباد ہونے کی اجازت دیں، اس کے عوض ترکی کے سارے قرضے ادا کر دیے جائیں گے، لیکن غیرت اسلامی کے اس پیکر نے فلسطین کی ایک بالشت زمین کا بھی سودا کرنے سے انکار کر دیا، مصطفےٰ کمال پاشا نے الغاء خلافت کے ذریعہ اس کی راہ ہموار کر دی، پھر دنیا نے دیکھا کہ غیرت اسلامی کا مظاہر کرنے والا مظلوم و مقہور رہا، اور امت مسلمہ کے مفاد سے غداری کرنے والا ہیرو بنا کر پیش کیا گیا۔

ادھر چند برسوں سے جب کمالی افسوں ذرا کم ہوا ہے، جھوٹ، فریب اور پروپگنڈہ کے انبار میں سے حقائق کی تلاش کی کوشش شروع ہوئی ہے، گزشتہ برسوں اس نوع کے کئی مضامین عرب رسائل میں آچکے ہیں، اورخاں محمد علی کی یہ کتاب اسی نوع کی ایک کامیاب کوشش ہے ساتھ ہی ایک مظلوم کی دادرسی کی ایک سعی مشکور بھی۔

جنوبی سوڈان میں اسلام کی کامرانیاں:

ذکر و فکر کے کسی گزشتہ شمارے میں جنوبی سوڈان میں دعوتی کام اور اس کے نتائج کا ذکر آچکا ہے: تازہ اطلاع کے مطابق مزید آٹھ سردار یا سلاطین مشرف بہ اسلام ہوئے ہیں اور ان کے اسلام لانے کے نتیجے میں ان کے پچاس ہزار ماننے والے بھی حلقہ بگوش اسلام ہوگئے ہیں اور یہ محض دو افراد کی محنت و کاوش کا ثمرہ ہے۔ جنوبی سوڈان میں عیسائیوں کے علاوہ بعض بت پرست قبائل بھی آباد ہیں، ان علاقوں میں عیسائی مشنریاں سرگرم عمل ہیں انھیں جزوی کامیابیاں بھی حاصل ہوتی ہیں، مسلمانوں نے یہ میدان خالی چھوڑ رکھا تھا، اب ادھر کچھ لوگوں نے توجہ مبذول کی ہے تو مختصر مدت میں زبردست کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں۔

(۲) حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی کی اصلاحی و دعوتی تقریروں کا دوسرا سیٹ (۲)

مجموعۂ اصلاحیات مولانا ابوالحسن علی ندوی:

۶۔ "تحفۂ کشمیر":۔ ان تقریروں و خطبات کا مجموعہ جو اکتوبر ۱۹۸۱ء میں سری نگر کشمیر کے مختلف اجتماعات و تقریبات کے موقعوں پر کئے گئے۔

"..... قرب مکانی، مسائل و مشکلات سے ذاتی واقفیت اور مقرر کی عمر و تجربہ کی پختگی کی بنا پر ان تقریروں میں بعض ایسے حقائق و مضامین آ گئے ہیں جو نہ صرف اہل کشمیر بلکہ بیشتر اسلامی ممالک کے اہل فکر و نظر کے لئے لائق توجہ اور مستحق غور و فکر ہیں (صرف اردو میں دستیاب ہے)

۷۔ "تحفۂ دکن":۔ حیدرآباد و اورنگ آباد کے مختلف اجتماعات و مجالس (اکتوبر ۱۹۸۲ء) کی وہ تقریریں جن میں دینی و علمی رہنمائی، ایک داعی دین اور باخبر و صاحب فکر عالم کے نقطۂ نظر سے حالات حاضرہ کا جائزہ لیا گیا ہے اور ملت اسلامی ہند کے باشعور اور ذمہ دار طبقہ کی ذمہ داریوں اور فرائض کی نشاندہی کی گئی ہے (صرف اردو میں دستیاب ہے)

۸۔ "تحفۂ مشرق":۔ سفر بنگلہ دیش (مارچ ۱۹۸۴ء) کی پانچ فکر انگیز و ایمان افروز تقریریں جن میں بصیرت ایمانی، مطالعہ قرآنی اور حقیقت پسندی سے کام لیا گیا ہے اور جن میں مسلمان دانشوروں، ذمہ داروں اور مسلم معاشرہ کے لئے یکساں طور پر دعوت فکر و عمل ہے۔ صرف (اردو میں دستیاب ہے)

۹۔ "تحفۂ دین و دانش":۔ دورۂ مالوہ، اُجین و اندور (نومبر ۱۹۸۴ء) کی تقریروں کا مجموعہ جن میں ملک میں تیزی سے بدلتے ہوئے بلکہ بگڑتے ہوئے حالات، اخلاقی بحران، مسلم معاشرے کی تشویش انگیز کمزوریوں اور بیماریوں کی نشاندہی و علاج بتایا گیا ہے، اور دینی تعلیم کی ضرورت و اہمیت کا احساس دلایا گیا ہے اور اس کی طرف سے مسلمانوں کی غفلت پر تنبیہ اور تشویشناک نتائج سے آگاہ کیا گیا ہے، ایک اصلاحی دعوت و پیغام اور ایک لائحۂ عمل۔ (صرف اردو میں دستیاب ہے)

۱۰۔ "تحفۂ پاکستان": مولانا ندوی کی وہ اہم اور فکر انگیز تقریریں جو دورۂ پاکستان (جولائی ۱۹۷۸ء) کے موقع پر مختلف اجتماعات، جامعات و مدارس، کراچی، اسلام آباد، فیصل آباد اور لاہور میں کی گئیں، ان تقریروں نے دماغ کو جھنجھوڑا اور دل کے تاروں کو بھی چھیڑا اور ملک و ملت کے مسائل میں از سر نو سوچنے سمجھنے اور عمل کرنے کی ایک تحریک پیدا کر دی، جن میں دوسرے علاقوں کے حقیقت پسند دانشور اور ملک و ملت کا درد رکھنے والے حلقوں کے لئے بھی سامان موعظت اور غور کے لئے ایک اہم مواد ہے (صرف اردو میں)

نوٹ: قیمتیں ہماری فہرست کتب میں ملاحظہ فرمائیے۔

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام پوسٹ بکس ۱۱۹ لکھنؤ

(ندوۃ العلماء)

REGD. NO. D (SE)/53
Reg. No. 45862/86

ZIKR-O-FIKR

Vol. III-Part-6
April-1988

G 1/278, Okhla, P.O. Jamia Nagar New Delhi-110025

(۱) حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی کی اصلاحی و دعوتی تقریروں کا پہلا سیٹ (۱)

مولانا ندوی نے جن اہم اسلامی ممالک اور اہم علاقوں کا ملک و بیرون ملک دورہ فرمایا وہاں انھوں نے وہاں کے مخصوص حالات اور مسائل کو سامنے رکھ کر اپنے تاریخی مطالعہ کا نچوڑ، قرآن سے استفادہ کا لُبّ لباب اور اپنا دردِ دل رکھا، ان تقریروں اور خطبات میں ایسے حقائق و مضامین آگئے ہیں اور ان میں جو دعوت و پیغام اور نقشۂ عمل پایا جاتا ہے وہ نہ صرف اُن علاقوں کے لئے جہاں یہ تقریریں ہوئیں بلکہ وہ بیشتر اسلامی ممالک اور دوسرے علاقوں کے اہلِ فکر و نظر کے لئے لائقِ توجہ اور مستحقِ فکر و نظر ہیں، اس سلسلے کے حسبِ ذیل مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں جن کی قیمتیں ہماری فہرست کتب سے معلوم ہو سکتی ہیں۔

مجموعۂ اصلاحیات مولانا ابوالحسن علی ندوی

۱۔ "مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں": جس میں بڑی جرأت کے ساتھ مغربی تہذیب کے نقائص پر نکتہ چینی اور مشرق کے پرستارانِ مغرب کی غلامانہ ذہنیت اور اندھی تقلید پر صاف صاف تنقید کی گئی ہے اور مشرق و مغرب کی درمیانی خلیج کو پاٹنے اور انسانیت کی صحیح رہنمائی و خدمت کے لئے ایک راہِ اعتدال کی نشاندہی کی گئی ہے۔ (عربی اردو اور انگریزی تینوں زبانوں میں دستیاب ہے)

۲۔ "پیامِ انسانیت": پبلک جلسوں کی پانچ اہم تقریریں جن میں زندگی کے مسائل پر نئے طرز سے سوچنے اور نئے طریقے پر کوشش کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

(فی الحال اُردو و ہندی دونوں زبانوں میں دستیاب ہے)

۳۔ "مقامِ انسانیت": مخلوط اجتماعات کی پانچ اہم تقریریں جن میں اغراض و تعصبات، قوم پرستی اور سیاسی مقاصد سے بالاتر اور بالکل آزاد و بے تعلق ہو کر عام انسانوں کے سامنے وہ حقیقتیں رکھی گئی ہیں جن پر انسانیت کی نجات اور سلامتی موقوف ہے، اور جن کو نظر انداز کر کے ہمارا یہ پورا تمدن اور پوری انسانی سوسائٹی اس وقت سخت خطرہ سے دوچار ہے۔

(فی الحال صرف اُردو اور ہندی میں دستیاب ہے)

۴۔ "نئی دنیا امریکہ میں صاف صاف باتیں": مولانا ندوی کی ان اہم تقریروں اور خطبات کا فکر انگیز مجموعہ جو انھوں نے امریکہ و کنیڈا میں کی تھیں، جن میں مغربی تہذیب و امریکی معاشرہ کا جائزہ، تجزیہ و مطالعہ پیش کیا، اور امریکہ میں مقیم مسلمانوں کے بارے میں مشورے، تجربے اور اندیشے ظاہر کئے ہیں۔ (عربی، اُردو، و انگریزی تینوں زبانوں میں دستیاب ہیں)

۵۔ "پا جا سراغِ زندگی": طلبائے علومِ نبوت کا منصب و مقام، ملت کی ان سے توقعات، عصرِ حاضر میں ان کی ذمہ داریاں، طلباء و علماء مدارس کے لئے ایک مفید و اہم تحفہ (صرف اُردو میں)

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام بکس ۱۱۹ پوسٹ **لکھنؤ**

(ندوۃ العلماء)

Printed at Lahooti Print Aids, Jama Masjid, Delhi-110006
and published by Syed Taha Abdullah, G 1/278, Okhla,
P. O. Jamia Nagar, New Delhi-110025